

# وارث

اقبال کاظمی



# ابتدائیہ

سید اقبال حسین کاظمی مقبول عام رسائل و جرائد کا ایک نہایت اہم نام تھے۔ وہ فروری 1943ء کو لاہور میں سید مراتب علی شاہ کے گھر میں پیدا ہوئے۔ اپنی ابتدائی تعلیم لاہور میں حاصل کی اور پھر والد کی محکمہ جاتی مصروفیات کے سبب کوئٹہ چلے گئے۔ اپنی صحافتی زندگی کا آغاز انہوں نے کوئٹہ سے کیا جہاں وہ سالہا سال روزنامہ ”نوائے وقت“ کے نمائندے رہے۔ اپنی صحافیانہ مصروفیات کے سلسلے میں انہوں نے بلوچستان کے طول و عرض کے دورے کیے۔ جنرل موسیٰ خان، نواب اکبر بگٹی اور میر غوث بخش بزنجو کے علاوہ انہوں نے بلوچستان کے جن دوسرے سرداروں کے انٹرویو کیے، وہ لوگوں میں بہت مقبول ہوئے اور ان کی صحافیانہ صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت تھے۔

کوئٹہ کے قیام کے دوران انہیں کمائیاں لکھنے کا شوق ہوا اور جلد ہی وہ مہمائی، جاسوسی اور رومانی ناولوں اور کمائیاں لکھنے والوں میں ایک بڑا نام بن گئے۔ انہوں نے ”اقبال کاظمی“ کے علاوہ کئی قلمی ناموں سے سینکڑوں ناول اور کمائیاں تحریر کیں۔ 1970ء کی دہائی میں انہوں نے کراچی کا رخ کیا۔ اور اس کے بعد زندگی کے آخری سانس یعنی 25 مئی 2001ء تک وہ کراچی میں ہی مقیم رہے۔

یہاں انہوں نے اپنی تحریری زندگی کا آغاز ”عالمی ڈائجسٹ“ سے کیا اور اس کے بعد مسٹری میگزین، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ، نئے افق، اور دیگر متعدد مقبول عام ڈائجسٹوں کے لیے انہوں نے بلا مبالغہ سینکڑوں نہیں ہزاروں کمائیاں لکھیں۔ ان کے لکھے ہوئے مقبول عام سلسلے گرداب، آگ، زنداں، اور دشت جنوں کے نام سے حال ہی میں کتابی شکل میں شائع ہوئے ہیں جن کے کئی ایڈیشن فروخت ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ مٹی دوسرے ناول اشاعت کے مراحل سے گزر رہے ہیں۔ تک ویلوٹ کی ورجنوں کمائیاں ان کے قلم سے نکلیں اور پیری مین سے لے کر جیفری آرچر تک کی سینکڑوں انگریزی کمائیاں انہوں نے اردو میں منتقل کیں۔ ان دنوں ان کا نہایت مقبول سلسلہ وار ناول ”آتش فشاں“ جاسوسی ڈائجسٹ میں قبول عام اور شہرت دوام حاصل کر رہا ہے۔

ماہنامہ فارغ میں ”انگارے“ مسٹری میگزین میں ”سلمانہ“ اور ”ماسٹر“ اس کے علاوہ اہنامہ نئے افق میں ”مافیا“ کے نام سے ان کے قسط وار سلسلے اس وقت بھی شائع ہو رہے ہیں۔ انہوں نے جب روزنامہ ”جنگ“ کے ادارے سے وابستگی اختیار کی تو اس روزنامے

میں ”جنگ ڈائجسٹ“ کا آغاز کیا۔ ہفت روزہ ”اخبار جہاں“ میں ان کا قلم دار ناول ”آگ“ بے پناہ مقبول ہوا۔

وہ ایک خلاق ذہن رکھتے تھے تب ہی سینکڑوں ناقابل فراموش کردار تخلیق کر سکے۔ ہر کردار نیا تھا، ہر چوہن دو سری پچویش سے مختلف تھی۔ انہوں نے ان ملکوں اور شہروں کی کمائیاں نکھیں جہاں انہوں نے کبھی قدم بھی نہیں رکھا تھا لیکن نقشہ جات، کتابوں اور ٹورسٹ گائیڈ کی مدد سے وہ سڑکوں، گلیوں، بازاروں، رستوں، دروازوں اور تفریح گاہوں کا مکمل وقوع اس حد تک درست لکھتے ہیں کہ ان شہروں سے اقبال کاظمی کے نام آنے والے خطوط میں یہ اصرار ہوتا تھا کہ وہ اپنا پتہ بتائیں کہ ان سے ملاقات کی جاسکے یا انہیں اپنے گھر ٹھہرایا جاسکے۔ اپنے کام سے اسی شغف اور لگن نے انہیں اس مقام پر پہنچایا کہ وہ مقبول عام رسائل و جرائد کا ایک اہم نام بن گئے۔

ان کے ذاتی دوستوں میں محمد غوری، احمد اقبال، انس ایم الیاس اور لاہور کے محمد علی اور عبدالغفار نے آخری وقت تک ان سے دوستی نہائی۔ مرحومین میں عبدالقیوم شاد اور انصر کلیم سے انہیں دلی وابستگی تھی۔

ڈپٹی کلرک یوسف علی کی پوتی اور محمد ابو ظفر کی بیٹی زیرک بانو سے ان کی شادی اپریل 1980ء میں ہوئی۔ انہوں نے آخری سانس تک ایک نہایت خوش و خرم اور آسودہ ازدواجی زندگی گزاری۔ ان کے بیٹوں علی وائس اور محسن رضا کے علاوہ ان کی بیٹیاں ذہینہ کاظمی اور شہر بانو کاظمی سب ہی ذہیر تعلیم ہیں۔ سوگواروں میں ان کی شریک حیات اور بچوں کے ساتھ ساتھ اردو کی مشہور افسانہ نگار اور کالم نویس زاہدہ حنا، جاوہر تنیق اور محمد رحمت کے علاوہ ایک بھائی، دو بہنیں، متعدد بھانجیاں بھانجے، بھتیجے اور بھتیجیاں شامل ہیں۔

زندگی میں اقبال کاظمی کو محفل آرائی کا بے پناہ شوق تھا، اب یا حسین آباد قبرستان میں سوئے ہیں تب بھی تمام انہیں، اپنی خوش دامن محرمہ شمس النساء اور اپنے رشتے کے بہنوئی قریش بخاری کی ہمسائیگی انہیں حاصل ہے۔ وہ ایک بھرپور زندگی گزار کر رخصت ہو چکے، ان کے سوگوار اب بھی کہہ سکتے ہیں کہ:

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

زاہدہ حنا

## رات حد درجہ ہیماںک اور طوفانی تھی۔

آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور مسلسل کئی گھنٹوں سے بارش ہو رہی تھی۔ ایسی حالت میں اگر ہوا میں بھی تیزی آ جائے تو قیامت ہی ہو جاتی ہے۔ اس وقت یہی کیفیت تھی۔۔۔۔۔ بارش نے ہوا کے جھکڑوں سے مل کر طوفانی شکل اختیار کر لی تھی سڑکیں گھٹنے گھٹنے پانی میں ڈوب چکی تھیں۔ سڑکوں پر کھمبوں کے بلب بجلی فیل ہو جانے کی وجہ سے روشنی سے محروم ہو چکے تھے۔ راستے ویران اور سنسان تھے۔ بارش اور ہوا کے طوفان کی آوازوں کے علاوہ اور کسی قسم کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ پورا شہر اس لحاظ سے سکوت میں ڈوبا ہوا تھا کہ وہاں انسانی آوازیں نہیں تھیں۔

ابھی رات کے دس بجے تھے لیکن یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ شہر عرصے سے ویران پڑا ہے اور بارش اور ہوا کے طوفان میں گھرا ہوا ہے۔ پانی کے کرنے کی آوازیں ماحول پر اور بھی ہیبت طاری کر رہی تھیں۔

کلکتہ کی ایک تنگ و تاریک اور پسمان گلی کے ٹکڑ والے ایک خست مکان پر اس سے بھی زیادہ وحشت اور دیرانی طاری تھی۔ لوٹے پھوٹے اس مکان کے ایک کمرے میں جھلکا سی چارپائی پر علی خان دینا دایسا ہے بے خبر زندگی اور موت کی کشمکش میں جھلا تھا۔ اس کا رنگ ہلدی کی طرح چمکا چمکا تھا۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی اور گل چپکے ہوئے اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں میں بے پناہ ویرانی نے ڈیرے بٹا رکھے تھے۔ نبض بدلنے کی انتہائی گھبراہٹوں میں ڈوب چکی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن کسی نہ کسی طور ابھی تک جاری تھی۔ یہ دھڑکن بھی ماحول کی اداسیوں سے متاثر ہو کر اس قدر مدھم آواز اور اس قدر کم رفتار سے جاری تھی جیسے اسے خوف ہو کہ اس کی حرکت کوئی محسوس نہ کر لے۔ اس کی حرکت سے ماحول کی ویرانیاں، کمرے کی اداسیاں اور علی خان کے چہرے

اس کے چہرے پر جھک گئی۔ علی خان کے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔ اس نے نظریں پھیر کر میز پر پڑی ہوئی دوا کی خالی شیشی کی طرف دیکھ کر رضیہ ان اجڑی ہوئی نگاہوں کا مطلب سمجھ گئی۔

اس نے دوا کی خالی شیشی اٹھا کر دیکھی۔ گلاس میں سے کچھ پانی اس میں ڈالا اور شیشی کو خوب اچھی طرح ہلکا کر پانی پیالی میں اڑا کر دیا اور ایک ہاتھ علی خان کی گردن میں ڈال کر اس کا سر ذرا سا اوپر اٹھایا اور پیالی اس کے ہونٹوں سے لگا دی اور منہ پھیر لیا۔ اس کی بوجھل پلکوں پر رکے ہوئے آنسوؤں نے ہونے موتیوں کی طرح نیچے گر کر میلی دری میں جذب ہو گئے۔

دن کی روشنی پوری طرح پھیل چکی تھی۔ پردوس میں رہنے والا تیرہ چودہ سال کی عمر کا ایک لڑکا کمرے میں داخل ہوا۔ رضیہ چارپائی سے اترتی اور اسے بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے جا کر ہولے ہولے کچھ کہنے لگی۔ لڑکا وہاں چلا گیا۔

اور پھر آدھے گھنٹے بعد جب وہ واپس آیا تو دروازے کی چوکٹ کے قریب ہی سر جھکا کر کھڑا ہو گیا اور اشاروں ہی اشاروں میں رضیہ کو کچھ سمجھانے لگا لیکن علی خان اپنی بیوی سے پہلے ان اشاروں کا مطلب سمجھ گیا۔ اس نے چارپائی کی پٹی سے گئے کمرے بشارت کو اشارے سے قریب بلایا۔ بشارت ماحول کی اداسیوں اور گھر کی دیرینوں سے خوفزدہ اور سہا ہوا باپ کے قریب گیا۔ باپ کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں نے اسے اور بھی خوفزدہ کر دیا۔

علی خان نے اپنا خفیف استخوانی ہاتھ بمشکل اٹھا کر اس کے سر پر رکھا۔ اس کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی۔ آواز بمشکل بشارت کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔

”بھئی..... یہ ڈاکٹر..... بھئیوں کے بغیر..... نہیں آیا کرتے..... تم بڑے ہو جاؤ تو ڈاکٹر..... اقبال بننے کی..... کوشش کرنا..... تاکہ..... دنیا کو..... جینے کا..... مقصد سمجھا..... سکو.....“

علی خان نے تجربہ اور رضیہ کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ہمیشہ ہمیش کے لئے..... زندگی باہر گئی..... بے رحم موت جیت گئی۔

آخر پر آگ بھی سرفی پھیل رہی تھی۔ ایک سورج دنیا کو اپنی روشنی سے منور

پر چھائی ہوئی پڑمڑ گیاں دور نہ ہو جائیں۔

کمرے میں مٹی کے تیل کا دیا جل رہا تھا جس کی زرد مدھم روشنی اس تاریک اور خاموش فضا میں ایسے گنتی تھی جسے رات کے مزار پر کسی بیوہ نے مٹی کا چراغ جلایا ہو اور وہ مٹی کا چراغ اس شش و پنج میں جھلا ہو کہ ان ہاتھوں نے یہ جو روشنی کا ہالہ بنانے کی کوشش کی ہے، کامیاب بھی ہوگی یا نہیں.....

چارپائی کے سرہانے ایک کرم خوردہ سی پٹائی پڑی ہوئی تھی جس پر ایک گلاس اور دوا کی ایک خالی شیشی اپنی بے بسی کا اظہار کرتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

کمرے کی دیواریں عرصے سے سفیدی نہ ہونے کی وجہ سے سیاہی مائل رنگت اختیار کر چکی تھیں۔ فرش پر پھٹی پرانی درمی پھٹی ہوئی تھی جس پر جابجا میل اور چٹکناہٹ کے دھبے لگے ہوئے تھے اور ادھر ادھر چپڑیں بکھری پڑی تھیں۔

دیوار کے ساتھ دری پر ایک سیلے چٹ ٹلف میں نو سالہ بشارت اور اس سے عمر میں دو سال بڑی بہن نجمہ لٹچی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں منہ اٹھائے باپ کی چارپائی کی طرف اداس اداس اور دیران سی نظروں سے دیکھ رہے تھے جبکہ پالٹتی کی جانب بیٹھی رضیہ اپنے شوہر کی لمحہ بہ لمحہ بگڑتی ہوئی حالت دیکھ کر اپنے سہاگ کے نوٹے ہوئے سارے کو بچانے کی فکر میں مصروف تھی۔

لئے صمدیان بن کر بیت رہے تھے آخر کار رات کے تاریک سائے رفتہ رفتہ اپنے پر سینٹے لگے اور ہلکا ہلکا گھاسا جھلا دینا کو ایک صبح کا پیغام دینے لگا تھا۔

بارش اب ختم چکی تھی۔ چھت پر جمع پانی تھوڑے قطرہ نیچے چھوٹے چھوٹے گڑھوں میں گر رہا تھا۔ گرتے ہوئے پانی کے قطروں کی ٹپ ٹپ طلوع ہوتی ہوئی صبح کا سکوت مجروح کر رہی تھی۔

بشارت ماں کے قریب کھڑا کبھی باپ کے دیران چہرے اور کبھی ماں کو سکتے لگتے اس کے قریب ہی تجربہ بھی کھڑی ہتھیں مل رہی تھی۔

واقعہ علی خان کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ چند لمحوں بعد اس نے آنکھیں کھول دیں اور دیران دیران نظروں سے رضیہ اور بچوں کو دیکھنے لگا۔ اس کے خشک ہونٹ پہلے شاید وہ کچھ کہہ رہا تھا لیکن آواز اتنی مدھم تھی کہ سنائی نہ دے رہی تھی۔ رضیہ

پر بیٹھے کا اشارہ کیا۔

بشارت خاموشی سے ان کے قریب بیٹھ گیا اور پھر اچانک ہی ایک سوال کر ڈالا۔  
”ڈاکٹر اقبال کون ہے بیٹا؟“

سفید ریش بزرگ بشارت کے منہ سے ڈاکٹر اقبال کا نام سن کر چونک گئے۔ شاید انہیں اس عمر کے بچے سے اس قسم کے سوال کی توقع نہیں تھی۔ پہلے تو وہ حیران ہوئے اور پھر بشارت کی انگلی پکڑ کر بادشاہی مسجد کی جانب لے گئے اور جب وہ مسجد کی سیڑھیاں چڑھنے کی بجائے ان سیڑھیوں کے پاس پہنچے ہوئے ایک چھوٹے سے مزار میں داخل ہوئے تو بشارت حیرت سے ان کا منہ دیکھنے لگے۔ اسی لمحے اس کی سماعت سے بزرگ کی آواز نکلا۔

”پتہ..... یہ ہیں ڈاکٹر اقبال۔“ ساتھ ہی اس سفید ریش بزرگ نے قبر کی طرف اشارہ کیا۔

اس وقت پتہ نہیں بشارت کو کیا ہوا کہ وہ قبر سے لپٹ کر روئے لگا اور اس قدر آنسو بہائے کہ ماں باپ کی موت پر بھی نہیں بہائے ہوں گے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے باپ نے مرتے وقت ڈاکٹر اقبال کا نام لیا تھا اور ان کی قبر دیکھ کر اسے اپنے ابا کی موت کا نظریہ آگیا تھا۔

اور پھر یہ بشارت کا معمول بن گیا کہ وہ دن کا بیشتر وقت ڈاکٹر اقبال کے مزار پر گزارتا اور باقی وقت اس بزرگ کے پاس چلا جاتا جو اسے اقبال کی زندگی کے حالات بتاتا کرتا۔ اس نے بشارت کو ڈاکٹر اقبال کی کتنی ہی تفصیلات اذکر کر دیں۔ بشارت کو جب بھی کوئی یاد نہ ہوتی وہ فوراً مزار پر جاتا اور بلند آواز سے ڈاکٹر صاحب کی قبر کو سناتا۔ اس کا خیال تھا کہ اپنی تفصیلات سن کر ڈاکٹر صاحب خوش ہوتے ہوں گے۔

جس روز بشارت نے ڈاکٹر اقبال کی قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر بلند آواز میں شکوہ جواب شکوہ پڑھا اس روز اس کی خوشی کی انتہاء تھی۔ وہ سارا دن سینہ تان کر پھر رہا۔ اس خوشی میں اسے رات کو بھی دیر تک نیند نہیں آ سکی تھی۔

اور پھر ایک دن قبرستان میں ایک اور قبر کا اضافہ ہو گیا۔ وہ سفید ریش بزرگ بھی قبر میں چھپ گیا۔ لاہور کی گنجائش میں بشارت پھر تیار ہو گیا۔ اس کے دن پھر تاریک

کرنے کے لئے طلوع ہو رہا تھا اور دوسرا ایک گھر کو زندگی کی تاریک راہوں پر دھکیل کر غروب ہو گیا۔

ماں کو روئے دیکھ کر نجمہ اور بشارت بھی روئے لگے۔ محلے کے کچھ لوگ اکٹھے ہو گئے اور پھر دہسہرے کے وقت علی خان کو چارپائی پر ڈال کر لے گئے اور قبرستان کے بھیاں گاروں میں ایک اور کا اضافہ کر آئے۔

محلے کے لوگ علی خان کو چارپائی پر ڈال کر لے جانے لگے تو بشارت کا خیال تھا کہ شام ہونے سے پہلے اس کے ابا واپس آجائیں گے۔ جیسا کہ پہلے آیا کرتے تھے لیکن وہ نہ آئے۔ دوسرے دن بھی نہ آئے..... اور پھر تیسرا دن بھی گزر گیا۔

بشارت زندگی اور موت کا فلسفہ نہیں سمجھتا تھا۔ وہ ہمہ وقت اپنے باپ کی واپسی کا شکر رہنے لگا اور ماں اور بہن کو دیکھ دیکھ کر وہ بھی روتا رہا۔

اور پھر ایک روز اس کی ماں کے ساتھ بھی یہی حادثہ پیش آیا۔ محلے والے اسے بھی چارپائی پر ڈال کر لے گئے۔ بشارت کا خیال تھا کہ ابا کہیں دور چلے گئے ہیں لیکن اسی رات کا اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے ضرور لوٹ آئیں گی۔ اسے اور نجمہ کو انہوں نے کبھی تنہا نہیں چھوڑا تھا لیکن وہ بھی واپس نہ آئیں۔ نجمہ اور بشارت دن بھر گھر کے ایک کونے میں بیٹھے روتے رہے۔

دوسرے دن محلے کے ایک بزرگ ان کے گھر آئے۔ ان کے سروں پر دست شفقت رکھا اور جب بشارت نے ان سے سوال کیا کہ ابا کیوں نہیں آئیں تو ان کی سفید داڑھی پر آنکھوں سے چپکنے والے آنسو موتوں کی طرح چپکے لگے۔

”پتہ..... جب بندہ مر جاتا ہے تو واپس نہیں آیا کرتا۔“

بشارت اپنا سوال بھول کر ان کی داڑھی پر چپکے ہوئے آنسوؤں کو دیکھنے میں مろ تھا۔ کسی خواب کی طرح ان کے الفاظ بشارت کے ذہن میں گونج رہے تھے۔  
”جب انسان مر جاتا ہے تو واپس نہیں آیا کرتا.....“

کتنے ہی روز گزر گئے۔ نجمہ اور بشارت اکیلے رہ گئے اور پھر ایک دن بشارت محلے کے اس سفید ریش بزرگ کے پاس جا پہنچا۔

”آج بھی بشارت پتہ کیا پتہ ہے یہاں بیٹھ جا۔“ بزرگ نے اسے اپنے قریب چارپائی

ہو گئے اور راتیں ایک بار پھر سنسان ہو گئیں۔ اس کو جو سارا ملا تھا وہ پھر اس سے چھین گیا۔

ایک روز بشارت انتہائی افسردہ مزار کے باہر بیٹھا بلند آواز سے شکوہ پڑھ رہا تھا کہ بڑے اچھے سوٹ میں بلوس ایک شخص آیا۔ اس نے بشارت پر ایک نظر ڈالی اور مزار کے اندر چلا گیا۔ بشارت اپنی دھن میں مبت و دنیا و مافیاسے بے خبر دیوار سے ٹیک لگائے شکوہ پڑھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ شخص باہر نکلا۔ چند لمحوں تک بشارت کے قریب کھڑا اسے دیکھتا رہا اور پھر ایک چوٹی اس کے سامنے پیچ کر چل دیا۔

بشارت کو اس وقت غلامت بھی ہوئی غصہ بھی آیا۔ وہ ایک دم خاموش ہو گیا اور چوٹی اٹھا کر دوڑتا ہوا اس کے پاس گیا۔ چوٹی اس شخص کو دی اور واپس آکر قبر سے لپٹ کر رونے لگا۔ وہ شخص اسے بٹکاری سمجھا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ علامہ کے مزار کے پاس بیٹھ کر بشارت جیسا معصوم اور حساس لڑکا بیک مانگنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ وہ کتنی دیر تک روتا رہا اور اس کے دل کا غبار ہلکا ہو گیا تو اس نے علامہ سے کہہ دیا۔

”آئندہ میں شکوہ نہیں پڑھوں گا“ بلند آواز سے شکوہ پڑھنے والوں کو لوگ سنگت سمجھتے ہیں۔ میں سنگت نہیں بننا چاہتا“ میں اقبال بننا چاہتا ہوں۔“

پھر اس کے دن اقبال کے مزار کی بجائے اسکول کی چار دیواری میں بسر ہونے لگے۔ اسکول بھی وہ خود ہی گیا“ ماسٹر صاحب نے بھی نہ جانے کیا سوچ کر اسے دوسرے بچوں کے ساتھ ٹیٹھے کی اجازت دے دی تھی۔ اس کے پاس کتابیں نہیں تھیں، قلم، دوات اور تختی نہیں تھی۔ وہ دوسرے بچوں کی کتابوں سے استفادہ کرتا رہا۔ سلیٹ پر لکھنے کی تو اسے حسرت ہی رہی۔ تک تک کر کے جب اس کے ہم جماعت لڑکے اپنی اپنی سلیٹ پر لکھتے تو نہ جانے اس کا دل کیوں بھر آتا۔ جیسے بے تک تک سلیٹ پر نہیں اس کے دل پر ہوتی رہی۔

زندگی کے تین سال ختم ہو گئے۔ وہ چوتھی جماعت میں گیا۔ بیٹا ماسٹر صاحب نے اس کے حالات جاننے کے بعد ترس کھا کر اسے کتابیں بھی لے دیں اور اسکول کے بعد اپنے گھر کے کام کاج پر لگا لیا۔ اسکول بند ہونے کے بعد بشارت بیٹا ماسٹر کے گھر چلا جاتا اور رات دیر تک ان کے ہاں کام کرتا اور پھر رات کا کھانا کھا کر اپنے گھر چلا آتا۔ آتے ہوئے

وہ کچھ بچا کچھا کھانا اپنی ہاتھی نجد کے لئے بھی لے آتا۔

بشارت بہت خوش تھا کہ وہ مزدوری کرتا ہے۔ بیک نہیں مانگتا اسے اب نجد کی بھی زیادہ فکر نہیں تھی۔ محلے کے ایک امیر شخص کی بیوی نے ترس کھا کر اسے اپنے گھر ملازم رکھ لیا تھا۔ جہاں وہ سارا دن جھوٹے برتن مانجھتی، جھاڑو پونچھا کرتی اور گھر کے چھوٹے بچوں کو کھلایا کرتی۔ اس کے محلانے میں اسے بچا کچھا کھانا مل جاتا جس میں سے وہ خود کھاتی اور کچھ بشارت کے لئے لے آتی۔

بشارت نے اپنا یہ معمول بتا لیا کہ اسکول سے وہ سیدھا بیٹا ماسٹر کے گھر جاتا اور رات دیر تک کام میں جاتا رہتا۔ اس ملازمت نے اسے اسکول کی کتابیں تو دے دیں لیکن اس کی زندگی کی راجس چھین لین۔ دن بھر کا تھکا مائدہ رات کو گھر آتا تو پڑھنے بیٹھ جاتا۔ تھکن سے بچو۔ جب اس پر خودگی غلاڑی ہوتی تو وہ سب کچھ بھول جاتا۔ اگر اونٹنیٹے ہوئے ذہن میں کوئی یاد ہوتی تو صرف بیٹا ماسٹر کے نوجوان بیٹے کی گھر کیل اور ان کی بیگم صاحبہ کے تھپڑ جو اکثر اس کے رخساروں کو نوازتے رہتے تھے۔

بشارت ایک بار نہیں کئی مرتبہ بیٹا ماسٹر کے بیٹے سے پٹ چکا تھا۔ بیٹا ماسٹر کی موٹی بھینس نمایاں اس کے ساتھ زر خرید غلاموں جیسا سلوک کرتی۔ ایک شام برتن دھوتے ہوئے بشارت سے چائے کا کپ ٹوٹ گیا۔ بیگم صاحبہ چمٹا کے اسے آواز سن کر فوراً ہی پکں میں پہنچ گئیں۔ انہوں نے کپ کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو دیکھا اور پھر یادرچی خانے میں جیسے طوفان اٹھ گیا۔

”حرامزادے..... کین..... کتے..... اذہوا ہوا تھا کیا..... تیرے ہاتھوں میں طاقت نہیں مومن..... تیرے ہاتھ ٹوٹ جائیں حرامزادے..... کہیں کے اتا جیسی کپ توڑ دیا۔“

بیٹا ماسٹر کی بیوی چلائی رہی۔ پھر اس کے ہاتھ اور پیر بھی حرکت میں آ گئے۔ تھپڑ کھونٹے اور ٹھوکریں بشارت کے جسم پر پڑتی رہیں اور وہ خاموشی سے سہتا رہا۔ اس پر بھی بیٹا ماسٹر کی بیوی کا غصہ کم نہ ہوا تو اس نے چوڑے سے جلتی ہوئی لکڑی پکڑ لی اور ایک مرتبہ پھر بشارت کی پٹائی شروع کر دی۔

وہ کمال تک برداشت کرکے دہلی دہلی سکیلیں پیچوں میں بدل گئیں۔ جلتی ہوئی لکڑی

نے اسے یاد رکھا تھا۔ وہ بشارت کو بلا بھلا کر اپنے ساتھ لے گیا۔ تک و تار یک گلیوں میں ہوتے ہوئے وہ ایک مکان میں پہنچ گئے۔ نوجوان نے بشارت کو کمرے میں دھکیل کر اندر سے کنڑی چڑھا لی۔

اقبال کی برسی پر نظم تم نے پڑھی تھی؟

”جی ہاں۔“ بشارت نے فخر سے سینہ تان کر کہا۔

”اور چور چور کا شور بھی تم نے ہی مچایا تھا؟“ نوجوان نے اسے گھورا۔

”جی ہاں۔“ بشارت نے جواب دیا لیکن جونہی اس نے نوجوان کو غور سے دیکھا

اسے یاد آگیا کہ چور تو یہی تھا۔ اس نے اس شخص کی جب سے بڑا نکلا تھا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ نوجوان اسے یہاں کیوں لایا تھا۔

”اور تمہاری وجہ سے مجھے سات مہینے جیل کاٹی پڑی۔“ اس نوجوان نے کہا۔

”لیکن بھائی جان۔ چوری کرنا بڑی بات ہے۔“ بشارت نے جواب دیا۔

وہ نوجوان اسے چند لمحے گھورتا رہا اور پھر اچانک ہی ایک زوردار تحشر بشارت کے گال پر پڑا۔

بشارت لڑکھڑکیا۔ وہ اپنا گال سسلانے لگا اور پھر تحشر گھونٹنے، ٹھوکریں، بشارت کے جسم پر برسنے لگیں۔ وہ اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتا رہا مگر اس کی قوت برداشت آہستہ آہستہ جواب دینے لگی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تاریک سائے پانپنے گئے۔ سر پکڑانے لگا اور وہ بے دم ساہو کر فرش پر گر گیا۔

نوجوان کو پھر بھی اس پر رحم نہ آیا۔ وہ اسے گھیتا ہوا صحن میں لے آیا اور تل کے نیچے بٹھا کر پانی کھول دیا۔ سرویوں کی شام اور صبح بست پائی۔ بشارت اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگا مگر اس شخص کی گرفت بڑی مضبوط تھی۔ اس نے بشارت کو تل کے نیچے بٹھائے رکھا اور جب وہ بیوش ہو کر ایک طرف لڑھک گیا تو اس شخص نے اسے گھیت کر ایک طرف ڈال دیا۔

صبح سویرے جب اسے ہوش آیا تو وہ ایک گلی میں پڑا ہوا تھا اور ایک آدمی اس پر جھکا اسے ہلا رہا تھا۔ بشارت نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ اس نیک مرد نے اسے اٹھا کر گھر پہنچا دیا۔

کی مار سے اس کا جسم کئی جگہوں سے جھل گیا اور جب وہ پچھتے پچھتے بیوش ہو گیا تو نیم صاحبہ نے اپنے بڑے لڑکے کو بلالیا جو بشارت کو اٹھا کر اس کے گھر ڈال آیا۔

بشارت کئی روز تک گھر سے نہیں نکل سکا۔ اس کی ہاتھوں میں درد تھا۔ سر کی چوٹ میں بھی نیپیں اٹھتی رہیں۔ بازو دو تین جگہ سے جھلس گئے تھے۔ زخموں میں شدید جلن ہوتی رہی۔ وہ چارپائی پر پڑا اپنے مستقبل کے بارے میں سوچتا رہتا۔ اگلی جماعت میں داخلہ کیسے ہو گا؟ کتابیں کہاں سے آئیں گی۔ کھانے کو کہاں سے ملے گا اور..... اقبال کیسے بنوں گا؟

کئی روز بعد جب وہ ٹھیک ہوا تو نمبر کے جمع کئے ہوئے پیروں سے اس نے پالش کی ڈیپ اور برش خرید لیا۔ ہینڈ باٹر کے گمروالوں کے جوتے پالش کرتے ہوئے اسے پالش کرنے کا طریقہ آگیا تھا۔ وہ علامہ اقبال کے مزار کے سامنے بیٹھ گیا اور وہاں آنے والوں کے جوتے پالش کرنے لگا۔

بشارت کے پاس کچھ پیسے جمع ہو گئے تو اس نے انچوس کلاس میں داخلہ لے لیا اور کتابیں بھی خرید لیں۔ ایک سال تک چھپکتے میں گزر گیا۔ اب وہ چھٹی کلاس میں آگیا تھا۔

اس روز علامہ اقبال کی برسی منائی جا رہی تھی۔ مزار کے سامنے ایک بہت بڑے جلے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ بشارت کو بھی اسکول کی طرف سے اپنے مخصوص لب ولبے میں اقبال کی ایک نظم سنانی تھی۔

جلے میں بیٹھکوں لوگ تھے۔ بشارت اسٹیج پر کھڑا نرم سے نظم پڑھ رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر ایک نوجوان پر پڑی جو اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک معزز آدمی کی جب سے بڑا نکلا رہا تھا۔

بشارت نظم چھوڑ کر چور چور کا شور مچاتا ہوا بھاگا اور اس نوجوان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ جلے میں ابھری سی جھل گئی۔ پولیس نے اس نوجوان کو حراست میں لے لیا اور تھوڑی دیر بعد جلے کی کارروائی دوبارہ شروع ہو گئی۔

اس واقعہ کے تقریباً آٹھ ماہ بعد شام کے وقت بشارت، اقبال کے مزار سے واپس لوٹ رہا تھا کہ راستے میں وہی نوجوان مل گیا۔ بشارت اسے بھول چکا لیکن اس نوجوان

تھا۔

”یہ بہت اچھا ہے۔ تم خوب دل لگا کر پڑھ لو بھئی۔“ نجمہ نے اس کی بات سن کر کہا۔

”ہاں میں خوب پڑھوں گا۔ بہت سا پڑھوں گا۔ میں اقبال بنوں گا۔ پھر سب لوگ میری قدر کریں گے۔ ابا نے کہا تھا کہ تم ڈاکٹر اقبال بننا۔ ڈاکٹر اقبال بہت اچھے آدمی تھے۔“ جوش اور مسرت سے وہ سرخ ہوا جا رہا تھا۔ اس رات وہ سویا تو خواب میں خود کو ڈاکٹر اقبال کے روپ میں دیکھتا رہا جس کے ارد گرد بہت سارے لوگ جمع تھے۔ سب اس کا احترام کر رہے تھے اس نے وہاں اہل اہل کو بھی دیکھا جو بڑے فخر سے لوگوں کو بتا رہے تھے کہ یہ ہمارا بیٹا ہے۔

وقت دھیرے دھیرے اپنا سفر طے کرتا رہا۔ دن رات اور راتیں صبح کا پیرہن بدلتی رہیں۔

بشارت کا دن تیزی سے لوگوں کے جوتوں پر برش چلائے اور اقبال کے شعر نکلتا تے گزرتا تھا اور رات کو وہ پاؤں صفر کے گھر پڑنے کے لئے چلا جاتا۔

اس چھوٹی سی عمر میں زندگی اس نے پرکتی ہی ہو جہ لا دی تھی لیکن وہ ذرا بھی نہ گھبرایا۔ اس کے ہاتھ ثبت میں ذرا بھی لغزش پیدا نہ ہوئی۔ وقت کی طوفان خیز اور تاریک آندھیاں بھی اسے نہ بھٹکائیں اور وہ جرات و استقلال کا پیکر بنا وقت و کھیل آگے ہی بڑھتا رہا۔

اب اس نے بوٹ پالش چھوڑ کر انارکلی میں گھوم پھر کر بچوں کے ریڈی میڈ کپڑے فروخت کرنا شروع کر دیئے تھے۔ اس میں چار پیسے بچ جاتے تھے۔ وہ چھپلائی دھوپ میں دن بھر انارکلی میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک گھومتا رہتا۔ شام ہوتے ہوتے وہ بری طرح تھک جاتا لیکن اس نے پاؤں صفر کے ہاں جانے سے کبھی ہٹنے نہیں کیا تھا۔

اس روز پاؤں صفر کے مکان پر پہنچ کر اس نے حسب معمول دستک دی اور پاؤں صفر کی آواز سننے ہی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا اور پھر کمرے کے دروازے میں ٹھٹک کر رہ گیا۔

کمرے میں صوفوں پر پاؤں صفر کے علاوہ تین آدمی اور بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ

بشارت کئی روز تک بخار میں پھنسا رہا۔ نجمہ اس کے لئے پاؤں ہوئی جا رہی تھی۔ ملک صاحب کے گھر نوکری کرنے کے ساتھ ساتھ وہ بھائی کی بھی ہر ممکن دیکھ بھال کرتی رہی۔ کئی روز بعد بشارت گھر سے نکلا۔ بخار نے اسے بری طرح نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ کمزوری اتنی تھی کہ ٹھیک سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ وہ گھر سے کچھ فاصلے پر ایک گلی کی کھڑ پر بیٹھا لوگوں کے جوتے پالش کرتا رہا۔

بشارت اب اسکول نہیں جا رہا تھا۔ فیس نہ ہونے اور بدست سی غیر حاضر یوں کی وجہ سے اس کا نام کٹ گیا تھا لیکن اس کا پڑھنا کا شوق کم نہیں ہوا تھا۔ وہ گلی کی کھڑ پر بیٹھا لوگوں کے جوتے پالش کرتا اور اپنی کتابیں پڑھتا رہتا۔ پڑھنے میں کوئی مشکل آن پڑتی تو وہ کسی راہ گیر سے پوچھنے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہ کرتا۔

اس روز شام کو ایک گاہک جوتے پالش کر دیا کہ جوتے لگا تو بشارت نے اسے روک لیا اور کتاب کھول کر اس سے کچھ پوچھنے لگا۔ اس آدمی نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے بشارت کو بھولا ہوا سبق بتا دیا اور خود اس کے بارے میں بھی تفصیل پوچھنے لگا۔ بشارت معصومیت سے سب کچھ بتاتا رہا۔

”معلوم ہوتا ہے جس پر پڑھنا کا بہت شوق ہے۔“ وہ آدمی بولا۔ ”میرا نام صفر ہے۔ میں اس تیری گلی کے کھڑ والے مکان میں رہتا ہوں۔ تم اگر پڑھنا چاہو تو ہر روز فارغ ہو کر میرے پاس آ جاؤ گے۔ میں تمہیں پڑھا دیا کروں گا۔“

”آپ کو فیس کہاں سے دوں گا۔ میرے پاس تو کتابیں خریدنے کے لئے بھی پیسے

نہیں ہیں۔“ اس نے اداس لہجے میں کہا۔

اس بات پر اس آدمی کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے قریب ہو کر اس کا کندھا تپتے پایا اور بولا۔

”تم فیس اور کتابوں کی فکر نہ کرو۔ سب ہو جائے گا۔ بس کل سے تم آ جاؤ۔“

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ مگر بشارت کی معصوم نگاہیں اس وقت تک اس کا تعاقب کرتی رہیں جب تک کہ وہ نگاہوں سے اوچھل نہ ہو گیا۔ اسے ایسا لگا رہا تھا جیسے اللہ میاں نے ابا کی سفارش پر اسے ڈاکٹر اقبال بنانے کے لئے کوئی فرشتہ بھیج دیا ہو۔ اب وہ بے چینی سے شام ہونے کا انتظار کرنے لگا کہ گھر جا کر نجمہ کو اس فرشتے کے بارے میں



جس میں وہ کتابیں رکھا کرتا تھا۔ جب وہ جانے لگا تو باؤ صفدر نے اسے خاص طور پر یہ ہدایت بھی کر دی کہ گھر جانے سے پہلے وہ خان صاحب کا دستخط شدہ کاغذ اسے دیتا ہوا جائے۔

بشارت تنگ گھلیں سے نکل کر بازار والی سڑک پر آئی۔ یہ سڑک شہری محلے سے ہوتی ہوئی بادشاہی مسجد اور بادشاہی قلعے کی طرف چلی گئی تھی لیکن اسے زیادہ دور نہیں جانا پڑا۔ بازار کے پہلے چوک سے دائیں طرف مڑ گیا۔ یہ بھی تنگ سا بازار تھا۔ ساری دکانیں کھل ہوئی تھیں اور بڑی رونق ہو رہی تھی۔ کچھ آگے جا کر وہ ایک اور گلی میں مڑ گیا اس گلی کے نیچے مکان کی بیشک میں ایک لائبریری بنی ہوئی تھی۔ دروازے کے اوپر لائبریری کا بورڈ لگا ہوا تھا جس پر ساتھ ساتھ بشارت کے نام کے ساتھ بشارت کے دروازے پر رک گیا۔ دسک کے جواب میں ایک دہلا پتلا منحنی سا شخص دروازے پر نمودار ہوا۔

”کون ایں توں۔ کس سے ملتا ہے؟“ اس شخص کے لیے میں بڑی کڑنگی تھی۔  
 ”خان صاحب سے ملتا ہے۔ مجھے باؤ صفدر نے بھیجا ہے۔“ بشارت نے کہا۔  
 باؤ صفدر کا نام سن کر منحنی سادہ شخص چوک سا گیا اور دروازے سے ایک طرف ہٹ کر راستہ دیتے ہوئے ہوا۔

”وہ سامنے والے کمرے میں چلے جاؤ خان جی اندر بیٹھے ہیں۔“  
 بشارت پہلے بھی اس قسم کے پیکٹ لے کر دو تین مرتبہ یہاں آ چکا تھا اور ہر مرتبہ باؤ صفدر نے اسے تاکید کی تھی کہ پیکٹ خان صاحب کے علاوہ کسی اور کے ہاتھ میں نہ دیا جائے۔ پہلی مرتبہ جب بشارت یہاں آیا تھا تو دروازہ کسی اور نے کھولا تھا اور وہ اندر داخل ہوتے ہوئے کچھ ہچکچاتا تھا لیکن اس مرتبہ وہ راستے ہی بے دھڑک اندر داخل ہو گیا۔

بشارت کے اندر داخل ہونے کے بعد اس منحنی سے شخص نے گردن نکال کر گلی میں دائیں بائیں جھانکا پھر دروازہ بند کر دیا اور بشارت کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ نیم تاریک ڈیڑھی سے گزر کر وہ شخص ایک کمرے کے سامنے رک گیا۔ دروازہ اوپر چڑھا ہوا تھا لیکن دونوں پندوں کے بیچ میں تقریباً ایک انچ کی خلا نظر آ رہی تھی اور اندر سے دو

سب قیمتی لباس میں تھے۔ ان کے سامنے کافی ٹیبل پر چائے کے برتن پڑے ہوئے تھے۔ بشارت دروازے میں رک کر ایک ایک کی شکل دیکھنے لگا۔ ان تینوں نے بھی بڑی گری نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

”آؤ بھئی، رک کیوں گئے۔“ باؤ صفدر نے اسے رکتے دیکھ کر کہا۔  
 بشارت آگے بڑھ کر ایک کونے میں ٹالپن پر بیٹھ گیا اور کتابیں کھول کر پڑھنے لگا۔ صوفوں پر بیٹھے ہوئے تینوں آدمی اب بھی گری نظروں سے اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بشارت نے بھی دو تین مرتبہ نظریں اٹھا کر ان کی طرف دیکھا تھا اور ہر مرتبہ انہیں اپنی ہی طرف متوجہ پا کر نظریں جھکا لیا تھیں۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ آدمی چلے گئے اور باؤ صفدر بھی بشارت کے قریب ہی ٹالپن پر بیٹھ کر اسے پڑھانے لگا۔  
 ایک گھنٹہ پڑھنے کے بعد بشارت کتابیں سمیٹ کر جانے لگا تو باؤ صفدر نے اسے روک لیا۔

”تم گھر تو جا رہے ہو، میرا ایک کام بھی کرتے جاؤ۔“  
 ”جی کہنے۔“ بشارت نے کہا۔  
 ”ذرا ایک منٹ روکو۔“ باؤ صفدر کہتے ہوئے اس کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اس کی واپسی دو تین منٹ بعد ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں براؤن کاغذ میں لپٹا ہوا ایک چھوٹا سا پیکٹ تھا جس کے گرد موٹا دھاگا لپٹا ہوا تھا اور دھاگے کی گرہ پر دیکس سے مر لگی ہوئی تھی۔  
 ”یہ پیکٹ خان صاحب کو دینا ہے۔“ باؤ صفدر نے کہا۔ ”تم خان صاحب کو تو جانتے ہی ہو، وہی جن کا مکان لائبریری کے ساتھ ہے۔ تم پہلی ہی دو تین مرتبہ وہاں جا چکے ہو۔“

”جی۔ مجھے انجمنی طرح معلوم ہے۔“ بشارت نے جواب دیا۔  
 ”اس پیکٹ کو انجمنی طرح سمجھا کر بیک میں رکھ لو۔ راستے میں کہیں گرامت دینا اور اس کاغذ پر خان صاحب سے دستخط کروا لیا۔“ باؤ صفدر نے براؤن پیکٹ اور ایک کاغذ بشارت کو دے دیا جس پر انگریزی میں کچھ لکھا ہوا تھا۔  
 بشارت نے دونوں چیزیں سمجھا کر بیک میں رکھ لیں۔ بیک کیا کپڑے کا تھا لیا تھا

آدمیوں کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ اس شخص نے دروازہ کھولا اور گردن اندر ڈال کر بولا۔

”خان جی۔ صفر کا بندہ آیا ہے۔“

کمرے سے باتوں کی آواز آتی بند ہو گئی اور پھر چند لمحوں کے وقفے کے بعد خان صاحب کی بھاری آواز سنائی دی۔

”کہاں ہے۔ اسے یہاں لاؤ۔“

اس شخص نے مڑ کر بشارت کو اشارہ کیا۔ بشارت اندر داخل ہوا۔ پہلے اس نے دوسرے شخص کی طرف دیکھا پھر قہیلے میں سے پیکٹ نکال کر خان صاحب کی طرف بڑھا دیا۔

”باؤ صفر نے بھیجا ہے۔“

خان صاحب نے پیکٹ کے کپیلے اسے باہر سے اچھی طرح دیکھا پھر اسے کھولنے لگا۔ پیکٹ میں پلاسٹک کی ایک قہیلی برآمد ہوئی جس میں آدھا کلو کے گنگ بمک سفید پاؤڈر بھرا ہوا تھا۔ خان صاحب اب بغور قہیلی کا معائنہ کر رہا تھا۔

”باؤ صفر نے کہا تھا اس کاغذ پر آپ سے دستخط کروا لوں۔“ بشارت نے کہتے ہوئے وہ کاغذ بھی آگے بڑھا دیا۔

خان صاحب نے کاغذ لے کر پڑھا۔ ایک بار پھر قہیلی کی طرف دیکھا اور دستخط کر کے کاغذ بشارت کو لوٹا دیا جسے اس نے احتیاط سے جیب میں رکھ لیا۔ خان صاحب نے جیب سے پانچ روپے کا ایک نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں تمنا دیا تھا۔

”اچھا بھئی لڑکے اب ٹو جا“ اور یہ رکھ لے“ راستے میں کچھ کہا لیکن۔“

بشارت نوٹ لیتے ہوئے لچکھا رہا تھا۔

”او رکھ لے کالا۔ میں باؤ صفر کو نہیں بتاؤں گا۔“ خان صاحب نے کہا تو بشارت نے نوٹ جیب میں رکھا اور کمرے سے باہر آگیا۔ وہ مخفی سا شخص سامنے ہی موجود تھا۔ اس نے ڈیڑھ والا دروازہ کھول دیا۔

بشارت ایک بار پھر یہ پڑتچ لگایں لے کر ہوا بازار میں آگیا۔ وہ جب باؤ صفر کے مکان پر پہنچا تو وہ بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ بشارت نے جیب سے کاغذ نکال کر

اس کے حوالے کر دیا اور جھپٹتے ہوئے اسے یہ بھی بتا دیا کہ خان صاحب نے اسے پانچ روپے دیے تھے۔

”کوئی بات نہیں۔“ لو“ یہ بھی رکھ لو۔“ باؤ صفر نے بھی جیب سے پانچ کا نوٹ نکال کر اس کی جیب میں ڈال دیا۔

گھر جاتے ہوئے بشارت کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ وہ جب بھی باؤ صفر کے دیئے ہوئے پیکٹ لے کر خان صاحب کے پاس گیا تھا تو انہوں نے ہر مرتبہ اسے پانچ روپے دیئے تھے اور واپسی پر باؤ صفر نے بھی ہر مرتبہ پانچ کا نوٹ دیا تھا۔

خان صاحب اسے پھر سمجھ کر پیسے دے دیتے ہوں گے لیکن باؤ صفر..... وہ پیسے کیوں دیتے ہیں۔ وہ تو مجھے بغیر فیس کے پڑھاتے بھی ہیں، کتابیں بھی لے کر دی ہیں۔ وہ تو مجھے چھوٹا بھائی سمجھتے ہیں اور شاید اس لئے وہ مجھ سے اتنی محبت کرتے ہیں۔ ان کا کوئی بھائی نہیں، کوئی بہن نہیں اور نہ باؤ صفر کے ماں باپ ہیں۔ کیا وہ بھی میری طرح یتیم ہیں؟ لیکن نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ اگر باؤ صفر میری طرح یتیم ہوتے تو ان کے پاس اتنے پیسے کہاں سے آتے۔ وہ بھی میری طرح غریب ہوتے۔ وہ یتیم نہیں ہو سکتے۔ ان کے ماں باپ کسی اور جگہ رہتے ہوں گے، ہاں ان کا کوئی چھوٹا بھائی نہیں ہو گا، وہ مجھے چھوٹا سمجھ کر پیسے دیتے ہیں۔“

بشارت کی ذہنی رو بمک گئی۔

”ہاں..... یقیناً ایسا ہی ہے لیکن میں اب آئندہ ان سے کبھی پیسے نہیں لوں گا۔ میں کوئی بھکاری ہوں جو کسی سے پیسے لوں۔ بس آئندہ نہیں لوں گا۔“

ایک سال اور بیت گیا۔ بشارت زندگی کی اس چھلپاتی دھوپ میں ثابت قدمی سے آگے بڑھتا رہا۔ صفر کے ہاں بھی اس نے کبھی تعلق نہیں کیا تھا۔ باؤ صفر اب اسے خان صاحب کے علاوہ وہ براؤن پیکٹ دے کر بعض دوسرے لوگوں کے پاس بھی بھیج دیا کرتا تھا۔ کبھی بھائی، کبھی کشمی، کبھی دی دروازے اور کبھی کسی اور جگہ۔ آنے جانے کے کرائے کے علاوہ اب اسے پانچ کے بجائے دس روپے ملنے لگے تھے اور باؤ صفر نے کہہ دیا تھا کہ یہ پیسے وہ اسے چھوٹا بھائی سمجھ کر ہی دیتا ہے۔

اس روز بھی وہ رات کا کھانا کھا کر کتابوں والا تھیلہ اٹھائے باؤ صفر کے ہاں جانے

بشارت: حکومت کا..... قوم کا..... اور..... تمہارا مجرم.....

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں باؤ جی۔“ بشارت نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔  
 ”آپ نے مجھے غلط راستے پر کب لگایا؟ آپ تو مجھے پڑھایا کرتے تھے۔ آپ مجرم کیسے ہو  
 سکتے ہیں۔ باؤ صفدر۔ آپ تو بہت اچھے ہیں۔ آپ نے کیا جرم کیا ہے جو یہ پولیس والے  
 آپ کو پکڑ کر لے جا رہے ہیں؟“

”تم نہیں سمجھ سکو گے بشارت اور نہ ہی کبھی ان باتوں کو سمجھنے کی کوشش کرنا۔  
 کوشش کرنا کہ تم اپنی تعلیم مکمل کر سکو۔“ صفدر نے مدھم سے لہجے میں کہا اور سر  
 جھکانے پولیس والوں کے ساتھ آگے چلی پڑا۔

بشارت بہوت سا کھڑا انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا جب وہ لوگ چلے گئے تو بھیڑ  
 بھی جھٹنے لگی۔

”پولیس والے باؤ صفدر کو کیوں لے گئے ہیں؟“ بشارت نے قریب کھڑے ہوئے  
 ایک آدمی سے پوچھا۔

”آخر ایک نہ ایک دن تو قانون کی گرفت میں آنا ہی تھا سالے کو۔“ اس شخص نے  
 جواب دیا۔ ”یہ لوگ بیرونی کے اسٹور ہیں۔ نوجوان نسل کی رگوں میں زہر گھول رہے  
 ہیں۔ بہت عیش کر لی ان لوگوں نے۔ اب زندگی بھر میں میں بچی بیٹیس کے تو سب کچھ  
 بھول جائیں گے۔ مگر تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو۔ تم ابھی بچے ہو کچھ نہیں سمجھو گے۔  
 جاؤ اپنے گھر جاؤ۔“

”ایسے لوگوں کو تو سرعام پھاسے لادینا چاہیے جی۔“ قریب کھڑے ایک لڑکھنص نے  
 کہا۔ ”مگر وہ کچھ لیٹا فائر آجائیں گے یہ۔ ان کے تھم بہت بڑے لمبے ہوتے ہیں۔ قون ان کا  
 کچھ نہیں باز سکتا جی۔“

لوگ ایک ایک کر کے وہاں سے جا چکے تھے۔ بشارت کتابوں والوں تھمیا کندھے پر  
 لٹکائے وہیں کھڑا رہا کبھی وہ گلی کے اس موڑ کی طرف دیکھتا جس طرف پولیس والے باؤ  
 صفدر وغیرہ کو لے کر گئے تھے اور کبھی مکان کے دروازے پر پڑے ہوئے تالے کو دیکھنے  
 لگتا جو پولیس انسپکٹر نے لگایا تھا۔ کچھ دیر بعد بشارت بھی بو جھل بو جھل سے قدم اٹھاتا ہوا  
 اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔

کے لئے گھر سے نکلا تھا۔ جب وہ باؤ صفدر کے مکان والی گلی میں پہنچا تو بھونچکا رہ گیا۔ مکان  
 کے سامنے لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی اور پولیس کی دو گاڑیاں بھی وہاں کھڑی تھیں۔  
 بشارت چند لمبے بہوت سا کھڑا دور ہی سے تماشا دیکھتا رہا پھر دوڑتا ہوا وہاں پہنچا اور لوگوں  
 کو دھکے دیتا ہوا آگے بڑھا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر اسے ایک مرتبہ جھٹک جانا پڑا۔  
 دروازے پر پولیس کے دو سپاہی راکٹیں لئے کھڑے تھے۔ بشارت نے آگے بڑھنے کی  
 کوشش کی تو ایک سپاہی نے اسے ڈانٹ کر پیچھے ہٹا دیا۔

بشارت سمجھ نہ سکا کہ معاملہ کیا ہے۔ اس نے بھیڑ میں کھڑے دو تین آدمیوں سے  
 پوچھا کہ کیا قصہ ہے لیکن کسی نے اسے جواب نہ دیا۔

بابر کا اور سامنے کمرے کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ بشارت نے ایک پولیس والے کی  
 ٹانگوں میں سے جھانک کر دیکھا تو اس کا دل یکبارگی دھڑک اٹھا۔

کمرے کے وسط میں باؤ صفدر خان صاحب اور دو آدمی اور کھڑے تھے ان سب  
 کے ہاتھوں میں آہنی کڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ ایک پولیس آفسر اور اس کے دو ماتحت قالین  
 پر بکھرے ہوئے کتے ہی جھونے بڑے بیکنوں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔ یہ دیکھ ہی  
 بیٹھ گئے جو باؤ صفدر اس کے ہاتھ لوگوں کو بھونچا کرتا تھا۔

”یہ سب کیا ہے۔ یہاں پولیس کیوں آئی ہے؟“ بشارت نے سوچا اور ایک مرتبہ پھر  
 مکان میں گھسنے کی کوشش کی مگر کانسٹیبل نے اسے ڈانٹ کر پیچھے ہٹا دیا۔

گلی میں لوگوں کی بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد پولیس والے باؤ  
 صفدر امین خان صاحب وغیرہ کو باہر لے آئے۔ ان کے پیچھے دو پولیس والوں نے سفید  
 پاؤڈر کے وہ بیٹھ چوروں میں لپیٹ کر اٹھا رکھے تھے۔ باؤ صفدر جیسے ہی قریب آیا  
 بشارت دوڑ کر اس سے لپٹ گیا۔

”باؤ جی۔ یہ کیا ہو گیا۔ آپ کو پولیس والے کیوں پکڑ کر لے جا رہے ہیں؟“  
 باؤ صفدر اچانک ہی اپنے سامنے بشارت کو دیکھ کر لرز اٹھا۔ اس کا ہکا ہوا سر کچھ  
 اور بھی ہکا ہکا۔

”بشارت میرے دوست۔“ وہ مدھم لہجے میں بولا۔ ”مجھے معاف کر دینا۔ میں نے  
 تمہاری لاعلمی میں تمہیں بھی غلط راستے پر لگانے کی کوشش کی تھی۔ میں مجرم ہوں

گھر آکر بشارت نے نجمہ کو بتایا تو وہ بھی پریشان ہو گئی۔ اس کے لئے فکر کی سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اب بشارت پڑے گا کیسے؟  
اس رات بشارت کو دیر تک نیند نہیں آ سکی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے بار بار باؤ صفدر کا چہرہ گھوم جاتا۔ اسے بار بار یوں محسوس ہوتا جیسے باؤ صفدر اس کے سامنے سر جھٹکانے کھڑا دم لمبے میں کس رہا ہو۔

”بشارت میرے دوست“ مجھے معاف کر دینا۔ میں نے تمہاری لاعلمی میں تمہیں غلط راستے پر لگانے کی کوشش کی تھی۔ میں قوم کا قانون کا اور تمہارا مجرم ہوں۔“  
بشارت کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ باؤ صفدر جیسا شخص مجرم کیسے ہو سکتا ہے۔ اس کی سمجھ میں تو یہ بات بھی نہیں آ سکی تھی کہ ہیروئن کی اسٹاک کیا ہوتی ہے۔ وہ نہ تو ہیروئن کے بارے میں کچھ جانتا تھا اور نہ اسٹاک کے بارے میں کبھی کچھ سنا تھا۔ اس نے طے کر لیا کہ صبح کیسے اسے ان باتوں کا مطلب ضرور پوچھنے لگے۔  
اگلا دن گزر گیا اور دوسرا دن بھی بیت گیا۔ وہ بات بشارت کے ذہن سے نکل گئی کہ اسے کسی سے کچھ پوچھنا تھا۔

☆=====☆

لاہور میں میلہ چر اغاں شروع ہو چکا تھا۔ لوگ جوق در جوق شلالا مار باغ کی طرف جا رہے تھے جو اس میلے کا اصل مرکز تھا۔  
بشارت اور نجمہ کی زندگی میں کبھی کوئی خوشی نہیں آئی تھی۔ سیر و تفریح کا تو کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا لیکن اس مرتبہ انہوں نے میلہ دیکھنے کا فیصلہ کر لیا اور تیار ہو کر باغیاچہ وہ جانے کے لئے نکلے میں بیٹھ گئے۔

نکلنے نے انہیں زوروری اماں دیا تھا۔ سڑک پر بے پناہ رش تھا۔ چلنے کو راستہ نہیں مل رہا تھا۔ زعمہ دلان لاہور ڈھول تاشے بجالتے اور مستقل بکھیرے ٹریفک کی صورت میں جا رہے تھے۔ نجمہ اور بشارت ایک ایسی ہی ٹولی میں شامل ہو گئے۔ سڑک کے دونوں طرف دکانیں بھی ہوئی تھیں۔ جگہ جگہ کھیل تماشے ہو رہے تھے۔ دونوں بہن بھائی یہ سب کچھ دیکھ دیکھ کر بہت خوش ہو رہے تھے لیکن وہ دونوں اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ سیاہ بختی نے ان کا تعاقب شروع کر دیا ہے۔

دونوں جب تانگے سے اترے تو انہیں اکیلے دیکھ کر دو غنڈے ان کے پیچھے لگ گئے تھے۔ ان کی نظریں نجمہ پر مرکوز تھیں۔ انہوں نے نجمہ اور بشارت کو ایک لمحہ کو بھی اپنی نگاہوں سے اوچھل نہیں ہونے دیا اور سارے کی طرح ان کے پیچھے لگے رہے۔  
نجمہ اور بشارت مٹھالی کی ایک دکان کے قریب رک گئے۔ بشارت نے نجمہ کو ایک طرف کھڑے رہنے کو کہا اور خود مٹھالی لینے کے لئے آگے بڑھ گیا۔ دکان پر رش تھا۔ بشارت کے قریب ہی پینٹ شرٹ میں بلبوس ایک شخص مٹھالی لے رہا تھا۔ اس کے دوسری طرف بارہ تیرہ سال کی عمر کا ایک لڑکا بھی کھڑا تھا۔ اس کی نظریں پتلون والے شخص کی پتلون کی جیب کی جیب پر جمی ہوئی تھیں جہاں سیاہ چرمی بڑے کا ایک کونا جھانک رہا تھا۔

موقع پا کر اس لڑکے نے پتلون والے کی جیب سے بڑا کچھنچا اور ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ جھٹکا لگنے سے اس شخص کو بھی ہچا چل گیا کہ اس کی جیب کٹ چکی ہے۔ عین اسی لمحے بشارت کو نجمہ کی چیخ سنا دی۔ وہ تیزی سے مڑا۔ ایک آدمی نجمہ کو بازو سے پکڑے زبردستی گھینٹا ہوا ایک طرف لے جا رہا تھا۔ بشارت نجمہ کو پھانسنے کے لئے اس کے پیچھے بھاگا۔ ابھی وہ چند قدم بھاگا تھا کہ پیچھے سے کسی نے اس کی گردن پکڑ لی۔  
”چور..... اچھے..... حرامزادے..... جیب کٹ کر بھاگ رہا تھا نکال میرا بٹو.....“

بشارت نے مڑ کر حیرت سے اس شخص کی طرف دیکھا۔ یہ وہی پتلون والا آدمی تھا جو مٹھالی کی دکان کے سامنے اس کے قریب کھڑا تھا۔ اب وہ اس کی گردن دوپے خوشخوار نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔  
”اوئے نکال میرا بٹو! وہ ابھی پولیس کے حوالے کر رہا ہوں۔“ اس شخص نے اس کی گردن کو زوردار جھٹکا دیا۔

”جی..... بٹو..... میں نے تو تمہیں لیا آپ کا بٹو.....“ بشارت کے لمبے میں خوف بھی تھا اور حیرت بھی۔  
”اوئے تو نے میری جیب سے بٹو نہیں نکالا.....؟ جھوٹ بولا ہے حرامزادے..... تو پھر بھاگا کیوں تھا..... نکال میرا بٹو! نہیں تو مارا کے کھال ادھیر

بشارت بلبلۂ افسانہ وہ چیخ چیخ کر اپنی بے گنتی کا یقین دلانے کی کوشش کرتا رہا مگر اس کی کون سنتا۔  
 ”یہ ایسے نہیں مانے گا سنتی جی..... اسے تھانے لے جاؤ۔ یہ کسی گروہ کا بندہ لگتا ہے۔“ ایک آدمی نے آواز لگائی۔

پولیس والے نے بشارت کو بازو سے پکڑ لیا اور اسے گھمٹتا ہوا ایک طرف لے جانے لگا۔ وہ آدمی بھی ان کے ساتھ ہی تھا جس کی جیب کی تھی۔ بشارت اب بھی روتے ہوئے اپنی بے گنتی کا یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا مگر پھر اس نے اچانک ہی روٹنا بند کر دیا۔ کچھ دور جانے کے بعد اس نے اچانک ہی ایک جھٹکے سے اپنا بازو پھریا۔ پولیس والے کو ایک زوردار دھکا دیا اور ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

پولیس والا اس کے دھکے اور قہقہے سے گزرتے لوگوں کے ریلے سے کھرا کر اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور منہ کے بل سڑک پر گر گیا۔ اس کے اگلے دو دانت ٹوٹ گئے۔ بشارت نے بھاگنے کی کوشش تو کی تھی مگر پکڑا گیا۔ اس کی وجہ سے پولیس والے کے دو دانت ٹوٹ گئے تھے۔ وہ بشارت کی دھتکائی کرتا ہوا اسے تھانے لے گیا۔

تھانے میں بھی اس کی ٹھیک ٹھاک تواضع کی گئی۔ اس کے خلاف باقاعدہ پرچاٹ گیا۔ اس پر جب تراسی کے علاوہ پولیس کانسٹیبل پر حملہ اور اسے زخمی کرنے کا الزام بھی عائد کر دیا گیا۔

اگلے روز بشارت کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ مجسٹریٹ نے سرسری سماعت کے بعد بشارت کی چیخ و پکار کی پروا نہ کرتے ہوئے اسے دو سال کے لئے بورسل جیل بھیج دیا۔ جیل میں پہلا قدم رکھتے ہی بشارت کی نئی زندگی کا آغاز ہوا۔

بشارت نے بورسل جیل میں قدم رکھا تو اسے یہاں کا ماحول کچھ عجیب سا لگا۔ سب سے پہلے تو بڑی بڑی مچھوچوں والے جیلر سے واسطہ پڑا جس نے بشارت کی فائل پڑھنے کے بعد سر سے پیر تک اس کا جائزہ لیا اور مستی خیز لہجے میں بولا۔

”ہوں۔ علوی معلوم ہوتے ہو لیکن شاید پکڑے پہلے دفعہ گئے ہو۔“  
 ”صاحب جی۔ میں نے کسی کی جیب نہیں کاٹی۔ میں نے چوری نہیں کی۔ غنڈے میری ہن کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔ مجھے چھوڑ دیں۔ میں اسے تلاش کروں گا۔“ بشارت

دوں گ۔“ اس شخص نے اس کے گال پر زوردار طہنچہ جڑ دیا۔  
 ”میں نے آپ کا بڑا نہیں چرایا۔ میں تو اپنی بانی کو بچانے کے لئے بھاگا تھا۔ اسے غنڈے پکڑ کر لے گئے ہیں۔“ بشارت نے روتے ہوئے کہا اور اس طرف اشارہ کیا جس طرف اس نے غنڈے کو نجرہ کو لے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔  
 ”لگتا ہے..... جھوٹ ہوتا ہے۔“ اس شخص نے دو تین اور تھپڑ رسید کر دیئے۔ ”میں کہتا ہوں میرا بڑا دیر سے مجھے ورنہ.....“

بشارت چیختے چلائے لگا کہ اس نے بڑا نہیں نکالا۔ بلکہ وہ تو اپنی ہن کو غنڈوں سے بچانے کے لئے بھاگا تھا۔ مگر اس کی کون سنتا۔ کسی لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ بشارت رو رو کر ایک ایک شخص کے سامنے فریاد کر رہا تھا لیکن کوئی بھی تو اس کا ہمدرد نہیں تھا۔ سب لوگ اسے جب تراسی اور اچکا کہہ رہے تھے۔

”اسے پولیس کے حوالے کر دو۔ یہ ایسے نہیں بتائے گا۔ بڑے بچے ہوتے ہیں یہ“ مار کھا کر بھی کچھ نہیں بتاتے۔“ مجمع میں سے ایک شخص نے کہا۔  
 ”بھائی صاحب۔ میں سچ کہتا ہوں..... میری تلاش لے لیں۔ میں نے بڑا نہیں چرایا۔ میں تو اپنی ہن.....“

”چنانچہ.....“ ایک شخص نے آگے بڑھ کر ایک بھرپور تھپڑ مارتے ہوئے نجرہ کے ساتھ ایک ناجائز رشتہ جوڑا۔

بشارت کے منہ سے چیخ نکل گئی اور پھر وہ شخص بھی اسے بری طرح پیٹنے لگا جس کی جیب کی تھی۔ اسی دوران ایک پولیس والا نکلتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔  
 ”اوئے کیا بات ہے۔ یہی۔ اس لڑکے کو کیوں پھٹ رہے ہو؟“ وہ لوگوں کو گھورتے ہوئے بولا۔

”جیب کھڑا ہے۔“ اس پلو کا بڑا پار کیا ہے۔“ ایک آدمی نے کہا۔  
 ”نہیں سنتی جی۔ میں نے ان کا بڑا نہیں نکالا۔“ بشارت نے کانسٹیبل کی طرف دیکھتے ہوئے فریاد کی لہجے میں کہا۔

”بڑا نہیں نکالا..... ہوں.....“ کانسٹیبل نے اسے گھورا اور پھر اچانک ہی اس کے سینے پر ٹھونب مار دیا۔

قالین بانی کا شعبہ نہیں کے ایک بہت بڑے ٹیڈ کے بیچے قائم تھا جہاں پانچ چھ لڑکے کام میں مصروف تھے اور ایک ادویہ عرصہ بے پروائی سے ایک طرف بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اس شعبے کا انتہا رحمت خان تھا۔ وارڈن بشارت کو اس کے حوالے کر کے چلا گیا۔ رحمت خان کو وارڈن سے معلوم ہو گیا تھا کہ بشارت کس جرم میں یہاں آیا ہے۔ وہ اسے لے کر ایک طرف فرش پر بیٹھ گیا۔

”ہاں ابھی بر خوردار کب سے دھندا کر رہے ہو؟“ رحمت خان نے پوچھا۔  
 ”نہیں سادھندا؟“ بشارت نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔  
 ”وہ میرے پادشاہ..... ہم سے بھی پھڑے بازی کرو گے۔“ رحمت خان نے کہا اور دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں کو قبضی چلانے کے انداز میں حرکت دینے لگا۔  
 ”میں سمجھا نہیں آتا کیا کہہ رہے ہیں۔“ بشارت نے اس کی انگلیوں کی حرکت کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

”بڑا پکا ہے۔“ کیزے استاد کا شہرہ ہے۔“ رحمت خان بولا۔  
 ”میرا تعلق کسی گروہ سے نہیں۔ نہ ہی میرا کوئی استاد ہے۔ میں نے تو کوئی جرم نہیں کیا تھا۔“ بشارت نے جواب دیا۔

”اوسے تو ادھر بیڑ پانا کرنے آیا ہے، اچھا یہ تانتی رقم اڑائی تھی؟“  
 ”میں نے تو کسی کی جیب نہیں کھائی۔ میں تو مزدوری کرتا تھا۔ انارکلی میں بچوں کے کپڑے بیچ کر اپنا اور اپنی بہن کا پیٹ پانا مزدوری کر کے پیٹ پانا۔ تو جرم ہے اور نہ کوئی گناہ۔ میں نے تو کبھی بے ایمانی بھی نہیں کی۔ میری امانداری کی یہ سزا ملی ہے کہ میری بہن کو خٹوے اٹھا کر لے گئے اور جب میں اسے پہلنے کے لئے دوڑا تو مجھے جب تاشی کے اڑام میں پکڑ کر یہاں پہنچا دیا گیا۔“ بشارت آبدیدہ ہو گیا۔ اس کی آواز رندہ گئی اور پھر اس نے آنسوؤں اور سسکیوں کے بیچ اپنی پوری کہانی سنائی۔

رحمت خان، جس کی زندگی ہی اس چار دیواری کے اندر بزموں کو دستی ہنر سکھاتے ہوئے گزری تھی۔ بڑی گہری نظروں سے بشارت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے بشارت کے چہرے پر چٹائی کی داستان کھل نظر آئی۔ رحمت خان، جس نے جیل میں آنے والوں پر کبھی رحم نہیں کھلیا تھا، نہ جانے کیوں بشارت کی داستان کن کر لول ہو گیا۔ اس کی

نے روتے ہوئے جیل کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔  
 ”اب تم اپنا قول کر دیا نہ کرو؟ سزا تو تمہیں ہو ہی گئی ہے۔ اب تو تمہیں دو سال اس چار دیواری کے اندر ہی بسر کرنا ہوں۔“ جیلر نے کہا۔  
 ”دو سال۔“ بشارت کے ذہن کو جھٹکا لگا۔ یہ تو اسے یہاں آ کر پتہ چلا تھا کہ اسے دو سال کی جیل ہوئی ہے۔ وہ جلدی سے بولا۔ ”کیا آپ مجھے دو سال سے پہلے نہیں چھوڑ سکتے؟“

”چھوڑ سکتے ہیں۔ بشرطیکہ تم یہاں رہ کر اچھے کردار کا مظاہرہ کرو۔“ جیلر نے کہا۔  
 ”اگر تم نے یہاں رہے ہوئے کوئی گڑبڑ یا انتشار پھیلانے کی کوشش نہ کی اور تم اچھے لوگوں کی طرح یہاں رہے تو ہو سکتا ہے کہ میں ایک سال بعد ہی سفارش کر کے تمہیں یہاں سے رہائی دلا دوں۔“  
 بشارت خاموش کھڑا تھا۔ جیلر اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا پھر ایک وارڈن کو بلا کر بشارت کو اس کے حوالے کر دیا۔  
 ”اسے تین نمبر وارڈ میں پہنچا دو اور رحمت خان سے کہنا اسے قالین بانی کے کھلتے میں ڈال دے۔“

بشارت جیلر کے دفتر سے نکل کر جیل والے حصے میں پہنچا تو ایک عجیب صورت حال نظر آئی۔ اس کے ہم عمر اور اس سے چھوٹے بڑے کتنے ہی لڑکے مختلف کالوں میں لگے ہوئے تھے۔ کام سے زیادہ لوگ آپس میں گالم گلوچ اور لڑائی جھگڑوں میں مصروف تھے۔ کئی لڑکوں کا لباس جگہ جگہ سے پھنسا ہوا تھا اور جن کے لباس سلامت تھے میلے پگھلے ہوئے تھے۔ شاید کئی دنوں سے تو کیا کئی ہفتوں سے نہیں دھلے تھے۔

ایک طرف دو لڑکے ایک دوسرے سے دست و گریب نظر آ رہے تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر کھڑا وارڈن سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ جب لڑکوں کی لڑائی زور پکڑ گئی تو وارڈن ہاتھ میں پکڑا ہوا موٹا سا نڈا لہراتا ہوا ان کے قریب آیا اور کچھ پوچھے بغیر دونوں پر ڈنڈے برساتا شروع کر دیے۔ ساتھ ہی وہ پولیس کی مخصوص زبان میں ان دونوں کا شجرہ نسب بھی بتاتا جا رہا تھا۔  
 بشارت کو بھر پوری سی آگئی۔

آکھوں پر چھایا ہوا وہ پردہ ہٹ گیا جس میں اسے جیل آنے والا ہلکا بھرم ہی نظر آتا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ بشارت بے قصور ہے۔ اسے ناکردہ جرم کی سزا دی گئی تھی اور جس نے جرم کیا تھا وہ اب تک نہ جانے کتنے اور جرم کر چکا ہو گا اور آزادی سے محروم پھر رہا ہو گا۔

”تو فکر نہ کر بچہ۔“ وہ بشارت کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ”نیک چلنی کا ثبوت دو گے تو وقت سے پہلے باہر ہو جائیں گا جب تک دل لگا کر قلعہ کا کام نہ لے۔“ وہ دونوں ان لوگوں کے پاس پہنچ گئے جو ایک قلعہ کے تانے بانے میں اچھے ہوئے تھے۔

”شکرے۔“ رحمت خان نے ایک لڑکے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ آج سے تمہارے ساتھ کم کرے گا تانے ڈالنا بات مت کرنا اسے کم نہ سکھاتا ہے۔“ پھر وہ بشارت کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”تم اسی کھدی پر رو گے۔ اس کے کم کو توجہ اور غور سے دیکھو۔ یہ جو کچھ تمہیں بتائے اسے ذہن میں رکھنا۔“

رحمت خان کے جانے کے بعد شکرالاکھ چوڑ کر بشارت کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”ہاں بھی جلد عیاذ (جس کا تاننا مل ڈالنا تھا)“ شکرے نے کان میں اڑا سوا ادھ لاکھ سرگٹ نکال کر سلگایا اور کش لگاتے ہوئے بولا۔ وہ عمر میں اس سے شاید ایک دو سال بڑا ہو گا مگر اس کا انداز بالکل کسی پختہ کار آدمی جیسا تھا۔ وہ بڑی بھرپور نگاہوں سے اسے نونالے میں مصروف تھا۔ بشارت نے اسے بھی حقیقت بتادی تو وہ بولا۔

”بھئی ہم تو کچے کچے فکاڑ ہیں۔“ یہ دیکھتے ہوئے اس کا لہجہ بڑا فخریہ ہو گیا تھا جیسے لوگوں کی جیبیں کاٹنا بہت بڑا کام ہو۔

”تم نے جیب تراشی کہاں سے سیکھی تھی؟“ بشارت نے پوچھا۔ ”میں جیل میں۔“ شکرے نے سرگٹ کا کش لگاتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں کئی مرتبہ جیل آ چکا ہوں۔ اب تو یہ جیل اپنا گھر بن چکی ہے۔ پہلی دفعہ جب میں یہاں آیا تھا تو میں نے بھی تمہاری طرح محلات سے مجبور ہو کر کسی کی جیب کاٹی تھی۔ تو نے تو کسی کی جیب نہیں کاٹی۔ تو؟ تو یوں اندر آ گیا۔ میں نے بڑا کم کیا ہے۔ پہلی مرتبہ میں نے اس وقت جیب تے جتھ نازا جب اپنا چھوٹا ویز (بھلی) پیار تھا تو ڈھانڈے پاس دوائی کے لئے

ایک دھیل نہیں تھا۔ بس فیڑ میں سے ایک پاؤ تانیا اور اس کی جیب سے بٹوا نکال اسے جالتے او جا ہو گیا مگر یاڑ اسپتال پہنچا بھی نہیں تھا کہ ڈسٹے میں ہی پس نے ہاتھ پادبٹ۔ فیڑ ویز قبرستان تے میں اوڑھ آ گیا۔“ شکرے کی آواز دھنگی تھی۔ اس کی نگاہیں کسی ان دیکھے نقطے پر مرکوز ہو کر رہ گئی تھیں۔

”پھر..... پھر کیا ہوا؟“ بشارت نے پوچھا۔ اس کی آواز میں بھی ارتعاش تھا۔ ”فیڑ.....“ شکرے نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”جب میں جیل سے نکلا تو ایک پکا فکاڑ بن گیا تھا لیکن مجھے جلدی پڑ چل گیا کہ جب تک قون کو اپنے ہتھ میں لے کر اس کا مذاق نہ اڑایا جائے کوئی بھی جرم کامیاب نہیں ہو سکتا۔ میں نے بھی قون کو جتھ میں لے لیا۔ قون کے محافظوں کو اپنا پتی داڑ بنا لیا۔“

”تو پھر تم پکڑے کیسے گئے؟“ بشارت نے پوچھا۔ ”علاقے کا تھانہ اڑنا آ گیا تھا۔ سوری دا آندے تال ڈبل مال مانگن لگا۔ میں وی پوڑی یاد دیتی ہں اس سبجے پہ چھ قلعہ (دفعات) لگا کرے اندر کر دتا۔“

”تمہیں کتنے عرصے کی جیل ہوئی ہے؟“ بشارت نے پوچھا۔ ”تین سال۔“ شکرے نے بے پروائی سے کہا اور سرگٹ کا آخری کش لگا کر اسے جیر کے نیچے پھسل دیا۔ ”اب تو صرف ڈیڑھ سال رہ گیا ہے۔ میری من تو بھی یہی دھندہ دیکھ لے۔ سازی عمر پیش ہی پیش کرے گا۔“

”نہیں نہیں۔“ بشارت نے خوفزدہ سے لہجے میں کہا۔ ”میں یہ دھندا نہیں سیکھوں گا۔ میں صحیح سلامت ہوں، تندرست ہوں، اپنے ہاتھوں سے کما سکتا ہوں۔ میں..... میں یہ دھندہ نہیں سیکھوں گا۔“

”اوہ نہیں بیڑے جگڑے دنیا بڑی لعنتی اسے۔ بڑی مطلبی اسے۔ محنت مزدوری میں کچھ نہیں ملتا۔“ شکرے نے ماحضہ انداز میں کہا۔

”کچھ بھی ہو۔ میں کما کر کھاؤں گا، چوری نہیں کروں گا۔ بھیک نہیں مانگوں گا۔“ بشارت کے لہجے میں ایک عزم تھا۔

”ٹھی..... خوش..... کام کی طرف دیکھو۔ استاد رحمت آ رہا ہے۔“ شکرے نے دھجے لہجے میں کہا اور سر جھکا کر کام میں مصروف ہو گیا۔

بشارت بھی اسے ہاتھ چلاتے دیکھنے لگا۔ اس کی نظریں دھماکوں پر تھیں، ذہن کیسے اور قتلہ شکرے کی باتیں اس کے دماغ پر ہتھوڑے برسا رہی تھیں۔

کیا اس دنیا میں سب ہی میری طرح ہیں۔ یہاں غریبوں کو جینے کا کوئی حق نہیں۔ دولت والے غریبوں کو اسی طرح پکڑتے رہیں گے۔ جرم کوئی کرے۔ سزا کسی اور کو ملے۔ آخر ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ یہ دھاندلیاں کب تک چلیں گی میں جیل سے نکل کر پڑھوں گا۔ خوب محنت کروں گا۔ میں اقبال بنوں گا اور دنیا والوں کو جینے کا سبق سکھاؤں گا۔ انہیں زندہ رہنے کا سلیقہ سکھاؤں گا۔

”ہاں میرے جگڑو فیئر کی خیال اسے۔“

”کیا..... کیا کام تم نے.....؟“ بشارت شکرے کی آواز سن کر چونک گیا۔ استاد رحمت خان کسی اور طرف چلا گیا تھا۔ دوسرے لڑکے بھی کام چھوڑ کر باتوں میں لگ گئے تھے۔

”میں نے کہا فیئر کیا خیال ہے؟“ شکرے نے مسکراتے ہوئے اس کے چہرے کے سامنے انگلیوں کو پیچنی کی طرح حرکت دی۔ وہ عجیب لڑاکا تھا آدمی، بجا بلی آدمی اردو میں نہ جانے کسی باتیں کر رہا تھا۔

”تمہیں..... میں تمہاری بات کسی طرح نہیں مان سکتا شکرے۔“ بشارت نے کلمہ

”ابھی تمہاری سزا کے پورے دو سال پڑے ہیں۔ جب تم فیصلہ کر لو تو مجھے بتا دیتا۔ میں ہتھوں ہتھ فکارتا ہوں گا۔“

”میں تمہاری بات پر کبھی سوچنے کی کوشش بھی نہیں کروں گا۔ میں آئندہ زندگی میں ایک مجرم کھلانے کے بجائے ایک اچھا آدمی کھلوانا پسند کروں گا۔ میں بڑا آدمی بنوں گا۔ اقبال بنوں گا۔“ بشارت ہڈی جاتی ہو گیا۔

”اقبال.....! شکرے نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”واہ میرے جگڑو تمہارا یہ خواب کبھی نہیں پورا ہو گا۔ مجھے دیکھو میں نے بھی کبھی ڈاکٹر اقبال بننے کا خواب دیکھا تھا اور اب تمہارے سامنے ہوں۔“

”تم چاہو تو اب بھی برے کام چھوڑ کر اچھے آدمی بن سکتے ہو۔“ بشارت نے کلمہ

”اے غریب کبھی چنگا آدمی نہیں بن سکتا۔ وہ تو پیدا ہی اس لئے ہوتا ہے کہ دنیا بھر کی برائیاں اس کے سر تھوپ دی جائیں۔ اچھائیاں تو صرف دولت مندوں کا حصہ ہیں۔ وہ گناہ کرتے ہیں تو اسے فیشن کا نام دیا جاتا ہے، چوری کرتے ہیں تو فن سمجھا جاتا ہے، غریبوں کا خون چوستے ہیں تو اسے کاروبار کے اصول بتایا جاتا ہے۔ اور ہم۔ ہم تو غریب ہیں ہی ظلم سننے کے لئے..... ستم برداشت کرنے کے لئے.....“ شکرہ ایک دم خاموش ہو گیا۔

بشارت بت بنا اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گئے۔

”بس، بس..... بس کرو شکرے۔ چپ ہو جاؤ۔“ بشارت نے ہاتھ اٹھا دیا۔ ”کوئی گل نہیں جگڑو۔ آج میں چپ ہو جاؤں گا مگر جب یہاں سے نکلنے کے بعد ادھر ادھر ادھر ادھر کھریں گئیں گی۔ تمہیں سزا یافتہ سمجھ کر کوئی تمہارے قریب نہیں آئے گا فیئر تمہیں میراں گلاں یاد آئیں گی۔ اوس ویلے تم بچھتاؤ گے کہ تم نے میری بات کیوں نہ مانی۔ اس لئے کہتا ہوں کہ ابھی فیصلہ کر لو۔ میں آج ہی سے تمہیں مڑ سکھانا شروع کر دوں گا۔“

اس دوران جیل کا گھڑیاں بجنے کی آواز سنائی دی۔

”چلو۔ کھانے کا وقت ہو گیا۔“ شکرے نے اٹھتے ہوئے کلمہ

”میں کھانا نہیں کھاؤں گا، بھوک نہیں ہے۔“ بشارت نے کلمہ

”اڑ خد اے بندے۔ روٹی نہیں کھاؤ گے تو زندہ کیسے رہو گے۔ چلو کھانا کلو۔ پھر کہیں بیٹھ کر ہم گل بات کریں گے۔“ شکرے نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے زبردستی اپنے ساتھ لے جانے لگا۔

بشارت نے اپنے گھر میں بھی اگرچہ کبھی اچھا کھانا نہیں کھایا تھا مگر یہ کھانا تو اس قدر بد ذائقہ تھا کہ وہ ایک لقمہ بھی چلنے سے نہ اڑا سکا۔ جبکہ شکرہ اور دوسرے لڑکے بڑے مزے لے لے کر یہ بد ذائقہ کھانا کھا رہے تھے۔ کھانے کے بعد یہ پھر اپنے اڑے پر آ گئے اور شام کو پھٹی کا گھڑیاں بجا تو سب لوگ کام چھوڑ کر اپنے اپنے کھانا کی طرف بھاگے۔



بشارت جب شکرے کے ساتھ کوٹھری میں داخل ہوا تو وہیں چار لڑکے اور بھی تھے۔ شکرے نے ان سب کا تعارف کرایا وہ سب اس طرح اطمینان سے بیٹھے تاجیں کر رہے تھے جیسے جیل کی کوٹھری میں نہیں اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے وقت گزار رہے ہوں۔ ان میں دو لڑکے صابر اور ارشد بھی شکرے ہی کی طرح جیب تراشی کے الزام میں آئے تھے۔ حیدر چوری کے جرم میں سزا کاٹ رہا تھا اور اکبر لڑائی اور مار پیٹ کی سزا بھگت رہا تھا۔ صابر اور ارشد تو شکرے کے شاگرد دین چپے تھے اور اس جیب تراشی کے ٹرینکے رہے تھے۔

مرات کے کھانے کے لئے قیدی لڑکوں کو بیروں سے نکال کر لنگر خانے لے جایا گیا۔ بشارت اپنی کوٹھری میں بیٹھا رہا۔

شکرے نے واپس آکر گدے سے شوربے سے بھری ہوئی رکابی کوٹھری کے ایک کونے میں رکھ دی۔ اس پر دواہ جلی روئیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔

”تو نے دن کو بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔ تمہارے لئے روٹی لے آیا ہوں۔ جب بھوک لگے گی تو یہی روٹی کھائے گا۔“ شکرے نے کہا۔

وہ سب باتیں کرتے رہے۔ بشارت خاموشی سے سنتا رہا وہ لوگ ایک دوسرے سے قفس مذاق کرتے اور کبھی گندی گھلیاں بھی بکتنے لگتے۔

کچھ ہی دیر بعد وارڈن آگیا۔ اس نے قیدیوں کی گفتنی کی اور سلاخوں والے دروازے کو تالا لگا کر چلا گیا۔ شکرہ وغیرہ اس کے بعد بھی دیر تک باتیں کرتے رہے اور پھر ایک ایک کر کے سب لوگ نیند کی آغوش میں پہنچ گئے۔

رات بیتی جا رہی تھی۔ یہ بشارت کا جیل میں پہلا دن تھا۔ اسے وہ رہ کر اپنی بہن فحہ کا خیال آ رہا تھا۔ وہ نہ جانے کس حال میں ہوگی۔ اسے غصہ تھا کہ نجمہ کو بردہ فروشوں نے پکڑ لیا ہے۔ وہی بردہ فروش جن کے بارے میں ماں قصے سناتا کرے گھر سے باہر جانے سے روکا کرتی تھی۔ یہ جانگلی لوگ بچوں کو اٹھالے جاتے ہیں اور پھر ہاتھ پاؤں توڑ کر ان سے بھیک منگواتے ہیں۔ اس نے بہت سے ایسے ہاتھ پیر ٹوٹے بچے دانا صاحب کے مزار پر بھیک مانگتے دیکھے تھے۔

”تو کیا نجمہ بھی..... نہیں نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔“ وہ اس سے آگے نہیں

سوچ سکا۔ اس کی آنکھیں جل قفل ہونے لگیں۔ اسے یوں لگا جیسے دیواریں اور پھت اسے کانٹے کو آ رہی ہیں۔

اچانک اسے کسی کی بیڑا ہٹ سنائی دی۔ اس نے چوک کر اپنے دائیں جانب دیکھا۔ ایک لڑکا نیند میں خود کلائی کرتے ہوئے ٹھٹ بنگالی لمبے میں کسی کو گھلی دیتے ہوئے اپنے ساتھ غلط حرکت سے روک رہا تھا۔

بشارت نے غور سے اس کی بات سننے کی کوشش کی مگر اسے کچھ سمجھ میں نہ آ سکا۔ شکرہ اس کے پہلو میں بے خبر خرائے لینے میں مصروف تھا۔ اسے جیل میں ایک ہی دن میں بھانت بھانت کے نکتے لڑکوں سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اسے حیرت اس بات پر ہو رہی تھی کہ ہر لڑکا خود کو بہت بڑا مجرم قرار دینے پر حلا ہوا تھا۔ مگر اس کے باوجود بشارت کو شکرہ اچھا لگا تھا۔ اس کا لہجہ خالصتاً لہجہ دیواروں کا تھا۔ بالکل کھلاؤ کھلا۔

وہ سوچتا رہا، دیکھتا رہا اور کروٹیں بدلتا رہا۔

بھوک سے اس کی آنتیں اینٹھ رہی تھیں۔ اس کی نگاہیں بار بار کونے میں پڑی ہوئی رکابی اور روٹیوں کی طرف اٹھ جاتیں۔ اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا اور اب بھوک کی شدت نے اسے بری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

اس نے بار بار سر جھٹک کر بھوک کے احساس سے چھپا چھڑانے کی کوشش کی لیکن سامنے پڑی ہوئی روٹی اس کی ان کوششوں کو بری طرح ناکام بنا رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں۔

اب قوت برداشت جواب دے چکی تھی۔ اس کی آنتیں اینٹھ رہی تھیں۔ اس نے کوٹھری میں داخلہ دہر دیکھا۔ شکرہ وغیرہ فرش پر آڑے تھبتھے پڑے سو رہے تھے۔ بشارت خاموشی سے اٹھ کر کوٹھری کے کونے میں پہنچ گیا اور وہیں بیٹھ کر روٹی کھانے لگا۔ پہلا نوالہ تو اس نے شوربے میں ڈبو کر کھایا لیکن اس کے بعد اس نے شوربے کی رکابی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور سوکھی روٹی کے نوالے حلق سے اتارنے لگا۔ اس نے مشکل آدھی روٹی کھائی اور پھر اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا۔ دیوار سے ٹیک لگائی تو کمر پھوڑے کی طرح دکھنے لگی۔ وہ فرش پر لیٹ گیا اور قریب پڑا ہوا پھنسا پڑا بادلوں کا کھل اودھ لیا۔

اس کا منہ دروازے کی طرف تھلا رات کے آخری لمحات بھی بیت گئے۔ اس کی نظریں جیل کی بلند فصیل کے اوپر سے ہوتی ہوئی دور مشرقی افق پر جم گئیں جہاں پوپٹ رہی تھی اور دن کا اجالا پھیل رہا تھا۔

بشارت افق پر نظریں جمائے پھیلنے والی سرفی کو دیکھ رہا تھا لیکن شاید وہ نہیں جانتا تھا کہ افق پر پھیلنے والی سرفی سے زیادہ گہری سرفی اس کی آنکھوں میں بھری ہوئی تھی۔

☆=====☆

چھ مہینے گزر گئے۔

مجرمانہ ذہن رکھنے والے بچوں کی اصلاح کے لئے بنائی جانے والی یہ جیل دراصل جرائم کی تربیت گاہ کا کام دے رہی تھی۔ ایک معصوم اور پاکیزہ ذہن دانست یا دانستہ طور پر کسی جرم میں ملوث ہو کر سزا کاٹنے کے لئے کچھ عرصہ اس جیل کی چار دیواری میں محصور رہنے کے بعد جب باہر نکلتا ہے تو اس کے ذہن کی معصومیت اور پاکیزگی رخصت ہو چکی ہوتی ہے۔ اس کی جگہ دل و دماغ میں جرائم کے سینکڑوں نت نئے طریقے جگہ بنا چکے ہوتے ہیں۔

بشارت چھ مہینوں تک تو اپنے آپ کو بچاتا رہا وہ جیل میں رہنے والے لڑکوں سے دور ہی رہا۔ ان کی سرگرمیوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا رہا لڑکے اس سے فحش مذاق کرتے تو وہ نہ دیکھتا۔

لیکن تابہ کے.....؟ وہ اس گندے ماحول میں رہ کر اپنا دامن غلاطت کے ان چھینٹوں سے نہ بچا سکا جو اس بورسل جیل کے ہر گوشے سے اٹھ رہے تھے۔ اپنے آپ کو بچائے رکھنے کی کوشش کے باوجود اس کے ہراس دل میں اتر گئے۔

چھ مہینے گئے شکرے اور ارشد وغیرہ کا ساتھ ہونے کی وجہ سے ان کی باتیں اس پر اثر کئے بغیر نہ رہیں۔ رفتہ رفتہ بشارت بھی ان کے مذاق میں شریک ہو گیا۔ وہ ان کے پروگراموں میں حصہ لینے لگا۔ شکرے کے لیچر اس کے ذہن پر رنگ جمائے گئے۔

بشارت، شکرے کا شاگرد بن گیا۔

شکرہ ہر روز اسے جیب تراشی کے نئے نئے ٹرک سکھانے لگا اور بشارت بعض اوقات قیدی لڑکوں کی جیبوں پر ہاتھ صاف کر کے اپنے فن کا مظاہرہ بھی کرتا جس میں وہ اکثر

کامیاب رہتا۔ اگر کبھی وہ اپنے اناڑی پن کی وجہ سے پکڑا جاتا تو وہ اپنا جرم تسلیم کرنے کی بجائے اناڑی پر پلٹ پڑتا۔

اس روز جیل کے عملے کو سمجھاؤں ملی تھیں۔ شکرے نے دور کھڑے ہوئے ایک وارڈن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”لے بھی جگراج وارڈن پر ہتھ صاف کر دے۔“

شکرے کی بات سن کر بشارت لرز اٹھا۔ اس نے شکرے کو گھور کر دیکھا۔

”کیوں مجھے مروانے کی سوچ رہے ہو۔ اگر اسے پتہ چل گیا تو مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔“

”اوہ تو فکر نہ کرو میرے یاڑ۔ آخر ہم نے بھی ترے تے محنت کی ہے اور پھر..... تو تمہارا امتحان ہے۔ اگر ان تم کامیاب ہو گئے تو میں سمجھوں گا کہ تم اس فن میں تاک ہو چکے ہو۔“ شکرے نے کہا۔

”لیکن.....“

”لیکن ویکن کچھ نہیں یاڑ۔“ شکرے نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”ایک گھنٹے کے اندر ڈانڈ اس کا ہوا تمہاری جیب میں ہونا چاہیے۔“

بشارت خاموشی سے دور کھڑے ہوئے وارڈن کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ قیدیوں کے آرام کا وقت تھا۔ تمام لڑکے ادھر ادھر بھاگ دوڑ رہے تھے۔ بشارت کچھ دیر تک دور ہی سے جائزہ لیتا رہا پھر ہلکے ہلکے قدم اٹھاتا ہوا وارڈن کی طرف بڑھنے لگا۔

چند قدم چلنے کے بعد اس نے دیکھا کہ مخالف سمت سے پانچ چھ لڑکے دوڑے پلے آ رہے تھے۔ ان کا رخ وارڈن کی طرف تھا۔ بشارت نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور وہ لڑکے پیچھے ہی وارڈن سے کچھ فاصلے پر پہنچے۔ وہ بھی تیز رفتاری سے اپنی جگہ سے بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ لڑکے پیچھے ہی وارڈن کے قریب پہنچے بشارت نے تیزی سے راستہ کاٹا اور مخالف سمت سے آنے والے دو تین لڑکوں کو ساتھ لیتا ہوا وارڈن سے کھرا گیا جو بے پروائی سے کھڑا سرگٹ کے کس لگا رہا تھا۔ اس تصادم سے وارڈن اور لڑکے زمین پر گر گئے۔ زمین پر گرے وقت بشارت وارڈن کے اوپر تھا لیکن دوسرے ہی لمحہ وہ ان سے

تین چار قدم کے فاصلے پر کھڑا اپنے کپڑے بھارتیہ جھانک رہا تھا۔

دارؤن نے اپنے اوپر گرے ہوئے ایک ایک لڑکے کو پکڑ کر اٹھایا اور بے تحاشہ بیٹھا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی وہ اپنی مخصوص زبان میں ان کو مغلظات سے بھی نواز رہا تھا۔  
بشارت اس لڑکے کو پکڑا دیکھ کر خاموشی سے وہاں سے کھٹک گیا اور جب شرکے کو ایک طرف لے جا کر بشارت نے دارؤن کا ہوا اس کے ہاتھ پر رکھا تو شرکے کی آنکھیں حیرت سے پھیلنے لگیں۔ اس نے جلدی سے ہوا کھول کر دیکھا اور نوٹ نکل کر سگتے لگے شرکے نے نوٹ پاجامے کے نیچے میں اڑس لئے اور خلی ہوا وہاں سے دور جا کر پھینک دیا۔

”واہ میزے شیر۔ اودہ زندہ ڈوہ تو۔ بڑا زبردست کم دکھایا ہے بھئی۔“

شرکے نے سرگتے سلگاتے ہوئے کہا۔

”یہ تمہاری تربیت ہے شرکے۔ ورنہ میرے اندر کبھی اتنی جرأت پیدا ہو سکتی تھی۔“ بشارت نے جواب دیا۔

”اسے تم پڑک تو نہیں ہوا؟“ شرکے نے پوچھا۔

”ابھی تو اسے اپنی جیب سے ہوا اڑائے جانے کا پتہ ہی نہیں چلا ہو گا لیکن جب اسے پتہ چلے گا تو وہ سلیم سے اپنا ہوا وصول کرنے کی کوشش کرے گا۔“ بشارت نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور پھر دوسرے ہی لمحہ کسی فوری خیال کے تحت اس کے لبوں کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ ”لیکن..... افسوس تو اس بات کا ہے کہ میرے جرم کی سزا کسی اور کو ملے گی۔ جبکہ وہ اس جرم کے متعلق کچھ جانتا بھی نہیں اور بے قصور ہے۔“

”اور تمہارا اپنے باڑے میں کیا خیال ہے؟ کیا تم کسی اور کے جرم کی سزا نہیں بھگت رہے۔ کیا یہ سارا کچھ تمہارے اپنے جرم کا نتیجہ ہے؟“ شرکے کے لہجے میں سختی تھی۔

”لیکن میرا دل نہیں مانتا یار۔“ بشارت نے کہا۔

”ڈل سل کی گلاں چھوڑ یاز بس تو دم پکڑ لے۔“ شرکا بشارت کے کندھے پر ہاتھ

مار کر بولا۔

”نہیں، نہیں..... میں تمہارے راستے پر کبھی نہیں آؤں گا..... کبھی نہیں۔“ بشارت نے کہا اور تیزی سے وہاں سے چلا گیا۔  
شرکا متنی خیر لگا ہوں سے اسے جانتے ہوئے دیکھتا رہا اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ آگئی تھی۔

اور پھر ٹھیک ایک گھنٹے بعد جیل میں زبردست ہنگامہ ہو گیا۔ ایک طرف سے شور و غل کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ان میں دو تین لڑکوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں بھی شامل تھیں۔

یہ آوازیں سن کر بشارت نے شرکے کی طرف دیکھ کر شرکے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے بشارت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور بائیں ہاتھ کا گوشہ مخصوص انداز میں دبا دیا۔ ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ کچھ اور گرمی ہو گئی۔

جیلوں کی آوازیں کچھ اور بلند ہو گئیں۔ بشارت شیڈ سے نکل کر ایک طرف دوڑتا چلا گیا۔ جیل کے کپڑوں میں ایک طرف قیدی لڑکوں کا ٹھٹھا لگا ہوا تھا۔ ان کے وسط میں دو سنتریوں نے سلیم اور ایک لڑکے کو پکڑ رکھا تھا۔ وہ دونوں انہیں بے تحاشہ پیٹ رہے تھے۔ سلیم کے جسم پر پڑنے والی ہید کی ہر ضرب اسے چیخنے پر مجبور کر دیتی۔

ڈپٹی جیلر بھی ایک طرف کھڑا تھا۔ سلیم کو پیٹنے والا وہی دارؤن تھا جس کا ہوا غائب ہوا تھا۔ بشارت چندے سے وہاں رکتا یہ منظر دیکھ کر اس کا ضمیر کچھ کے لگا رہا تھا۔ وہ بھیڑے نکلا اور دوڑتا ہوا شرکے کے پاس پہنچ گیا۔

”وہ..... وہ ہوا وہاں دے دو شرکے۔“ کچھ جذبات اور کچھ دوڑنے کی وجہ سے بشارت کا سانس پھولا ہوا تھا۔

”کیا.....؟“ شرکے نے اسے گھورا۔ ”کون سا ہوا میزے یار وہ تو میں نے اسی وقت پھینک دیا تھا۔“

”تو پھر وہ رقم دے دو جو تم نے ہوائے سے نکال کر اپنے پاجامے کے نیچے میں اڑی تھی۔“ بشارت نے کہا۔

”ہوں۔“ شرکے نے اس کی آنکھوں میں جھانک۔ ”تو یہ بات ہے، مگر تمہیں آدمی رقم دل سکتی ہے۔“

”آدمی نہیں۔ میں پوری رقم مانگ رہا ہوں۔“ بشارت نے کہا۔  
 ”پوری رقم نہیں۔ آدھا حصہ چاہو تو بے شک لے لو۔“

شکرے نے سرگیت کا کش لگاتے ہوئے دھواں اس کے منہ پر اچھال دیا۔

بشارت خاموش کھڑا شکرے کو گھورنے لگا۔ سلیم کی چیخیں بدستور اس کے کانوں سے گھرا رہی تھیں۔ اس کے دماغ پر ہتھوڑے سے برس رہے تھے۔ شکرے کا رویہ دیکھ کر بھی اس کا دماغ بے قابو ہو رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ شکرے کا گلا گھونٹ دے لیکن وہ بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

”مجھے اپنا حصہ نہیں لینا شکرے..... پوری رقم دے دو۔ میں وارڈن کو واپس کر دوں گا۔“

”کیا.....؟“ شکرہ اچھل پڑا۔ ”یہ نہیں ہو سکتا بشارت۔ ہاتھ آیا ہوا مال واپس نہیں کیا جاتا۔“

”لیکن یہ کیونکی ہے۔ ذلات ہے، ظلم ہے۔ میرے جرم کی سزا کسی اور کو مل رہی ہے۔ تم سلیم کی چیخیں سن رہے ہو..... رقم واپس دے دو۔ میں اسے بچانا چاہتا ہوں۔“ بشارت نے تیز لہجے میں کہا۔

”رقم واپس نہیں ہو سکتی..... جانتے ہو اگر تم نے رقم واپس کر دی تو سلیم کی جان توجہ جانے کی لیکن تم نہیں بچ سکو گے۔“ شکرے نے کہا۔

”میں اپنے کئے کی سزا بھگتے کو تیار ہوں لیکن یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی ناکردہ گناہ میں مارا جائے۔ تم رقم واپس کر دو ورنہ.....“ بشارت نے خاموش ہو کر ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیا۔

”وڑنے.....؟“ شکرے نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

”ورنہ میں ابھی شکرہ چا دوں گا کہ بڑا سلیم نے نہیں تم نے نکالا تھا اور رقم بھی تمہارے پاس موجود ہے۔“ بشارت نے کہا۔

”تو یہ بات ہے۔“ شکرے نے اسے گھورا۔

”ہاں۔ اور تم جانتے ہو کہ اس طرح تم سراسر گھائے ہی میں رہو گے۔“ بشارت

نے جواب دیا۔

بات منقول تھی۔ شکرہ اس دھمکی سے گھبرا سا گیا تھا۔ وہ چند لمبے بشارت کو گھورتا رہا پھر پاجامے کے پیٹے میں اڑے ہوئے نوٹ نکال کر خاموشی سے بشارت کی طرف بڑھا دیئے۔ بشارت نے نوٹ اس کے ہاتھ سے لئے اور دوڑتا ہوا شیڈ سے باہر نکل گیا۔ شکرہ بھی اس کے پیچھے ہی پیچھے چلا آیا تھا۔

”غصہ۔“ غصہ۔“ غصہ۔ اسے مت مارو۔ بڑا ان میں سے کسی نے نہیں نکالا۔“ بشارت لڑکوں کو دھکیلتا ہوا ان کے قریب پہنچ گیا۔

”کیا ہے اوئے..... کیا کہہ رہا ہے ٹو۔“ ہیڈ وارڈن نے غصیلی نظروں سے بشارت کی طرف دیکھا۔

”بڑا میں نے نکالا تھا۔ یہ دونوں بے قصور ہیں۔ انہیں چھوڑ دو۔“ بشارت نے جواب دیا اور مٹھی میں پکڑے ہوئے نوٹ وارڈن کی طرف بڑھا دیئے جس کا بڑا تھا۔ وارڈن نے جھپٹنے والے انداز میں نوٹ پکڑ کر گئے۔ رقم پوری تھی۔

”بڑا کہاں ہے؟“ اس نے کڑکتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”بڑا میں نے کمر میں پھینک دیا تھا۔“ بشارت نے جواب دیا۔

سلیم اور دوسرے لڑکے کو چھوڑ دیا گیا۔ دونوں وارڈن اب بشارت کی طرف متوجہ ہو گئے۔ چاروں طرف کھڑے ہوئے قیدی بھی بشارت کے گرد جمع ہونے لگے۔

پھر اچانک ہی وارڈن کا گھونہ بشارت کے جڑے پر لگا اور وہ تورا کر گر گیا۔ پھر تو تعجب۔ کئے اور ٹھڈے بشارت کے جسم پر پڑنے لگے۔ مگر بشارت کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ اس نے اپنے ہونٹ سختی سے سمجھ رکھے تھے۔

جب دونوں وارڈن اچھی طرح اپنے دل کی بھڑاس نکال چکے تو ایک طرف کھڑے ہو کر ہانپنے لگے۔ ہیڈ وارڈن آگے بڑھا اور بشارت کے جسم پر زوردار ٹھوکر رسید کرتے ہوئے پیٹا۔

”اسے لے جا کر سترہ نمبر کونٹری میں بند کر دو اور پرسوں صبح تک اسے کھانے کو کچھ نہ دیا جائے۔“

ایک سنتری نے بشارت کو بازو سے پکڑا اور اسے گھینٹا ہوا ایک طرف لے جانے لگا۔

ستورہ ہر ایک نہایت تنگ و تاریک کوٹھری تھی۔ کوٹھری کی بجائے اسے غار کسائی مناسب ہو گا کیونکہ جگہ اتنی تنگ تھی کہ اس میں ایک شخص آکر نہ بیٹھ سکتا تھا لیکن بیہ نہیں پھیلائے جاسکتے تھے۔

سنتری نے اسے غار نما کوٹھری میں دھکیل کر دروازہ بند کر کے باہر سے لالہ لگا دیا۔ کوٹھری میں گھور تاریکی تھی۔ کوئی روشندان اور سوراخ ایسا نہیں تھا جہاں سے روشنی کی ایک کرن بھی اندر داخل ہو سکتی۔ بشارت نے ہاتھوں سے دیوار کو متقل کر آگے بڑھتا چلا لیکن وہیں گھوم کر رہ گیا۔ کوٹھری اتنی تنگ تھی کہ وہ دونوں ہاتھ پوری طرح پھیلائے بغیر آنے سامنے کی دیواروں کو چھو سکتا تھا۔

اس نے ایک سر آدھری اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا لیکن جو غنی اس نے بیہ پھیلائی کی کوشش کی ایک مرتبہ پھر اس کے منہ سے آہ نکل گئی اتنی جگہ نہیں تھی کہ وہ بیہ پھیلا سکتا۔

وہ گھٹوں میں سر دپے بیٹھا رہا اور جب اس طرح بیٹھے بیٹھے تنگ گیا تو دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ ایک ٹھنڈ اور گزر گیا۔ یوں کھڑے کھڑے بھی اس کی ٹانگیں دکھنے لگیں۔ وہ پھر بیٹھ گیا لیکن کچھ دیر بعد اسے پھر اٹھ جانا پڑا۔

پانچ گھنٹے گزر گئے۔ وہ بھی اٹھ کر کھڑا ہو جانا اور جب کھڑے کھڑے ٹانگیں اکڑ جاتیں تو بیٹھ جاتا۔ جسٹن سے اس کی بری حالت ہو رہی تھی۔ اس کے بدن کا ایک ایک حصہ چھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا اور لہجہ بہ لہجہ یہ تکلیف بڑھتی جا رہی تھی۔ بورشل جیل میں اس جیسے نو عمر قیدی کو ایسی سزا ظلم و بربریت کی انتہا تھی۔ اسے یہ سزا سچ بولنے پر ملی تھی لیکن اس کے باوجود وہ مطمئن تھا۔ اس کا دل بے سکون تھا اور اس کا ضمیر مطمئن تھا۔

ہر لحظہ بڑھتی ہوئی تکلیف اسے مارے دے رہی تھی اور اب تو جھٹکن کا احساس بھی ہونے لگا تھا۔ اس تنگ و تاریک کوٹھری میں ہوا کی آمد و رفت کا بھی کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اس کا جم پیسے میں تر ہونے لگا۔

وہ ایک بار پھر گھٹوں میں سر دے کر بیٹھ گیا۔ قوت مدافعت کمزور پڑنے لگی حد سے زیادہ بڑھتی ہوئی تکلیف سے اس کے ہونٹوں سے ہلکی ہلکی کراہیں خارج ہونے لگیں اور یہ کراہیں بتدریج گھٹتی گھٹتی سسکیوں میں بدلتی گئیں۔

دس گھنٹے گزر گئے۔ اذیت حد سے بڑھ گئی تھی۔ اس کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ وہ اٹھ کر زور سے دروازہ پیٹنے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ چلا بھی جا رہا تھا۔ آدھے گھنٹے تک وہ مسلسل دروازہ پیٹتا اور چپٹا چلا تا رہا۔ آخر کار دروازے کے باہر بھاری قدموں کی آواز سنائی دی جو دروازے کے قریب آ کر رک گئی۔

بشارت بدستور دروازہ پیٹتا اور چپٹا رہا۔ سالے میں چابی گھمانے کی آواز سنائی دی تو اس کے ہاتھ رک گئے اور وہ دروازے کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ باہر سے کسی نے زوردار جھنگے سے دروازہ کھولا۔ بشارت دروازے کے ساتھ ٹیک لگے کھڑا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ باہر کی طرف گرا۔

اس اذیت نے اسے بری طرح بے حال کر دیا تھا۔ اس میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ اپنے آپ کو سنبھال سکے۔ باہر کی تازہ ہوا میں وہ ذہن پر پڑے پڑے لمبے سانس لینے لگا۔ اس کی آنکھیں بند ہو جا رہی تھیں۔ اس نے ایک مرتبہ آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھا۔ ہر نو گری تاریکی تھی۔ اس نے اٹھنا چاہا لیکن کلاسیاب نہ ہو سکا۔ اعضا ڈھیلے پڑ گئے۔ جسم میں جیسے جان نہیں رہی تھی۔ وہ ادھ موٹا سا ہو رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے سیاہی کی دیوار چھلچھلی چلی گئی۔ اس نے ایک بار پھر اٹھنے کی کوشش کی مگر اس کا سر ایک جھٹکے سے سامنے کھڑے ہوئے وارڈن کے قدموں پر ڈھک گیا۔

بشارت بے ہوش ہو گیا تھا۔ بشارت کے قریب کھڑے ہوئے وارڈن نے اپنے ساتھی کی مدد سے بے ہوش بشارت کو اٹھایا۔ وہ اسے ڈیڑھا ڈوبی کرتے ہوئے لے گئے اور اس کی کوٹھری میں ڈال کر چلے گئے۔

☆=====☆

بشارت رات بھر بے ہوشی کی حالت میں پڑا رہا۔ صبح جب ہوش میں آ کر آنکھیں کھولیں تو شکرے کو اپنے اوپر جھگے ہوئے دیکھ کر اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن کراہ کر رہ گیا۔ اس کے بدن کا ایک ایک عضو چھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ "آرام سے لیٹے رہو۔ تمہیں آزام کی ضرورت ہے۔" شکرے نے اس پر مزید جھگٹے ہوئے کہا۔

”آرام۔“ بشارت کے ہونٹوں پر افسردہ سی مسکراہٹ پھلپھلا کر رہ گئی۔ ”ہم جیسے لوگوں کی زندگی میں آرام نامی کسی چیز کا کڑا نہیں شکر ہے۔“

”تو دیکھ لیا تم نے اپنی شرافت اور دیانت کا انجام۔“ شکرے کے لیے میں خطر تھا۔ ”ہاں۔ لیکن مجھے اس کا کوئی افسوس نہیں ہے۔ میں نے جرم کیا تھا مجھے اس کی سزا ملی۔ بلکہ مجھے تو..... اس بات کی خوشی ہے کہ میرے جرم کی سزا کسی دوسرے کو نہیں ملی۔“ بشارت نے کمزور سی آواز میں جواب دیا۔

”اوہ۔“ شہر کا پڑیل۔ ”جی مل گئی بل نہ گیلہ تہاڑی یہ شرافت اور دیانت‘ ایک دن تمہیں لے ڈوبے گی۔ اچھا خیر..... میں نے صبح سے تہماڑے لئے چائے رکھی ہوئی ہے۔ لو پی لو۔“ شکرے نے اسے سارا دے کر اٹھنا چاہا تو پری طرح چونک گیا۔ ”اوہ۔ تمہیں تو بہت تیز بخاڑ ہو رہا ہے۔ لو۔ پیلے چائے پی لو۔ پھر میں تیل کے ڈاکٹر سے تہماڑے لئے دوائی شواہی لاتا ہوں۔“ اس نے سارا دے کر بشارت کو بٹھا دیا اور صبح سے ایلو میٹیر کے گلاس میں رکھی ہوئی ٹھنڈی اور کھلی چائے اسے پلانے لگا۔

بشارت کو لٹا کر شہر کا ٹھوگر سے نکل کر دوڑتا ہوا ایک دارڈن کے پاس پہنچ گیا اور اسے بشارت کے بارے میں بتانے لگا۔

”ڈاکٹر تو آج چھٹی پر ہے۔ ڈپٹی صاحب سے بولو۔ شاید وہ کوئی بندوبست کر دیں۔“ دارڈن نے کہا۔

شہر کا ڈپٹی جیلر کے کمرے میں تھس گیا۔ ”کیا بات ہے۔ تم یہاں کیسے آگئے؟“ ڈپٹی نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ اس کے لیے میں فرعونیت تھی۔

”ڈپٹی صاحب بشارت کو بڑا تیز بخاڑ ہے۔ ڈاکٹر آج نہیں آیا۔ بشارت کی حالت بہت خراب ہو رہی ہے۔ اسے اسپتال بھجوا دیجئے۔“ شہر ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گیا۔

”بخار ہے تو میں کیا کروں۔ یہاں سب ہی لوگ کام سے بچنے کے بدلے تلاش کرتے ہیں۔“ ڈپٹی کے لیے میں سرد مری تھی۔

”وہ مڑ جائے گا ڈپٹی صاحب۔“ شہر اٹھ گیا۔

”جیل اونے دفع ہو، جیلوں میں قیدی روزی مارتے رہتے ہیں۔“ ڈپٹی نے کہا۔ ڈپٹی کی فرعونیت دیکھ کر شکرے کو مزید کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ ڈپٹی کے کمرے سے نکل کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا بشارت کے پاس پہنچ گیا۔

بشارت آنکھیں بند کئے لیٹا لیے لیے سانس لے رہا تھا۔ شکرے کے قدموں کی آواز سن کر اس نے آنکھیں کھول دیں اور سوائے لٹا ہوں سے اس کی طرف دیکھ لگا۔

”ڈاکٹر آج نہیں آیا اور ڈپٹی نے تمہیں اسپتال بھیجے سے انکاڑ کر دیا ہے۔“ شکرے نے دھمی آواز میں کہا۔

بشارت نے کچھ کہنا چاہا مگر غصہ کے باعث اس کے منہ سے آواز نہ نکل سکی۔ ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔ اس نے آنکھیں بند کھلیں اور لیے لیے سانس لینے لگا۔

شہر اس کے قریب ہی فرش پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اسی دوران ایک سنتری دروازے کے سامنے سے گزرا۔ اس نے شکرے کو دہل دیکھا تو اندر آگیا۔

”اونے شکرے۔ تم یہاں کیوں بیٹھے ہو۔“ سنتری نے اسے گھورا۔

”سنتری جی۔ بشارت کو بڑا تیز بخار ہے۔ میں اس کی دیکھ بھال کے لئے یہاں بیٹھا ہوں۔“ شکرے نے جواب دیا۔

”میں پوچھتا ہوں تم اپنا کم چھوڑ کر یہاں کیوں آئے۔“ سنتری دھاڑا۔

”سنتری جی.....“

”جیل اٹھ اونے حرام کے جنے۔ باپ کا مال بھجھ کر مفت کی روٹیاں توڑتے ہو۔“ حرا۔ ”سنتری نے آگے بڑھ کر اسے زوردار ٹھوکر مار دی۔

ٹھوکر کھا شہر، بشارت کے اوپر گرا۔ ابھی وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ دوسری ٹھوکر پڑی۔

”اگر دو منٹ کے اندر اندر تم اپنے کھاتے میں نہ پہنچے تو کھال اڈھیر دوں گا۔“ سنتری تیسری ٹھوکر رسید کرتے ہوئے دھاڑا۔

شکرے نے بے بسی سے بشارت کی طرف دیکھا اور اٹھ کر خاموشی سے باہر نکل گیا۔ بشارت کی آنکھوں سے آنسو نکل کر اس کے رخساروں پر بہنے لگے۔ سنتری اب اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔



یہ بتایا کہ آج اسے رہا کیا جا رہا ہے تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔

”مجھے امید ہے کہ تم اپنی آئندہ زندگی میں ایک شریف شہری بننے کی کوشش کرو گے اور کبھی ایسا کام نہیں کرو گے جس سے تمہیں پھر اس چار دیواری کے اندر آنا پڑے۔“

”ڈپٹی صاحب! میں نے تو پہلے بھی کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ تقدیر یہ تھی جو مجھے یہاں کھینچ لائی۔ اگر وہ لوگ مجھے پکڑ نہ لیتے تو شاید میں اپنی باقی کو غنڈوں کے چنگل سے بچا لیتا۔“ بشارت نے گورنر سے لمبے میں جواب دیا۔

”بہر حال! ڈپٹی! اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ”اب تم آزاد ہو اور ماشاء اللہ جوان بھی ہو۔ کہیں نوکری کر لینا اور اپنی بہن کی تلاش بھی جاری رکھنا۔ اب تم جاکتے ہو۔“

بشارت ڈپٹی جیلر کو سلام کر کے وارڈن کے ساتھ دفتر سے باہر آگیا۔ چند منٹ بعد جیل کے گیٹ سے باہر قدم رکھتے ہوئے اسے کچھ عجیب سا احساس ہوا۔ آزادی کا فرحت بخش احساس۔

چند قدم چلنے کے بعد وہ رک گیا۔ پلٹ کر جیل کے بلند آہنی گیٹ اور اونچی فصیل کی طرف دیکھا اور پھر مڑ کر تیز قدم اٹھاتا ہوا ایک طرف کو چل پڑا۔ ایک نئی منزل کی تلاش میں۔

☆=====☆

دو سال جیل کی اونچی دیواریں کے پیچھے رہنے کے بعد بشارت جب آزاد اور کھلی فضا میں آیا تو اسے کچھ عجیب سا لگ لہور کے بازار اور گلیاں کو سچے اسے انجانے اور اجنبی سے لگ رہے تھے۔ اس کی حالت اس پنڈو جیسی تھی جو پہلی دفعہ شہر آیا ہو اور ہر چیز کو حیرت سے دیکھ رہا ہو۔

آزادی کی فوید سناتے ہوئے ڈپٹی جیلر نے اسے تھوڑی سی رقم دے دی تھی جو اس نے بڑی احتیاط سے قمیص کی جیب میں رکھی ہوئی تھی۔ وہ دو رنگ پیدل چل رہا اور پھر ایک تانگے پر بیٹھ کر بھائی بیچ گیا۔ دہلی سے لاری آئے کی طرف جانے والے دوسرے تانگے پر بیٹھا اور کھلائی گیٹ کے سامنے اتر گیا۔ دیش میں سڑک پار کرنے میں اسے دو

منٹ لگے۔

سب کچھ وہی تھا۔ ان دو برسوں میں یہاں کوئی بڑی تبدیلی نہیں ہوئی تھی لیکن بشارت کو ہر چیز انجان سی لگ رہی تھی۔ اجنبیت ہی لپک رہی تھی۔ وہ کھلائی گیٹ کے اندر سڑک پر چلا ہوا اس کشادہ گلی کے موڑ پر رک گیا جس کی ایک کھڑ پر چاچا حاکم علی کی دودھ دہی کی دکان تھی اور دوسری طرف بیڑا باجے والے کی دکان تھی۔ دونوں دکانیں اب بھی اپنی اپنی جگہ پر موجود تھیں۔ چاچا حاکم علی اس وقت بھی سر پر بڑا سا گڑ پاندھے دودھ سے بھری ہوئی کڑائی کے پیچھے ایک اونچی چوکی پر بیٹھا ہوا تھا۔ دوسری طرف بیڑا باجے والے کی دکان بھی جوں کی توں تھی۔ اندر دیواروں پر بڑے بڑے فلمی پوسٹر لگے ہوئے تھے جن پر بڑے بڑے ہنگ اور بیڑا میں استعمال ہونے والے دیگر ساز لگے ہوئے تھے۔ دو آدمی فرش پر بچھی ہوئی درزی پر بیٹھے بڑے بھدے سڑوں میں کوئی فلمی دھن بجانے کی سرسر کر رہے تھے۔

اس کشادہ گلی کے دونوں طرف دکانیں تھیں اور آگے جا کر دائیں بائیں کئی عکس ی گلیاں پھوٹی تھیں۔ بشارت بائیں طرف مڑ گیا اور کئی عکس اور گندی گلیوں میں گھومتا ہوا ایک گلی کے موڑ پر کھلی کے ایک کھمبے کے قریب رک گیا۔ کھلی کا پول دیکھ کر اسے وہ لمحات یاد آگئے جب وہ رات کو اس پول پر چلنے والے بلب کی روشنی میں بیٹھ کر پڑھا کرتا تھا۔ وہ بے اختیار پول سے لپٹ گیا۔ اسے عجیب سا سکون ملا۔

گلی میں داخل ہو کر وہ اپنے مکان کے سامنے پہنچا تو ٹھک کر رک گیا۔ وہ شاید غلط جگہ پر آ گیا تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھ لیا۔ یہ وہی جگہ تھی۔ مگر اس کا یہ مکان۔ اس کی دیواریں نہ تو ٹوٹی پھوٹی تھیں نہ بے رنگ۔ دیواروں پر بڑی مٹائی سے پینٹ کیا گیا تھا جس پر آف وائٹ ڈسٹیمپ تھا۔ دروازہ بھی نیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر ابھی ہوئی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ لیا وہی گلی تھی، سامنے وہی ملک صاحب کا مکان تھا۔ یہ مکان بھی وہی تھا مگر اس کی حرمت اور رنگ و روغن کس نے کرا دیا ہے؟

انہی خیالوں میں کھوئے ہوئے بشارت نے دھکا دے کر دروازہ کھولا۔ چلا مگر دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ پٹ پٹھتہ پٹھتہ لگ لگ چند لمحوں بعد اندر سے کھیر کرنے کی آواز سنائی دی اور ایک پٹ تھوڑا سا کھل گیا۔ بشارت بے مہربانی سے دروازے کو دھکیل کر اندر



ایک بار پھر اسے اوپر سے نیچے دیکھنے لگا۔  
بشارت کے دل پر گھونسا سالگ۔ اس کی حالت تو واقعی جہنم خانے کا چندہ مانگنے والوں جیسی تھی۔

”جی نہیں نہ کسی جہنم خانے کا نمائندہ ہوں اور نہ ہی کسی اور خیراتی ادارے کے نام پر چندہ جمع کر رہا ہوں۔ میں تو.....“ بشارت کہتے کہتے پھر رک گیا۔  
”اور فیریتوں کی چائینڈ۔“ اس شخص نے گھورتے ہوئے پوچھا۔  
”میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ اس مکان میں کب سے اور کس کی اجازت سے رہ رہے ہیں؟“ بشارت نے کہا۔

”کی معلل اسے تراب۔ اوئے کون کون ہوتا ہے پوچھنے والا۔“ اس مرتبہ اس شخص نے لہجے میں تکی تھی۔

”میں اس مکان کا مالک ہوں اور مجھے آپ سے پوچھنے کا حق حاصل ہے۔“ بشارت نے پُر سکون لہجے میں جواب دیا۔  
”مجھے نہیں معلوم کہ اس مکان کے مالک تم تھے یا کوئی اور لیکن اب اس کا مالک میں ہوں۔ یہ مکان میں سے مول لیا ہے۔“

”مکرم نے تو یہ مکان نہیں بیچا۔“ بشارت نے جواب دیا۔ ”میں دو سال بعد یہاں آیا ہوں اور اس دوران آپ مالک بن گئے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں جانتا ہوں تم آج سے دو سال پہلے جیب تراشی اور مارییٹ کے جرم میں جیل گئے تھے اور یہ مکان تمہارے بیوے نے اپنی زندگی میں ہی کسی کے پاس سات ہزار روپے میں گروی رکھا ہوا تھا اور وہ وقت پر قرضہ ادا نہ کر سکا اس طرح وہ اس مکان کی ملکیت سے محروم ہو گیا۔“

بشارت کا دماغ گھوم گیا۔ اسے اس کے ماں باپ نے کبھی یہ نہیں بتایا تھا کہ مکان گروی رکھا ہوا ہے۔

دیوے یہ حقیقت تھی کہ آج سے بارہ سال پہلے علی خان جب بیمار ہوا تھا تو اس نے حالات سے تنگ آکر گھر کی ہر چیز فروخت کرنے کے بعد یہ مکان بھی ایک ساہوکار کے پاس پانچ ہزار روپے میں گروی رکھ دیا تھا اور بعد میں دو ہزار روپے اور بھی لئے تھے اور

داخل ہو گیا۔ سامنے ہی ایک نوجوان لڑکی کھڑی تھی۔ جو عجیب سی نظروں سے بشارت کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”نمبر ہائی.....!“ بشارت کے منہ سے بے اختیار نکلا اور وہ ہانپیں پھیلا کر آگے بڑھا لیکن دوسرے ہی لمحہ ٹھک کر رہ گیا۔ وہ نوجوان لڑکی اس کی نچرہ ہائی تو نہیں تھی۔ بشارت نے غور سے دیکھا۔ وہ تو کوئی اور ہی لڑکی تھی جو اس کے لئے قطعی اجنبی تھی۔ لڑکی بھی ایک اجنبی نوجوان اس طرح اندر گھسنے دیکھ کر گھبرا سی گئی تھی۔ وہ بدحواس سی ہو کر تیزی سے پیچھے ہٹ گئی اور پھر اچانک ہی بشارت کے منہ سے نکلنے والے ”نمبر ہائی“ کے الفاظ اس کے ذہن میں گونج گئے۔

”مکان نمبر ہائی..... کون ایس توں۔“ لڑکی نے اسے گھورا۔  
”جی۔ میری بہن نمبر..... میں بشارت ہوں۔ ہم لوگ یہیں رہتے تھے۔ اسی گھر میں۔“ بشارت نے رک رک کر کہا۔

”اوہ!“ لڑکی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ وہ مزید کچھ کہنا چاہتی تھی کہ ایک کمرے سے ایک مردانہ آواز سنائی دی۔

”کون ہے غزالہ پتر۔ کس سے باتیں کر رہی ہو؟“  
”پتہ نہیں کون اسے لہ۔“ لڑکی نے اندر کی طرف منہ کر کے کہا۔ پھر بشارت سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”آپ باہر ٹھہریں۔ میں ابے کو بھیجتی ہوں۔“

بشارت کے دل کو دھچکا سالگ۔ اسے اپنے ہی مکان میں داخل ہونے سے روک کر باہر ٹھہرنے کو کہا جا رہا تھا۔ اس نے عجیب سی نظروں سے غزالہ ہائی اس لڑکی کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکا کر دروازے سے باہر ٹھہر گیا۔ غزالہ دروازہ کھینچ کر اندر چلی گئی۔

پانچ منٹ کے انتظار کے بعد ایک ادیبہ عمر آوی باہر آیا۔ چند لمحوں تک بشارت کو اوپر سے نیچے تک گھورتا رہا پھر اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔

”کیا بات ہے۔ کس سے ملنا ہے پتر۔“  
”جی وہ.....“ بشارت کی سمجھ میں نہیں آ سکا کہ کیا اسے اور کس طرح کہے۔

”ہاں ہاں کوہ۔ کیا کہنا چاہتے ہو لیکن یہ سن لو کہ اگر تم کسی جہنم خانے یا ایسے کسی خیراتی ادارے کے لئے چندہ مانگنے آئے ہو تو میرا وقت ضائع مت کرو۔“ وہ ٹھہر

”میں علی بھائی کا بیٹا بشارت علی ہوں۔ اپنے مکان کے متعلق کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔“ بشارت نے جواب دیا۔

”کون علی خان؟“ چوہدری عمر کی آنکھوں میں الجھن سی تھری گئی۔

”میرا خیال ہے آپ کو علی خان کا نام اتنی جلد فراموش نہیں کر دیتا چاہئے۔ اگر بھول بھی گئے ہیں تو میں یاد دلا دیتا ہوں۔“ بشارت نے کہا اور پھر اسے مکان کے بارے میں بتانے لگا۔

”اوہ۔ اچھا۔“ چوہدری عمر کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”تم شاید نہیں جانتے کہ میرے اور تمہارے بیچ کے درمیان ایک معاملہ ہوا تھا جس کی رو سے مقررہ مدت کے اندر مکان نہ چھڑا سکنے کی صورت میں مکان فروخت کر کے میں اپنے قرضے کی رقم مع سود کے وصول کر سکتا تھا اور.....“

”ایسی صورت میں بھی آپ باقی رقم واپس کو ادا کرنے کے پابند تھے۔“ بشارت نے اس کی بات کاٹ دی۔

”بالکل۔“ چوہدری نے سر ہلایا۔ ”لیکن صورت حال یہ ہے کہ علی خان کے انتقال کے چند مہینے پہلے ہی معاملہ کی مدت پوری ہو گئی تھی۔ میں اگر چاہتا تو اس وقت مکان غلام کروا دیتا۔ مجھے عدالت سے ڈکری مل جاتی لیکن علی خان کی حالت دیکھتے ہوئے میں نے ایسا نہیں کیا اور اس کے انتقال کے بعد مجھے تم دونوں بہن بھائیوں پر ترس آگیا۔ میں نے بیٹم اور لاوارث بچوں کو بے گھر کرنا مناسب نہیں سمجھا اور پھر حالات نے ایسی کروٹ لی کہ مجھے مجبوراً وہ قدم اٹھانا پڑا۔ میں نے اپنی رقم وصول کرنے کے لئے مکان فروخت کر دیا۔“

”آپ نے وہ مکان تین لاکھ میں فروخت کیا تھا۔ اپنی رقم کاٹنے کے بعد باقی رقم؟“ بشارت نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”جس روز میں نے عدالت سے ڈگری حاصل کی تھی اس روز تک انٹریٹ ملا کہ رقم پوری ہو گئی تھی بلکہ میری کچھ رقم علی خان کی طرف نکلتی تھی لیکن وہ میں نے معاف کر دی۔“ چوہدری عمر نے کہا۔

”لیکن میں تمہیں معاف نہیں کروں گا۔“ بشارت نے کہا۔ ”معاذ کے کی مدت

ان میں یہ طے پایا تھا کہ علی خان اگر مقررہ مدت میں قرض ادا نہ کر سکا تو ساہوکار اس مکان کو فروخت کر کے اپنا قرضہ مع سود کے وصول کرے گا اور باقی رقم اسے ادا کر دے گا۔ چارہ علی خان طویل بیماری کے دوران قرضہ ادا نہ کر سکا اور اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

”شاید تمہیں اس بات کا علم نہیں لیکن یہ حقیقت ہے۔ میں نے اپنا اطمینان کرنے کے بعد ہی یہ مکان خریدا تھا۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں کاغذات دکھا سکتا ہوں۔“

”جی نہیں۔ مجھے کاغذات دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ آپ مجھے اس ساہوکار کا نام اور پتا بتادیں جس سے آپ نے مکان خریدا تھا۔“ بشارت نے کہا۔

”چوہدری عمر۔“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”سود کا کاروبار کرتا ہے۔ غریبوں کا خون چوس کر بڑی دولت جمع کر رکھی ہے۔ شاہ عالمی میں اس کا دفتر ہے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا۔ ”یہ مکان میں نے تین لاکھ میں خریدا تھا اور تمہارے باپ نے اس سے غالباً سات ہزار روپے قرض لئے تھے۔ اگر وہ سود ملا کر بھی رقم کانٹے تو تمہاری بہت سی رقم بچتی ہے۔ تم یہ رقم قانونی طور پر بھی اس سے وصول کر سکتے ہو۔“

بشارت نے اس شخص کا شکریہ ادا کیا۔ مکان کے در و دیوار پر الوداعی نظر ڈالی اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہو اگلی میں مڑ گیا۔

شاہ عالمی میں چوہدری عمر کا دفتر بہت شاندار تھا۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ قیمتی اور آرام دہ صوفے لگے ہوئے تھے۔ ایک صوفے پر دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے اور سامنے ہی شیشے کے ٹپ والی آفس ٹیبل کے پیچھے رہو الوٹک چیئر پر قیمتی لباس پہنے ایک موٹا سا شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں کی دو دو انگلیوں میں سونے کی انگوٹھیاں چمک رہی تھیں۔

بشارت کو اس طرح اندر آتے دیکھ کر وہ تینوں اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

چوہدری عمر گھورتی ہوئی نظروں سے بشارت کے سروپا کا جائزہ لے رہا تھا۔

”کون سی چٹن..... پانچ گھنٹوں سے اوپر۔“ قیس کا گریبان کھلا ہوا..... اوپر کو ردول کئے ہوئے آستین۔

”کیا بات ہے۔ کون ایسا توں؟“ چوہدری عمر نے اسے گھورا۔

مناسب ہی جگہ دیکھ کر لیٹ گیا۔ تھکا ہوا تو تھا ہی، لیٹنے ہی سو گیا۔

ابھی اسے سوئے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ کسی نے جھنجھوڑ کر اسے جگا دیا۔  
”اوسے نواب دے پوتے۔ کھکو میاں سے۔ یہ میری جگہ ہے۔“ بشارت کے سامنے کھڑے ہوئے ایک بٹے کئے بھکاری نے خونخوار لہجے میں کہا۔ ”اے اٹھتے ہو یا میں اٹھا کر پیچنک دوں۔ جگہ دار کرایہ ہم دیں اور آرام ٹوک رہا ہے۔“

بھکاری کے چور دیکھ کر بشارت نے وہاں سے اٹھ جانے ہی میں عافیت سمجھی۔ وہ اٹھ کر ادھر ادھر نظر نین دھڑانے لگے تھوڑا کلاس کے اس وسیع مسافر خانے میں اسے کہیں بھی ایسی جگہ نظر نہیں آئی جہاں وہ لیٹ سکتا۔ مسافر خانے کی ایک ایک اونچ زمین پر دن بھر بازاروں میں لوٹے لنگڑے اور پانچ بن کر بیک مائنگے والے بٹے کئے اور قابل رشک صحت کے مالک بھکاریوں نے جتنی جتنی ہمارا کھاتہ۔

بشارت کو میزبوں کے نیچے کچھ خالی جگہ نظر آگئی اور وہ ایک بھکاری کے قریب ہی لیٹ گیا لیکن ابھی آنکھیں پوری طرح بند نہیں ہوئی تھیں کہ ایک پولیس والا ہاتھ میں موٹا سا ڈنڈا لے اس کے سر پر پہنچ گیا۔

”اوسے کون ہو تم؟“ کانٹیل غریباں اسے ٹھوکر مارتے ہوئے غرایا۔ ”واردائے گتے ہو۔“ پولیس والا خونخوار نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔

”جی نہیں۔ مسافر ہوں۔ صرف رات گزارنا چاہتا ہوں۔“ بشارت نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”جھوٹ بولتے ہو۔“ کانٹیل غریباں۔ ”لیکن خیر۔ یہاں رات گزارنے کا کرایہ جانتے ہو۔“

”لیکن یہ تو ریلوے کا مسافر خانہ ہے۔ مسافروں کی سہولت کے لئے.....“

”مسافروں کی سہولت کے لئے ہے، تم جیسے لنگڑوں کے لئے نہیں۔ رات گزارنی ہے تو پانچ روپے نکالو۔ ورنہ ایک سو نو میں پکڑ کر بند کر دوں گا۔“ کانٹیل نے کہا۔

بشارت نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر جب سے پانچ کا نوٹ نکال کر اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ کچھ دیر کانٹیل کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر ایک گرا سانس لیتا ہوا دوبارہ لیٹ گیا اور جلد ہی سو گیا۔

میرے باپ کی زندگی میں پوری ہو گئی تھی لیکن تم نے اس وقت عدالت سے ڈگری حاصل کرنے کی بجائے چھ سات سال مزید انتظار کیا تاکہ مکان پر مکمل قبضہ کر سکو لیکن سیدھے عمر.....“ وہ اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ”تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ باقی رقم واپس کر دو ورنہ..... میں رقم تو وصول کر ہی لوں گا اور تمہارا بیٹا بھی حرام کر دوں گا۔“

”دھمکی دے رہے ہو۔ وہ بھی چوہدری عمر دین کو۔“ چوہدری دہاڑاں ”میں نے تمہارا کوئی پیسہ نہیں دیا۔ مکان قانونی طور پر نظام ہوا ہے۔ میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اگر زیادہ ہی شوق ہے تو جاؤ عدالتیں کھلی ہیں۔ جو چاہو کر لیتا۔“

”قانون اور عدالتیں۔“ بشارت نے چڑ کر کہا۔ ”تم سے اپنا حق وصول کرنے کے لئے میں نہ تو قانون کا سامرا لوں گا اور نہ ہی کسی عدالت کا دروازہ کھٹکاؤں گا۔ میں تم سے بیک نہیں مانگ رہا اپنا حق مانگ رہا ہوں اور میں اپنا حق ضرور وصول کروں گا۔“

”چل اوسے فنا کھا میاں سے۔“ چوہدری نے پیچھے ہوئے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

”نکل جاؤں گا لیکن..... یاد رکھو چوہدری۔ میرا حق تم مہم نہیں کر سکو گے۔“

بشارت نے میز پر مکا مار کر کہا اور مڑ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

وہ ایک بار پھر سڑکوں پر پھرنے لگا۔

وہ کشمیری بازار سے ہوتا ہوا دلی دروازے کی طرف نکل آیا۔ اس کا ذہن بالکل مایوس ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ کیا کرے، کہاں جائے۔ دوپہر کو ایک غلیے سے حلیم اور کچھ کھاکر اس نے پیٹ کی آگ بجھائی۔ پیٹ بھر جانے کے بعد اس کا ذہن کچھ سوچنے کے قتل ہوا۔ چوہدری عمر والا معاملہ تو اس نے فی الحال پس پشت ڈال دیا۔ اس وقت تو اسے کسی کام دھندے کی فکر تھی۔ اس کی جیب میں ساٹھ ستر روپے ہی تھے اور وہ جانتا تھا کہ بت زیادہ کفایت شعاری سے بھی کام لے گا تو یہ رقم دو تین دن سے زیادہ نہیں چل سکے گی۔ وہ کام کی تلاش میں شام تک ٹھوکر بن کھاتا رہا لیکن کہیں بھی کام یا مزدوری نہیں ملی۔

رات بسر کرنے کے لئے وہ ریلوے اسٹیشن کے مسافر خانے میں پہنچ گیا اور ایک

مجھ اس کی آنکھ کھلی تو مسافر خانہ آدمے سے زیادہ غللی ہو چکا تھا۔ کہیں کہیں لوگ ابھی تک سوئے ہوئے تھے۔ قریب ہی بیٹھی مسافر خانے کے فرش پر جھاڑو لگا رہا تھا۔ خاک اڑ کر بشارت پر آ رہی تھی۔ وہ جلدی سے وہاں سے اٹھا اور قتل سے منہ ہاتھ دھو کر اسٹال سے چائے کا ایک کپ پیا اور مسافر خانے سے باہر نکل گیا۔

پورا دن سڑکوں کی خاک چھانٹتے ہوئے گزر گیا۔ اسے کبھی مزدوری وغیرہ بھی نہ ملی۔ وہ جہاں بھی گیا لوگوں نے اس کا تلیہ دیکھ کر اسے دور ہی سے دھکڑا دیا۔ تین چار دن گزر گئے۔ بشارت کام کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا۔ اب اس کے پاس آٹھ دس روپے ہی رہ گئے تھے۔

”شام تک یہ بھی خرچ ہو جائیں گے۔ پھر کیا کروں گا؟“ بشارت نے سوچا۔ وہ حالات سے تنگ آ چکا تھا لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری اور کام کی تلاش جاری رکھی۔ جب شام تک بھی کوئی کام نہ ملا تو وہ نڈھال سا ہو کر فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔

”کیا شرے کا کتا ٹھیک تھا کہ میں شرافت اور دیانتداری سے روٹی کما کر بھی نہیں کھا سکوں گا۔ کیا مجھے شرے کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا پڑے گا۔ پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے لوگوں کی جیبیں کاٹنی پڑیں گی۔ چوری کرنی پڑے گی؟ نہیں..... نہیں..... نہیں..... بھوکا مر جاؤں گا مگر یہ سب کچھ نہیں کروں گا۔“

بشارت کی جیب میں اب پھونٹی کوڑی تک نہیں تھی۔ اب وہ ریلوے اسٹیشن کے مسافر خانے میں بھی نہیں سو سکتا تھا۔ اس کے پاس تو کھانے کے لئے پیسے نہیں تھے پولیس والے کو پانچ روپے مکمل سے دیتا۔ وہ رات اس نے ایک پارک میں گزاری۔ صبح اٹھ کر اس نے قتل سے منہ ہاتھ دھو کر پیٹ بھر کبابی پیا اور ایک مرتبہ پھر قسمت آزمائی کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ دوسرا ہو گئی۔ بھوک اور تھکن سے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ پھر بھی اس نے ہمت نہیں ہاری اور جستجو جاری رکھی۔ آخر کار تھک کر اس پر رحم آیا کہی۔

ایسٹ روڈ پر فٹ پاتھ پر سائبان میں بنے ہوئے چائے کے ایک چھوٹے سے ہوٹل ”دربار مغلیہ“ کے پشتاوری مالک نے اس پر ترس کھا کر اسے دو وقت کی روٹی پر ملازم رکھ لیا اور رات کو سوئے کی جگہ بھی دے دی۔

پندرہ روز گزر گئے۔ اسے چوبیس گھنٹوں میں صرف دو تین گھنٹوں کی چھٹی ملتی اور

ان دو تین گھنٹوں کے دوران وہ نجمہ کو تلاش کرنے کے لئے نکل جا رہا۔ وہ سڑکوں پر آنے جانے والے ہر شخص کو غور سے دیکھتا اور پہچاننے کی کوشش کرتا۔ وہ اس غصے کی شکل ابھی تک نہیں بھولا تھا جو جیلے والے دن نجمہ کو پکڑ کر گھینٹا ہوا لے گیا تھا مگر اسے کہیں بھی ایسا کوئی چہرہ دکھائی نہیں دیا۔

دربار مغلیہ“ ہوٹل میں زیادہ تر مزدور اور نچلے طبقے کے لوگ ہی کھانا کھانے کے لئے آتے تھے یا پھر وہ لوگ چائے وغیرہ پیئے آ جاتے جو آس پاس کے سینماؤں میں فلم دیکھنے کے لئے آتے تھے۔

ایک روز بشارت ایک میز پر جھکا ایک ہاتھ میں خالی کپ اٹھائے دوسرے ہاتھ میں پتلی سی سائی سے میز صاف کر رہا تھا کہ اپنے پیچھے ایک جانی پہچانی سی آواز سنائی دی۔ ”اوئے لڑکے۔ دو چائے لاؤ۔ ایک دم فٹ کلاس۔ ملانی دانی۔“

یہ آواز میں نے کہاں سنی تھی..... کس کی آواز ہے یہ.....؟ بشارت میز صاف کرتے ہوئے سوچ رہا تھا لیکن ذہن میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ آواز اس نے کب اور کہاں سنی تھی لیکن میز صاف کر کے وہ جیسے ہی پٹا دوسری میز پر بیٹھے ہوئے دو آدمیوں میں سے ایک کو دیکھتے ہی اسے جھٹکا سا لگا۔ اور ہاتھ سے کپ چھوٹ کر فرش پر گر کر چکنا چور ہو گیا۔

”شکرا.....!“ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

وہ شکرا تھا۔ اس کے چہرے پر حیرت و مسرت کے طے جلے تاثرات ابھرے اور دوسرے ہی لمحہ وہ اٹھ کر بشارت سے لپٹ گیا۔

وہ میزا جلا کر اڑا۔ ابھی قن اور یہ کیا حال ہو گیا شکرا۔ ”شکرے نے سر تپا اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”شکرے خدا کے لئے یہاں جیل کا تذکرہ مت کرنا۔ اگر سینٹھ کو پتا چل گیا تو وہ مجھے نوکری سے جواب دے دے گا۔“ بشارت نے ملتی لپٹے میں کہا۔

”اسی لئے تو کتا ہوں کہ میزا کتنا مان لو۔ پھر تمہارے دل میں کبھی یہ خوف نہیں آئے گا۔“ شکرا مسکرایا۔

”مجھے گمراہ کرنے کی کوشش مت کرو شکرے۔“ بشارت نے کہا۔

”خیر چھوڑو اس ذکر کو۔ میں جانتا ہوں تم ایک دن خود بخود چل کر میری پاس آؤ گے۔ آہیں تمہیں اپنے استاد سے ملاؤں۔“ شکرے لے کر کہا اور اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے ادیجر عمر فحش سے بولا۔

”استاد۔ یہ ہے اپنا بگڑا بشارت جس کا میں تم سے کئی مرتبہ ذکر کر چکا ہوں۔“ وہ استاد گنگو قتل لاہور کے جیب کتروں کا بے تاج بادشاہ۔ بشارت گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ادیجر عمر ہونے کے باوجود قاتل رشک صحت، چھوٹے ہوئے گال، بھاری جبزے، گھٹی مونچھیں اور اوپر کو چڑھی ہوئی موٹی موٹی سرخ آنکھیں۔ استاد گنگو نے بشارت سے ایک دو باتیں پوچھیں لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور پھر جلدی سے بولا۔

”دو چائے لاؤں؟“

”ہاں۔ ایک دم فمٹ کلاس۔ ملائی والی۔“ شکرے نے بشارت کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

بشارت نے ان کے سامنے چائے کے دو کپ لا کر رکھ دیئے اور دوسرے گاہکوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ بار بار کن آنکھیں سے شکرے اور استاد گنگو کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے دل میں خوف جاگزیں ہو چکا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد جب شکرہ اور استاد گنگو جانے لگے تو کتنی ہی دیر تک کاؤنٹر کے قریب کھڑے سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے۔ بشارت کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ یہ خوف ایک بار پھر سر اٹھانے لگا تھا کہ شکرہ ہوٹل کے مالک کو اس کے بارے میں کچھ بتا تو نہیں رہا لیکن جب ان کے جانے کے ایک گھنٹے بعد بھی ہوٹل کے مالک نے اس سے کوئی استفسار نہیں کیا تو بشارت کو قدرے اطمینان ہوا کہ شکرے نے اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ دن خیریت سے گزر گیا۔

ایک روڈ پر واقع تمام سینماؤں کے آخری شوقین ہو چکے تھے۔ سڑک نوٹی ہو گئی۔ بشارت اپنا کام ختم کر کے جب ایک کونے میں سونے کی تیار کرنے لگا تو ہوٹل کے مالک نے اسے بلا لیا۔ بشارت دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس کے قریب پہنچا۔

”لڑکے۔ تم نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ تم نے خود کو بہت شریف بتایا تھا لیکن میں تمہارے بارے میں سب کچھ جان چکا ہوں۔ تم جیب کترے ہو۔ سزا یافتہ ہو، میں تم

کو نوکری پر نہیں رکھ سکتے۔ یہ لو اپنا حساب اور چمٹی کرو۔ مجھے ایسا آدمی نہیں چاہیے جس سے ہوٹل کی بدنامی ہو۔“ مالک نے چند روپے جیب سے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

”لیکن سیٹھ جی۔ میں نے کبھی کوئی جرم نہیں کیا۔ میں تو بے قصور پکڑا گیا تھا۔ میں نے کسی کی جیب میں کالٹی۔“ بشارت نے اپنی صفائی پیش کی۔

”نہیں بلا۔ ہم نے سب کچھ سن لیا ہے۔ ہم تم کو نہیں رکھے گا۔ اپنا پیسہ لو اور ابھی یہاں سے چلے جاؤ۔“ سیٹھ نے کہا۔

بشارت کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ شکرے اور گنگو نے اس کے خلاف سیٹھ کے کان خوب اچھی طرح بھر دیئے تھے اور اب اپنی صفائی میں مزید کچھ کہنا بیکار ہو گا۔ بشارت اس سائبان دربار مغلیہ ہوٹل سے نکل کر چند ہی گزر دور گیا تھا کہ ایک پولیس والے نے اسے پکڑ لیا۔

”اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو پھر کا دیئے جاؤ گے۔ خاموشی سے میرے ساتھ تھانے چلو۔“ کانسیبل نے اس کی کلائی گرفت میں لے لی۔

”مم..... مگر کیوں۔ میں نے کیا کیا ہے؟“ بشارت ہلکا گیا۔

”یہ تو تھانے پہنچ کر ہی معلوم ہو گا۔ تمہارا نام بشارت ہے اور تم اس ہوٹل میں کام کرتے ہو؟“ کانسیبل نے ہوٹل کی طرف اشارہ کیا۔ پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”ہوٹل کے سامنے والے سینما میں ایک فحش کی جیب کٹ گئی تھی۔ اس لئے تمہیں میرے ساتھ تھانے چلنا ہو گا۔“

”سینما میں کسی کی جیب کٹ گئی تھی تو اس میں میرا کیا قصور؟“ بشارت نے کہا۔

”چل تھانے۔ حرامی.....“ کانسیبل نے اسے دھور دار تھپڑ رسید کر دیا۔ تھانے پہنچ کر ایک ہیڈ کانسیبل نے اس کی تلاش کی اور جب سے پیسے نکال کر اپنی جیب میں ڈال لئے اور پھر بشارت کو گھونٹوں اور ٹوکروں پر رکھ لیا۔

بشارت کو رات بھر برآمدے میں بیٹھانے رکھا۔ اس دوران جو بھی پولیس والا وہاں آتا اس سے ایک دو باتیں پوچھتا اور ایک دو تھپڑ مار کر چلا جاتا۔ صبح ہوئی تو ہیڈ کانسیبل نے اسے دو چار ہاتھ رسید کرنے کے ساتھ دار ونگ دے کر بھگا دیا۔ بشارت نے اپنے

بچیوں کی واپسی کا مطالبہ کیا تو اسے دو تھپڑ اور کھلے پڑے تھے۔

وہ بڑھال سامڑگوں پر مارا مارا پھرتا رہا۔ اسے شدت سے بھوک لگ رہی تھی لیکن اس کی جیب خالی تھی۔ اس کی پونجی پر قانون کے محافظ لبروں نے قبضہ کر لیا تھا۔ وہ ایک بار پھر کلام کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا لیکن وہ جہاں بھی جاتا اس کے جیل جانے کی داستان اس سے پہلے وہیں پہنچ جاتی۔ بشارت حیران تھا کہ سب لوگوں کو کیسے پتہ چل گیا کہ وہ سزا یافتہ ہے۔

لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ صبح جب وہ قہانے سے نکلا تھا تو ایک اینٹی چرو سائے کی طرح اس کے پیچھے لگا گیا تھا۔ یہ اینٹی استاد گنگو کا ایک شاگرد تھا۔ بشارت جہاں بھی جاتا وہ اس کے پیچھے ہی پہنچ جاتا اور مالک کو بشارت کے بارے میں بتا کر باہر نکل جاتا۔

آٹھ دس روز گزر گئے۔ اس دوران بشارت کو دو تین مرتبہ ہی مزدوری مل سکی تھی۔ جس سے ملنے والے پیسے اس نے نہایت کفایت شعاری سے خرچ کئے تھے لیکن اب اس کے پاس پھونی کوڑی بھی نہیں تھی۔

آج دوسرے دن کا فائدہ تھا۔ دو دن سے ایک کھیل بھی اس کے منہ میں نہیں گئی تھی۔ جب بھوک زیادہ ستاتی تو سڑک کے کنارے لگے ہوئے کسی تل سے پانی لی لیتا۔ خالی پیٹ پانی پی کر اس کی طبیعت بھی خراب ہونے لگی تھی۔

تیسرے دن بھوک اس کے لئے ناقابل برداشت ہو گئی تو وہ داتا صاحب کے مزار پر پہنچ گیا اور لائن میں کھڑے ہو کر ایک روٹی اور اس پر دال لے کر کھانے لگا لیکن اسے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگ۔ پھر اس کے قدم خود بخود کٹشی چوک کی طرف اٹھنے لگے۔

وہ کٹشی چوک پر چرے والی دکان کے سامنے کھڑا دیران دیران سی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ ایک نوجوان اس کے قریب آکر سرگوشیانہ لمبے میں بولا۔

”تمہیں شاید کسی کی تلاش ہے؟“

”ہاں، مجھے استاد گنگو کے زیرے کی تلاش ہے۔“

”میرے ساتھ آؤ۔“ نوجوان نے مسکرا کر کہا اور ایک طرف چل دیا۔

تقریباً پچاس گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک گندی سی گلی میں داخل ہو گئے۔ گلی زیادہ طویل نہیں تھی۔ اس کے اختتام پر کھڑی کا ایک ٹوٹا پھوٹا سا چھانک تھا۔ بشارت اس نوجوان کے پیچھے چلتا ہوا چھانک میں داخل ہو گیا۔

یہ ایک بڑا سا احاطہ تھا جس میں ایک طرف چند تانگے کھڑے تھے اور چار پانچ گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ احاطے میں ہر طرف گندی اور لید کی ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی۔ وہ نوجوان بشارت کو اشارہ کرتا ہوا احاطے میں ایک طرف بنے ہوئے کمرے میں داخل ہو گیا۔ بشارت بھی اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہوا۔

کمرے کے فرش پر درزی بھیجی ہوئی تھی۔ ایک طرف تین چار لڑکے بیٹھے کہیں ہانک رہے تھے اور دوسری طرف دیوار سے ٹھک لگائے بیٹھے استاد گنگو اور شکرابائیں کر رہے تھے۔ شکرے نے بشارت کو دیکھا تو اپنی جگہ سے اٹھ کر اس سے پٹ گیا۔

”اوہ میزا شہزادہ آگیا۔ میں نے کہا تھا کہ ایک دن تم خود آؤ گے۔“ شکرے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

”شکرے۔“ بشارت کے منہ سے کمزور سی آواز نکلی۔ ”میں نے تین دن سے کچھ نہیں کھلیا۔ یار۔“

”تو دیکھ لیا اپنی نیکی اور شرافت کا انجام۔“ شکرے کے لمبے میں بے پناہ طنز تھا۔ ”تمہاری دیانت اور ضمیر تمہیں تین دن سے بھوک سے تڑپا رہا ہے۔ یا ذہیری شرافت نے کوئی مدد کیوں نہیں کی۔“

”چپ ہو جاؤ شکرے۔“ بشارت نے کمزور سی آواز میں جواب دیا۔ ”میں جان گیا ہوں کہ اس دنیا میں پیٹ بھرے کے لئے روٹی کس طرح حاصل کی جاتی ہے۔ ضمیر کی باتیں نہ کرو۔ ضمیر تو واقعی ایک بے مقصد ہوجہ تھا جسے میں اپنے سینے میں لئے پھرتا رہا۔“

اس دوران استاد گنگو نے ایک لڑکے کو بھیج کر طواری کی دکان سے آدھا لیٹر گرم گرم دودھ منگوا لیا تھا۔ دودھ پی کر کچھ سارا ہوا لیکن تین دن سے بھڑکنے والی بھوک کی آگ اتنے سے دودھ سے تو نہیں بجھ سکتی تھی۔ بشارت سوالیہ نگاہوں سے شکرے کی طرف دیکھنے لگا۔

شکرہ اس کی نگاہوں کا مطلب سمجھتے ہوئے بولا۔ ”پہلے دودھ تو اس لئے منگوا لیا تھا

استاد گنگو کا اپنے گروہ پر مکمل ہولند تھا اس گروہ میں تو عمر لاکے بھی تھے اور جوان آدمی بھی۔ وہ سب رات گیارہ بجے کے لگ بھگ اڑے پر جمع ہوتے اور دن بھر کی کارکردگی کا حسب دیتے۔ استاد گنگو کے سامنے لوگوں کا ڈھیر لگ جاتا کی لڑکے ایسے بھی تھے جو تھوڑی بہت رقم مارنے کی کوشش کرتے تھے لیکن استاد گنگو بھی قیامت کی نظر رکھتا تھا ایسے لڑکوں کو فوراً ہی ناک ٹائلا اور انہیں اٹاٹا دیتا لیکن وہ اپنے لڑکوں کا خیال بھی بہت رکھتا تھا کسی پر کوئی افتاد پڑتی تو فوراً ہی مدد کو پہنچتا۔

استاد گنگو کے بعد شکرے کو اس گروہ میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ شکرے نے بشارت کو اپنے ساتھ ہی رکھا تھا جیل میں اس نے بشارت کو بہت کچھ سکھا دیا تھا اور اب عملی زندگی میں بھی اس کی مدد کر رہا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بشارت اپنے اس فن میں ناک ہوتا چلا گیا۔

بشارت کو پہلی مرتبہ پتہ چلا کہ جرائم پیشہ لوگوں کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں جن پر وہ سختی سے کاربند رہتے ہیں۔ شرمین جیب تراشوں کے کئی گروہ سرگرم تھے۔ ہر گروہ نے علاقے بانٹ رکھے تھے۔ ایک گروہ کا آدمی دوسرے گروہ کے علاقے میں واردات نہیں کرتا تھا۔ اگر وہ کسی شکار کے تعاقب میں دوسرے علاقے میں نکل جاتا تو اس گروہ کے کسی آدمی کو شکار کو نشانہ بن کر کے واپس آ جاتا اور بعد میں اسے اپنا کمیشن مل جاتا۔

کئی مہینے گزر گئے۔ اس دوران بشارت کی زندگی میں کئی موڑ آئے۔ وہ کئی مرتبہ پکڑا گیا لیکن جیل جانے کی نوبت نہیں آئی۔ استاد گنگو کچھ اتاری مضبوط اور پائرا تھا کہ اس گروہ کا کوئی ناک بجا بھی پکڑا جاتا چند گھنٹوں بعد ہی اسے پولیس سے چھٹکارا مل جاتا۔

پہلی مرتبہ جب بشارت ایک ناکروہ جرم میں پکڑا گیا تھا تو اسے اپنی زندگی کے ستون لرزے ہوئے محسوس ہوئے تھے لیکن گنگو کے گروہ میں شامل ہونے کے بعد اس کے دل سے ہر قسم کا خوف نکل گیا تھا۔ اسے نہ تو کبھی ضمیر نے کچوکے لگائے تھے اور نہ ہی شرافت نے کبھی اس کا دامن چھوٹا تھا۔

اس دوران بشارت ایک لمحہ کے لئے بھی نجرہ کی یاد سے غافل نہیں ہوا تھا۔ اس نے نجرہ کی تلاش و جستجو جاری رکھی لیکن اسے اپنی بہن کا سراغ کسی طرح سے بھی نہیں مل رہا تھا۔ کبھی کبھی تو رات کی تھانویں میں بہن کی یاد بری طرح تڑپا دیتی۔ اس کی

کہ تم تین دن سے بھوکے ہو، اور ایک دم کھانا کھا کر کس تہاڑی طبیعت نہ بگڑ جائے۔“ استاد گنگو نے دارا نامی اسی لڑکے کو قریب بلا کر کچھ کھلہ وہ سرہلاتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔

دارا کی واپسی آدھے گھنٹے سے پہلے نہیں ہوئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں پکڑی ہوئی بڑی سی رٹے بشارت کے سامنے رکھ دی۔ ایک پلیٹ میں بھنا ہوا گوشت، ایک میں مکے اور شامی کباب اور توری روٹیاں تھیں۔ بشارت کمرے میں موجود افراد کا خیال بغیر کھانے پر نوٹ پڑا اور چند منٹ بعد ہی ساری پلیٹیں صاف ہو چکی تھیں۔

استاد گنگو اور شکرہ مستی خیز انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کھانے کے بعد بشارت نے پانی کا گلاس پیا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ حواس بحال ہونے کے بعد اس نے پہلی مرتبہ کمرے میں موجود افراد کا جائزہ لیا۔

”اوڑھ کھاؤ؟“ شکرے نے پوچھا۔  
”نہیں۔“ بشارت نے مختصر سا جواب دیا اور دیوار سے ٹک لگا کر ٹانگیں پھیلا لیں۔  
پینٹ بھر جانے کے بعد اس پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ آنکھیں خوب بند ہو رہی تھیں۔

”تمہیں نیند آ رہی ہے۔ آرام سے لیٹ کر سو جاؤ۔“ استاد گنگو نے اس سے کہنے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔  
بشارت نے نیم دا آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر درمی پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد ہی وہ گہری نیند سو چکا تھا۔

☆=====☆

بڑی عجیب زندگی تھی یہ بھی۔  
جرائم پیشہ لوگوں کے بیچ میں رہتے ہوئے بشارت بھی جرائم پیشہ بن گیا۔ اس شرافت کی زندگی گزارنے کی کوشش کر کے دیکھ لیا تھا۔ اسے ایک وقت کی روٹی نمبر تھی۔ کوئی اسے قریب نہیں چھٹکے دیتا تھا لیکن اب اس نے شرافت کا یہ لہو اتار بیٹھا۔ اب وہ بشارت میں بشاری تھا۔ جیب کھرا بشاری..... اسے کسی کی جیب کاٹنے ہو کوئی افسوس نہیں ہوتا تھا۔

اس روز بشارت کشمیری بازار سے ہوتا ہوا شاہ عالمی کی طرف نکل آیا۔ وہ اس وقت اسٹون واش جینز اور نیوی بلو کمرٹی شہرٹ پہنے ہوئے تھے بیروں میں سفید شوز تھے اور بال بھی سلپتے سے کئے اور سیٹ کئے ہوئے تھے۔ اسے دیکھ کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ جیب کترا ہے۔ اس وقت وہ کسی شکار کے پیچھے بھی نہیں تھا کیونکہ یہ علاقہ اس کا نہیں تھا۔ وہ تو محض گھومتا ہوا اس طرف آگیا تھا۔ اس نے کشمیری بازار سے اپنے اور شکرے کے لئے سوٹ کے کپڑے اور اپنے ذاتی استعمال کے لئے چند ضرورت کی چیزیں خریدی تھیں۔ شاہجیک بیک اس کے ہاتھ میں تھا۔

شاہ عالمی میں ہول سیل مارکیٹ کے سامنے چلتا ہوا وہ ایک جگہ رک گیا۔ سڑک کے دوسری طرف ممتاز محل ہوٹل سے ذرا ہٹ کر وہ بلڈنگ تھی جس کی پہلی منزل پر چوہدری عمر کا دفتر تھا۔ وہ چوہدری کو بھولائیں قتلہ وہ گنگو کے گردہ کی سرگرمیوں میں کچھ اس طرح الجھا تھا کہ اس طرف دھیان دینے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا اور اس وقت اتفاق سے اس طرف نکل آیا تھا اور رک کر اس بلڈنگ کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ سڑک پار کر کے سیٹھ عمر کے دفتر میں کس جائے اور اس سے حساب برابر کرے لیکن پھر کچھ سوچ کر یہ خیال ذہن سے نکال دیا۔ اس نے یہ بہر حال طے کر لیا تھا کہ اب بہت جلد سیٹھ عمر سے ملاقات کرے گا۔

اس وقت دن کے ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ وہ اپنا راستہ ٹاپنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ سڑک کے دوسری طرف شکرے کو دیکھ کر چونک گیا۔ شکرہ ایک آدمی کا تعاقب کر رہا تھا۔ بشارت کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ شکار کا پیچھا کر رہا ہے۔ حالانکہ یہ اس کا علاقہ نہیں تھا مگر شکرے نے تو اپنے وعدے کے سارے اصول بھلا رکھے تھے۔

گھر سے کھڑے سفاری سوٹ میں بلوس وہ آدمی شکرے سے تقریباً دس گز آگے تھا اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا چرمی بیک تھا اور شکرے کی نظریں اس بیک پر لگی ہوئی تھیں۔ صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے بشارت کو ایک بار پھر چونک جانا پڑا۔ شکرے کے پیچھے بھی دو آدمی آ رہے تھے۔ ان میں ایک درمیانے قد کا تھا اور دوسرا قدرے دراز قامت۔ ایک نے شلوار سوٹ پہن رکھا تھا اور دوسرے نے پینٹ شہرٹ۔

بشارت کی چھٹی حس اسے گزبوا کا احساس دلاری تھی۔ اس کے ذہن میں فوراً ہی

آکھیں نم ہو جاتیں اور وہ ٹھٹھے سانس بھر کر رہ جاتا۔  
نجمہ سے جدا ہونے دس سال ہو چکے تھے۔ بشارت اب اکیس یا بیس سال کا گھرو جوان تھا۔ جن لوگوں نے اسے بچپن میں دیکھا تھا وہ اسے نہیں پہچان پاتے تھے۔ نجمہ تو اس سے ڈیڑھ سال بڑی تھی۔ وہ بھی بہت بدل گئی ہوگی۔ بشارت کے ذہن میں تو اس کا وہی چہرہ تھا جو اس نے دس سال پہلے دیکھا تھا۔ ہو سکتا ہے نجمہ کبھی اس کے قریب سے گزری بھی ہو تو اسے نہ پہچان سکا ہو۔ مگر بشارت نے اس کی تلاش جاری رکھی۔  
ایک روز استاد گنگو اپنے گردہ کو بے سارا چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ استاد گنگو کے مرنے کے بعد شکرے نے گردہ کی قیادت منبھال لی اور بشارت کو اپنا نائب بنالیا۔

استاد گنگو اور شکرے میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ استاد گنگو نے دنیا دیکھی تھی۔ گھٹ گھٹ کا پانی پیا تھا۔ وہ زندگی کے خبیث و فراز سے واقف تھا۔ کوئی بڑا کام کرنے سے پہلے وہ ٹھٹھے دماغ سے سوچا۔ اپنے گردہ کے آدمیوں پر اگرچہ وہ بعض اوقات سخت بھی کرتا تھا لیکن یہ سختی ملا وجہ نہیں ہوتی تھی۔ اسے گردہ پر پورا کنٹرول حاصل تھا۔ استاد گنگو کی موت کے بعد اگرچہ شکرے نے اس کی جگہ منبھال لی تھی لیکن بشارت دیکھ رہا تھا کہ شکرے میں وہ صلاحیت نہیں تھی۔ اس کی رگوں میں الجھتا ہوا خور تھا۔ دماغ میں بھی گرمی بھری ہوئی تھی۔ استاد گنگو کے بتائے ہوئے تمام اصولوں کو پاؤ پست ڈال کر اپنے آدمیوں پر بلا وجہ سختی کرنے لگا۔ دوسرے علاقوں میں جا کر وارداتیں کرنے لگا جس کی وجہ سے آئے دن دوسرے گردہوں کے آدمیوں سے لڑائی جھگڑا ہونے لگے۔

بشارت یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ اس طرح گردہ کا شیرازہ نہ بکھ جائے اس نے کئی بار شکرے کو سمجھانے کی کوشش کی مگر شکرہ اس کی باتوں پر دھیان دینے کے بجائے اتلا اس پر ناراض ہونے لگا۔

شکرے کی ان بے جا سختیوں اور بے اصولیوں کی وجہ سے تین چار لڑکے اس کٹ کر دوسرے گردہوں میں چلے گئے۔ اس پر بھی اس نے ٹھٹھے دل سے سوچنے زحمت گوارا نہ کی۔



خیال ابھرا کہ شکرے کو آگے بڑھنے سے روک دیا جائے۔ یہ سوچ کر ہی وہ سڑک پار کرنے کے لئے فٹ پاتھ سے اترا لیکن دائیں طرف سے آنے والی ویگن کی وجہ سے اسے رک جانا پڑا اور جب ویگن اس کے سامنے سے گزر گئی تو وقت بھی گزر چکا تھا۔ شکرہ بڑی تیزی سے اس آدمی کے قریب پہنچا اور اس کے ہاتھ سے سیاہ رنگ کا چری بیگ بچھٹ لیا لیکن اس سے پہلے کہ شکرہ وہاں سے بھاگ سکتا پیچھے آنے والے دونوں آدمی جھپٹے ہوئے اس کی طرف دوڑے۔

بشارت نے بھی اپنی جگہ سے دوڑ لگا دی۔ شکرہ بلند عمارتوں کے درمیان ایک تنگ سی گلی کی طرف دوڑ رہا تھا۔ پیچھے دوڑنے والے دونوں آدمیوں میں سے ایک نے پتھول نکل کر شکرے پر گولی چلا دی۔ شکرہ چیخا ہوا گرا۔ چری بیگ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس شخص نے دوبارہ فائر کرنے کے لئے ہاتھ اوپر اٹھایا لیکن اسے گولی چلانے کا موقع نہیں مل سکا۔ بشارت ہوا میں اڑتا ہوا اس کے اوپر جا رہا اور اسے ساتھ لیتا ہوا پیچھے گرا۔ اس سے پہلے کہ نیچے گرا ہوا آدمی سنبھل سکتا بشارت نے اس کا پتھول والا ہاتھ گرفت میں لے لیا اور شکرے کی طرف دیکھتے ہوئے چیخا۔

”بھاگ..... شکرے بھاگ.....“

شکرہ اپنی جگہ سے اٹھا تو تھا لیکن دوبارہ گر گیا۔ اس کی ٹانگ میں گھٹنے سے ذرا اوپر گولی لگی تھی جس سے خون بہہ رہا تھا۔ بشارت اپنے نیچے وجہ ہوئے آدمی کے ہاتھ سے پتھول چھیننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کھٹکھٹ میں ٹرانسگرید بگمیل گولی سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی ایک کار کے ٹائز میں لگی اور ٹائز ایک دھماکے سے پھٹ گیا۔ بشارت اس شخص کا پتھول والا ہاتھ مروڑ رہا تھا کہ اس کے سر پر زوردار ٹھوکر لگی۔ یہ ٹھوکر دوسرے آدمی نے ماری تھی۔ بشارت کا دماغ جھجھکتا تھا اس نے ٹھوکر دیکھ کر دوسری ٹھوکر مارنے کی تیاری کر رہا تھا۔ بشارت نے تیزی سے اس پر سناڑھنے سے ایک طرف ہٹا لیا۔ یہ ٹھوکر اس شخص کے سر پر لگی جو بشارت کے نیچے دبا ہوا تھا۔

وہ شخص ہلکا اٹھا۔ پتھول پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ بشارت نے اس کے ہاتھ سے پتھول چھینا اور اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ دوسرے شخص کے ہاتھ میں بھی پتھول تھا لیکن شاید وہ گولی چلائے بغیر بشارت کو زیر کر لیتا چاہتا تھا اور اب اس نے بشارت کو اٹھتے

دیکھا تو پتھول تان لیا لیکن بشارت بھی اب منتا نہیں تھا۔ نیچے گرے ہوئے شخص کا پتھول اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر کچے دھندے دوسرے ٹرانسگرید دبا دیا۔ ایک گولی سامنے کھڑے ہوئے شخص کے سینے میں لگی اور دوسری اس کی ٹھوڑی کے نیچے پیوست ہو گئی۔ وہ شخص اپنے سامنے کی قریب ہی ڈھیر ہو گیا۔ پتھول اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔

بشارت نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پتھول کو دیکھ کر خطرناک ہتھیار اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے ہاتھ میں پکڑا تھا۔ اسے تو یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ اس نے گولی کیسے چلا دی۔

فائرنگ سے بازار میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ لوگ ادھر ادھر بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ مگر کھر سفاری سوٹ والا وہ شخص جس کے ہاتھ سے شکرے نے چری بیگ چھینا تھا، وہ بھی چیخا ہوا ایک طرف بھاگ رہا تھا۔ بشارت اٹھ کر دوڑتا ہوا شکرے کے قریب پہنچ گیا جو اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بشارت نے اس کی ٹانگ سے خون بہتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ شکرے کی سفید جینٹ خون میں تر ہو رہی تھی۔ بشارت نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے چیخا۔

”بھاگو شکرے.....“

”ٹانگ میں گولی لگی ہے بشارت۔ مجھ تو نکل چلا۔“ شکرے نے کراہتے ہوئے جواب دیا اور یہ بیگ اس میں لمبی رقم ہے۔ میں تمہارے بارے میں زبان نہیں کھولوں گا۔ نکل جاؤ میرے پاؤں وقت ضائع مت کرو۔“

”میں میرے دوست۔ میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔“ بشارت نے کہا اور اس کی بظوں میں ہاتھ دے کر اسے اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔

”میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکوں گا۔“ شکرہ کراہا۔ ”معدنہ کر اور پولیس کے آنے سے پہلے یہاں سے نکل.....“

شکرے کا ہاتھ پورا نہ ہو سکا۔ فضا پر درپے فائرنگ مچی آواز سے گونج اٹھی تھی۔ شکرے کے جسم کو جھٹکنے سے لگ رہے تھے۔ تین فائر ہوئے تھے اور چلائی جانے والی تینوں گولیاں شکرے کے جسم میں پیوست ہو گئی تھیں۔

کو آتے ہوئے دیکھا تو دوڑنے کی بجائے تیز تیز قدموں سے چلے لگتا تاکہ دوڑنے سے کوئی اس پر شبہ نہ کر سکے۔

وہ ان پر چبچاہٹیں میں پکراتا ہوا دوسری طرف ایک کشادہ سڑک پر نکل آیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ یہاں صورت حال معمول پر تھی۔ اب سے یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ وہ کمال پر ہے۔ یہ سڑک دائیں طرف تقریباً دو سو گز آگے رنگ محل پر اسی سڑک سے جا ملتی تھی جس پر ذرا آگے جا کر ممتاز محل ہوئی کی طرف سارا ہنگامہ ہوا جبکہ بائیں طرف یہی سڑک طویل فاصلہ طے کرتی ہوئی شاہی قلعہ، بادشاہی مسجد اور شاہی محلے سے ہوتی ہوئی مکمل گیٹ کی طرف چلی گئی تھی۔

بشارت بائیں طرف مڑ کر تیز قدم اٹھانے لگا۔ وہ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ اسے کسی خلی رکش یا ٹیکسی وغیرہ کی بھی تلاش تھی تاکہ جلد سے جلد اس علاقے سے نکل کر کسی محفوظ جگہ پر پہنچ جائے۔

ابھی اس نے چند ہی گز کا فاصلہ طے کیا تھا کہ پیچھے سے آنے والی ایک کار بریکوں کی تیز چرچاہٹ کی آواز کے ساتھ اس کے قریب رکی۔ بشارت اچھل پڑا۔ اس نے تیزی سے مڑ کر دیکھ کر سرخ رنگ کی شیرازہ کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک جوان اور حسین عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ نیچرز سیٹ پر جھکی اس طرف کا دروازہ کھول رہی تھی۔ اس کا سیدھا ہاتھ ایئر کنڈیشننگ وینیل پر ہی تھا کار میں اس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ بشارت نے اس کی طرف دیکھا اور جیسے ہی آگے بڑھنے لگا اس عورت کی آواز سن کر چونک گیا۔

”آؤں گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔“

”جی..... جی..... میں.....“ بشارت کی آواز حلق میں انک رہی تھی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھ کر اس کا خیال تھا کہ وہ عورت کسی اور سے بات کر رہی تھی مگر کار کے قریب اور کوئی نہیں تھا۔

”ہاں تم۔“ عورت نے سسکراتے ہوئے کلمہ اس مرتبہ آواز پر کوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔ ”جلدی کرد۔ پولیس اس پورے علاقے کو گھیرے میں لے رہی ہے۔ تمہارے لئے بچ کر ٹھکانا مشکل ہو جائے گا۔“

بشارت کا دل اچھل کر حلق میں آگیا اس عورت نے شاید اسے وہاں دیکھا تھا اور

بشارت نے سامنے دیکھ لیا۔ وہ آدمی جس نے سب سے پہلے شرے کی ٹانگ پر گولی چلائی تھی اور جس سے بشارت نے پتہ چھینا تھا، اپنے مردہ ساتھی کا پتہ لے کر ہٹا۔ وہ تین گولیاں چلا چکا تھا جو شرے کو لگی تھیں۔ بشارت نے اسے چوتھی گولی چلانے کا موقع نہیں دیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے شرے کو سنبھالے رکھا اور پتہ لے دیا ہاتھ اٹھا کر ٹرانگٹر دھاتا چلا گیا اس کے پتہ لے تین گولیاں لٹکیں اور تینوں کی تینوں اس شخص کے سینے میں بیوست ہو گئیں۔ وہ چپتا ہوا ڈھیر ہو گیا۔

بشارت نے شرے کو آہستگی سے زمین پر لٹا دیا۔ وہ ختم ہو چکا تھا۔ وہ شرے کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ یہاں رک کر یا شرے کو اٹھا کر لے جانے کی کوشش کرنا خودکشی کے مترادف تھا۔ اس نے شرے کے ہاتھ سے سیاہ رنگ کا وہ چری بیک لے لیا جس کے لئے اس نے اپنی جان دے دی تھی۔

ٹھیک اسی لمحہ پولیس سٹیشن کی آواز سن کر بشارت چونک گیا۔ اس نے گردن اٹھا کر ادھر ادھر دیکھ کر قریب وجوہات میں کوئی نہیں تھا۔ سب لوگ جان کے خوف سے بھاگ گئے تھے۔ سڑک کے دوسری طرف دکانوں کے سامنے کچھ لوگ جمع تھے اور اسی طرف دیکھ رہے تھے۔

سٹیشن کی آواز قریب آتی جا رہی تھی۔ بشارت ایک ہاتھ میں پتہ لے کر دوسرے ہاتھ میں چری بیک سنبھالے عمارتوں کے درمیان اس ٹنگ سی گلی میں گھس گیا اور اندھا دھند بھاگنے لگا۔ اس نے پتہ لے کر ایک جگہ ٹلی میں پھینک دیا اور ایک اور ٹنگ سی گلی میں مڑ گیا۔

رات کا وقت ہوتا تو شاید وہ تاریکی میں پولیس کو چکر دے کر ان کے قریب سے ہی نکل جاتا لیکن یہ دن کا وقت تھا۔ چچ و خم کھاتی ہوئی گلیاں اس کے لئے اجنبی تھیں۔ یہ بھی ڈر تھا کہ وہ ان گلیوں میں پکراتا ہوا دوبارہ اس جگہ نہ پہنچ جائے یا کسی موڑ پر پولیس سے سامنا نہ ہو جائے۔

وہ گلیوں میں دوڑتا رہا۔ ان گلیوں میں بعض لوگوں نے اسے دیکھا بھی تھا لیکن اس پر توجہ اس لئے نہیں دی کہ یہاں تک فائنل کی آواز نہیں پہنچی تھی اور انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ممتاز محل ہوئی کی طرف کوئی ہنگامہ ہو چکا ہے۔ دیے بھی بشارت کسی

پچان لیا تھا لیکن وہ اسے پولیس سے کیوں پہچانا چاہتی تھی۔ اس کے پاس سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ جلد سے جلد اس علاقے سے لگتا پہچانا تھا اور یہ عورت اس کی مدد کر رہی تھی۔ اس نے ہینڈل میں ہاتھ رکھ کر دروازہ کھول لیا اور پیئرز سیٹ پر بیٹھ گیا۔ دروازہ بند کرتے ہی کار حرکت میں آگئی۔ بشارت نے چری بیگ اپنی گود میں رکھ لیا اور اس عورت کی طرف دیکھنے لگا۔ کار ڈرائیو کرتے ہوئے وہ عورت بار بار عقبی منظر پیش کرنے والے آئینے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے صرف ایک مرتبہ بشارت کی طرف دیکھا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ بشارت کا خیال تھا کہ وہ کچھ کے کی لیکن اس کے لب خاموش ہی رہے۔

اور پھر پولیس سٹیشن کی آواز سن کر بشارت کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا پولیس کی گاڑی رنگ مائل کی طرف سے اس سڑک پر مڑی تھی اور بڑی تیزی سے آگے آ رہی تھی۔ بشارت کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ اس نے ڈرائیونگ سیٹ کی طرف دیکھا۔ اس عورت کے چہرے پر بھی ایک لمحہ کو گھبراہٹ نمودار ہوئی تھی پھر اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پایا اور بشارت کی طرف دیکھنے بغیر بولی۔

”گھبراؤ نہیں۔ پولیس کو ایک ایسے قاتل کی تلاش ہے جو پیدل ہی بھاگا ہے۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ چری بیگ کے علاوہ بیٹول بھی ضرور ہونا چاہئے۔ ہمارے پاس بیٹول نہیں ہے اور گود میں رکھا ہوا یہ چری بیگ بیروں کے قریب ڈال دو اور اگر نیچے بنیان پس رکھی ہو تو یہ فی شرٹ اتار دو۔ قاتل کی شناخت میں گمراہی نیلے کی رنگ کی فی شرٹ بھی ہو سکتی ہے۔ جلدی کرو۔ پولیس کی گاڑی قریب پہنچ رہی ہے۔“

بشارت نے چری بیگ بیروں کے قریب ڈال دیا اور قدرے آگے جھک کر فی شرٹ اتارنے لگا۔ اس نے فی شرٹ بھی بیروں کے قریب ڈال دی اس نے نیم پر بنیان پس رکھی تھی۔ اب وہ فوری طور پر اس حیثیت سے نظروں میں نہیں آسکتا تھا جس حیثیت سے پولیس کو اس کی تلاش تھی۔

”بجلی سیٹ پر شاہنگ بیکر پڑے ہوئے ہیں وہ اٹھا کر فی شرٹ اور چری بیگ پر رکھ دو۔“ عورت نے دوبارہ کہا۔

بشارت مڑ کر بجلی طرف جھک گیا۔ بجلی سیٹ پر چار شاہنگ بیکر پڑے ہوئے تھے

جن میں مختلف دکھانوں سے خریدی ہوئی مختلف چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ اس نے تین بیگ اٹھا کر اپنے بیروں کے قریب اس طرح رکھ لئے کہ اس کی فی شرٹ اور چری بیگ ان کے نیچے چھپ گئے۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھا تھا کہ اس عورت کے منہ سے گمراہ سانس نکل گیا اور وہ مسکراتی ہوئی نظروں سے بشارت کی طرف دیکھنے لگی۔

”خفہ مثل گیلہ اب پریشانی کی کوئی بات نہیں۔“

سٹیشن کی آواز اب کسی قدر دھیمی ہو گئی تھی۔ بشارت نے مڑ کر دیکھا۔ پولیس کی گاڑی ان سے تقریباً پچاس گز پیچھے بائیں طرف ایک کشادہ گلی میں مڑ رہی تھی۔ بشارت کے منہ سے بھی گمراہ سانس نکل گیا۔ عورت کی وہ بات درست ثابت ہوئی تھی جو اس نے بشارت کو بٹھانے کے لئے کار روکے ہوئے کسی تھی۔ پولیس اس طرف سے ان گلیوں کو گمراہی میں لے رہی تھی جن سے نکل کر وہ اس سڑک پر آیا تھا۔

”تم کون ہو؟“ بشارت نے سیدھے ہو کر اس عورت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم جان بچی ہو میں قاتل ہوں اور پولیس میرے پیچھے گئی ہوئی ہے۔ اس کے باوجود تم نے یہ رسک لیا۔ مجھے اپنی گاڑی میں بٹھالیا۔“

”خفہ ابھی ملا نہیں ہے۔“ اس عورت نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”ہو سکتا ہے پولیس نے وائریس پر آپس کے تمام قاتلوں کو بھی اطلاع دے دی ہو۔ آگے ایک پولیس چوکی ہے۔ ممکن ہے اس چوکی کا عملہ الٹ ہو چکا ہو اور انہوں نے کسی قسم کی چیکنگ بھی شروع کر دی ہو۔ تمہاری بنیان پر خون کا یہ پلکا سادہ انہیں کسی شبہ میں مبتلا کر سکتا ہے۔“

بشارت چونک گیا۔ اس نے گردن جھکا کر بنیان پر نظر ڈالی۔ اس نے جب شکرے کو سارا دے کر اٹھا رکھا تھا تو اس وقت شکرے کو گولیاں گئی تھیں اور اس کے خون کے چھینٹے بشارت کی فی شرٹ پر بھی گرے تھے۔ فی شرٹ نیوی بلو رنگ کی تھی۔ خون کی سرخی اس گمراہ رنگ میں چھپ گئی تھی لیکن وہ خون کی فی شرٹ میں جذب ہو کر نیچے بنیان پر دھبہ ڈال گیا تھا۔ جو اگرچہ زیادہ گمراہ نہیں تھا لیکن پولیس والوں کو شبہ میں مبتلا کر سکتا تھا۔

”تمہارے بیروں کے پاس پڑے ہوئے نیلے شاہنگ بیگ میں سرخ رنگ کی ایک فی

شرٹ بھی موجود ہے۔ وہ نکال کر پہن لو۔ اس نے نہ صرف بنیان پر لگا خون کا دھبہ چھپ جانے کا بلکہ تمہارا طبلہ بھی بڑی حد تک بدل جائے گا۔

اس مرتبہ بھی اس عورت نے بات کرتے ہوئے اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔  
بشارت کے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ یہ عورت اسے ہر صورت میں پولیس سے بچانا چاہتی تھی۔ وہ عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔  
”وقت ضائع مت کرو۔ پولیس چوکی اب زیادہ دور نہیں ہے۔“ اس عورت نے کہل۔

بشارت آگے جھک گیا اور نیلے رنگ کے شاپنگ بیگ پر لگی ہوئی گرہ کھولنے لگا۔ اس شاپنگ بیگ میں ریڈی میڈ کپڑے بھرے ہوئے تھے۔ جینز اور مختلف رنگوں کی تین چار شرٹس۔ سرخ رنگ کی ٹی شرٹ سب سے نیچے تھی جسے اس نے کھینچ لیا اور نیچے جھکے ہی جھکے پہن کر سیدھا ہو گیا۔ یہ ٹی شرٹ بنیان کی طرح بغیر آستین کی تھی لیکن اس کی سفید بنیان بہر حال اس کے نیچے چھپ گئی تھی۔

اس عورت کا خیال درست نکلا تھا۔ وائزلیس کے ذریعے شرکے تمام تھانوں کو اس واردات اور مفروضہ قاتل کے بارے میں اطلاع دے دی گئی تھی۔ اس سڑک پر تقریباً نصف میل آگے پولیس چوکی تھی۔ چوکی کے سامنے سڑک بلاک کر دی گئی تھی اور چار پولیس اہلکار گاڑیاں اور رکشے وغیرہ روک کر انہیں چیک کر رہے تھے۔

ان سے آگے دو کاربن اور تین رکشے رکے ہوئے تھے۔ پولیس والے انہیں چیک کر کے باری باری آگے جانے کی اجازت دے رہے تھے۔ ایک نوجوان اسے ایس آئی ان کی کار کی طرف بڑھا تو بشارت کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اسے ایس آئی کے ہاتھ میں رہو اور تھوہہ وہ کار کے قریب آکر بشارت کی طرف دیکھنے لگا۔

”کیا بات ہے آفیسر؟“ عورت نے اسے فوراً اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ”آج یہ چیکنگ کس سلسلے میں ہو رہی ہے؟“

”ایک بدحاشیہ رنگ عمل کے قریب تین آدمیوں کو قتل کر کے بھاگا ہے۔ اس کی تلاش ہو رہی ہے۔ آپ نے راستے میں کسی ایسے آدمی کو تو نہیں دیکھا جس نے نیلی جینز اور گہرے نیلے رنگ کی ٹی شرٹ پہن رکھی ہو؟“ اسے ایس آئی نے کہل۔

”اتفاق سے ایسا کوئی بندہ راستے میں نظر نہیں آیا۔“ عورت جواب دیا۔  
”شکریہ میڈم۔ آپ جا سکتی ہیں۔“ اسے ایس آئی کہتے ہوئے ان سے پیچھے رکنے والی ایک اور کار کی طرف متوجہ ہو گیا۔

عورت نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ اس کے ساتھ ہی وہ بشارت کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرا دی۔ بشارت کو اس کے حوصلے کی داد دینی پڑی۔ پولیس آفیسر سے بات کرتے ہوئے وہ ذرا بھی نہیں گھبرائی تھی۔ حالانکہ اگر آفیسری باتیں بشارت سے کرتا تو وہ یقیناً گڑبڑا جاتا۔

”تم کون ہو جو ایک اجنبی کے لئے اپنی جان خطرے میں ڈال رہی ہو؟“ بشارت نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہل۔

”ہاں۔ تم واقعی میرے لئے اجنبی ہو۔“ عورت نے جواب دیا۔ ”لیکن باتیں اطمینان سے ہوں گی اور یہ تسلی رکھو کہ میری وجہ سے جہنم کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔“

بشارت واقعی خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کے بدن پر جیو ٹیبل سی رینگ رہی تھیں اور دماغ میں سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ اس نے کبھی چونکی بھی نہیں ماری تھی اور آج دو آدمی اس کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ راستے میں چیکنگ کے دوران پولیس آفیسر کی باتوں سے انکشاف ہوا تھا کہ شرکے کا قتل بھی اس کے کھاتے میں ڈال دیا گیا تھا۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے وہ کلاپ اٹھا اسے شرکے کی موت کا افسوس تھا لیکن اسے اپنے آپ پر حیرت ہو رہی تھی۔ اس نے کس طرح دو آدمیوں کو گولیوں سے بھون کر رکھ دیا تھا۔ اگر وہ محض شرکے پر گولی نہ چلاتا تو شاید صورت حال مختلف ہوتی۔ وہ اسے مار بیٹھ کر پولیس کے حوالے کر دیتے۔ اس طرح شرکے کی زندگی تو بچ جاتی لیکن شرکے کو یک

جہنم کر بھاتے۔ کچھ کہ اس شخص نے گولی چلا دی تھی۔ شرکے کو بچانے کے لئے اس نے ہسپتال والے شخص پر چھلانگ لگا دی تھی جس کا نتیجہ اس قدر بھیانک نکلا تھا۔

کار اس چوراہے پر پہنچ گئی جہاں سے ایک سڑک شیشی محلے سے ہوتی ہوئی نکلتی

گیت کی طرف چلی گئی تھی۔ دوسری ذرا آگے دائیں طرف سڑک شیشی قلعے کی تحصیل کے

ساتھ ساتھ شیر نوالہ دروازے کی طرف۔ سامنے ہی وہ سڑک بھی تھی جو قلعے اور پلو شیشی

مہجر کے درمیان ہوتی ہوئی منٹو پارک کی طرف نکل جاتی تھی۔ یہ راستے بشارت کے

دیکھے بھالے تھے۔ بچپن میں جب وہ علامہ اقبال کے مزار پر آیا کرتا تھا تو گلیوں سے ہوتا ہوا اس راستے پر جایا کرتا تھا۔  
اس چوراہے سے ایک اور ترجمہی سڑک بھی دائیں طرف نکلتی تھی۔ اس عورت نے کار اسی سڑک پر موڑ لی تھی۔ یہ سڑک نیہٹا کشادہ تھی لیکن آگے جا کر بندر چنگ ہوتی چلی گئی اور چھوٹی چھوٹی لاتعداد گھیاں تھیں جو مکئی کے جال کی طرح چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔

اس سڑک پر کچھ ہی فاصلے طے کرنے کے بعد اس عورت نے کار بائیں طرف ایک کشادہ گلی میں موڑ لی۔ تقریباً سڑک آگے جا کر یہ گلی ختم ہو جاتی تھی۔ اس سے آگے جمیل کی طرح ایک بہت بڑا جوہڑ تھا جو در تک پھیلا ہوا تھا۔ اس پاس کے علاقوں کا سارا گندہ پانی اس جوہڑ میں اکڑتا تھا جس وجہ سے فضا میں ناگوار سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ جوہڑ کے کنارے پر کافی اندر تک سرکنڈے کے پودے پھیلے ہوئے تھے اور محلے کے کچھ تنک دھڑنگ بچے گندے پانی میں کھیل رہے تھے۔

کار بائیں طرف والے آخری مکان کے سامنے رک گئی۔ ہارن بجانے کے ایک منٹ بعد گیٹ کھل گیا اور وہ عورت کار کو اندر لے گئی۔

باہر سے یہ مکان اگرچہ چھوٹا سا لگتا تھا لیکن اندر سے کافی بڑا تھا۔ صحن بھی بہت کشادہ تھا۔ گیٹ سے برآمدے تک پختہ روش کے دائیں بائیں لان تھے جس کے کناروں پر پھولوں کے پودے تھے۔ پودوں پر اگرچہ خوش رنگ پھول کھلے ہوئے تھے لیکن ان کی خوشبو بھی جوہڑ کی طرف سے آنے والی ناگوار بو کے تاثر کو کم کرنے میں ناکام رہی تھی۔

دروازہ ایک ادھیڑ عمر عورت نے کھولا تھا جو طے اور لباس سے ملازمہ ہی لگتی تھی۔ پختہ روش پر برآمدے کے قریب کار روک کر اس عورت نے انجن بند کر دیا اور اپنی طرف کا دروازہ کھول کر بیٹھے اتر گئی۔ بشارت نے بھی اس کی تقلید کی اور اپنی طرف کا دروازہ کھول کر بیٹھے اتر آیا اور تجسس نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

جوہڑ کی طرف والی دیوار خاصی اونچی تھی۔ پوری دیوار پر عشق بچیاں کی پتیلیاں لپٹی ہوئی تھیں جن میں کافی اندر بخشی رنگ کے پھول بھی کھلے ہوئے تھے۔ دوسری طرف مکان تھا۔ اس طرف کی دیوار بھی کافی اونچی تھی۔ پچھلی طرف بھی مکان ہی تھا۔ جبکہ

سامنے کے رخ پر وہ گلی تھی جس سے یہ لوگ یہاں آئے تھے۔

اس مکان میں دو بیڑے رومز‘ ایک ہیل کمرہ اور ایک کشادہ ڈرائنگ روم تھا۔ کمروں میں آرامتہ سلمان خاصا چمکی اور خوبصورت تھا۔ وہ شیراز کا بھی تھی ہی تھی جس پر بشارت یہاں تک آیا تھا۔ ان تمام چیزوں سے اس عورت کی کلی حالت کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ گیٹ کھولنے والی ادھیڑ عمر عورت کا رے سلمان نکالنے کے لئے اس طرف بڑھی تو بشارت کے ساتھ آنے والی حسین عورت نے اسے روک دیا۔

”بی بی! کار سے سلمان میں خود نکل لوں گی۔ تم ہمیں چائے بنا دو اور چلی جاؤ۔ تمہاری بیٹی انتظار کر رہی ہو گی۔ آج تو ہمیں بدست رہو گی ہے۔“

وہ ادھیڑ عمر عورت جسے بی بی کے نام سے مخاطب کیا تھا پلٹ کر مکان کے اندر چلی گئی۔ وہ حسین عورت کچھ دیر وہاں کھڑی رہی پھر بشارت کو اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

”آؤ۔ اندر چل کر بیٹھے ہیں۔“

وہ ڈرائنگ روم میں آگئے۔ بشارت کی زندگی اپنے کھنڈر نما مکانات یا سڑکوں پر گزری تھی۔ کئی سال سے وہ استاد کنگو کے طویلے میں پڑا ہوا تھا۔ جہاں فرش پر پچھی ہوئی درزی پر سویا کرتا تھا۔ بچپن میں وہ صفر بابو کے گھر بڑھنے جایا کرتا تھا پھر بیڑے ماسٹر صاحب کے گھر کام کرنے جاتا تھا۔ لیکن ایسا جیتی سلمان تو اس نے کبھی بھی نہیں دیکھا تھا۔ البتہ فطوں میں ایسے گھر ضرور دیکھے تھے جن میں ایسا جیتی سازو سلمان ہوتا تھا۔

فرش پر دوپڑے کاٹلین، چمکی صوفے، شیشے کی باپ والی ایک سینئر فیل اور دو سائیز نیبل، ڈیکوریشن کا سامان بھی بڑا اعلیٰ اور جیتی تھا۔ اندر داخل ہوتے ہوئے بشارت نے جوئے دروازے ہی میں انکار دیئے تھے۔

”کیسا لگا میرا گھر؟“ اس عورت نے مسکراتی ہوئی نظروں سے بشارت کی طرف دیکھا۔

”بہت اچھا۔“ بشارت نے جواب دیا۔ وہ بھی کہہ سکتا تھا۔ صرف ایک کمرہ دیکھ کر وہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ پورا گھر کیسا ہو گا۔ اس نے کمرے میں ادھر ادھر دیکھا اور پھر اس کی نظرس اپنی میزبان پر مرکوز ہو گئیں۔

اس نے پہلی مرتبہ توجہ سے اس عورت کی طرف دیکھا تھا۔ دروازہ قامت، گداز

جملے ہوئے کلمہ ”کسی قاتل کو پناہ دینا نہ صرف سنگین جرم ہے بلکہ اپنے لئے بھی خطرناک ہو سکتا ہے۔“

”خطرات سے کھلیا شاید میری فطرت میں شامل ہے۔“ سینا نے مسکراتے ہوئے کلمہ ”دیسے میں تم جیسے بہادر نوجوانوں کی قدر کرتی ہوں اور میں نے تمہاری دلیری سے متاثر ہو کر تمہاری مدد کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی۔ چائے کے ایک دو گھونٹ بھرے پھر کپ میز پر رکھے ہوئے پولی۔ ”تم جب شاہ عالمی مارکیٹ کی دکانوں کے سامنے رکے تھے تو میں اس وقت ایک دکان میں کڑی اپنی ضرورت کی کچھ چیزیں خرید رہی تھی۔ تمہیں دیکھ کر مجھے کچھ عجیب سا لگتا تھا مجھے بے شرم کہہ سکتے ہیں لیکن مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی ہانک نہیں کہ تمہیں وہاں کھڑے دیکھ کر میرے دل میں گدگدی سی ہونے لگی۔ میں بے خودی ہو کر تمہیں دیکھتی رہی۔ میرے دل میں تم سے بات کرنے کی خواہش پیدا ہوئی لیکن میں نے ابھی تمہاری طرف پہلا قدم ہی اٹھایا تھا کہ تم سرک کے دوسری طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس طرف کا منظر بھی میں نے دیکھ لیا تھا۔ تمہاری طرح کا ایک نوجوان کسی آدمی کے ہاتھ سے چری بیگ چھین کر بھاگ رہا تھا۔ ایک اور آدمی نے اس پر گولی چلا دی۔ میرا خیال تھا کہ تم اس ایسکے کو پکڑنے کے لئے بھاگے ہو لیکن تم نے اس شخص پر چھلانگ لگائی تھی جس نے گولی چلائی تھی۔ اور پھر وہاں جو کچھ بھی ہوا وہ میرے لئے حیرت انگیز تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ تم اس نوجوان کو جاننے گئی تھیں۔ زخمی ہو کر گر پڑا تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ تم اس نوجوان کو جاننے ہو یا وہ تمہارا دوست ہے جسے تم بچانا چاہتے تھے اور اسے چلانے کے لئے تم نے جس جرات کا مظاہرہ کیا تھا وہ قتل تعریف تھا۔ تم نے اپنی جان کی بازی لگادی تھی اگر آخر میں دوسرا آدمی گولیاں نہ چلاتا تو شاید تم اپنے زخمی ساتھی کو وہاں سے لے جانے میں کامیاب ہو جاتے۔ قسمت نے تمہارے دوست سے توفیق نہ کی لیکن تم دو آدمیوں کو گولیوں سے چھلنی کر کے وہاں سے نکل گئے۔ تم نے اپنے دوست کے ہاتھ سے وہ چری بیگ بھی لے لیا تھا جس کے لئے یہ سارا ہنگامہ ہوا تھا۔“ وہ خاموش ہو کر ایک بار پھر چائے کی چسکیاں لینے لگی۔

بشارت نے بھی اپنا کپ اٹھایا اور ایک دو گھونٹ بھرے کے بعد میز پر رکھے ہوئے

جسم، کھلتے ہوئے گلاب جیسی رنگت، غزال جیسی موٹی موٹی آنکھیں جن میں ستاروں جیسی چمک تھی۔ چہرے کے نقوش نہایت دلچسپ اور آبدار موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے ہموار داشت۔ جب وہ مسکراتی تو پائیں رخسار پر تھا سا گڑھا بن جاتا جو اس کے حسن میں چار چاند لگا دیتا۔ اس نے لون کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ فیض اس قدر فٹ تھی کہ سینے کے ابھار بہت زیادہ نمایاں ہو گئے تھے۔ گریبان بھی خاصا فراخ تھا۔ سامنے کھڑا ہوا کوئی بھی شخص بغیر کسی کوشش کے اندر تک جھانک سکتا تھا۔ بشارت کے اندازے کے مطابق اس کی عمر تیس بیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ یوں تو بشارت نے بہت سی حسین اور جوان عورتوں کو اپنے آس پاس سے گزرتے دیکھا تھا لیکن کسی عورت کو اس طرح قریب سے دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ اس کی نظریں بار بار اس کے گداز سراپا کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کے دل کی دھڑکن بھی بے ربط ہو رہی تھی۔

”بھئیو۔ کھڑے کیوں ہو؟“ عورت نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

بشارت کے خیالات منتشر ہو گئے۔ وہ قریب کے صوفے پر بیٹھ گیا۔ چند منٹ بعد ہی بی بی چائے لے کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ اس نے دونوں کپ شیشے کے ٹاپ والی سینئر ٹیبل پر رکھ دیئے اور اس عورت کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”سائن تیار ہو گیا ہے،“ میں نے رویاں بھی پکا کر ہٹ پٹ میں رکھ دی ہیں۔ میں جا رہی ہوں۔ اب کل سویرے ہی آؤں گی۔“

”ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔“ اس حسین عورت نے کما اور بشارت کی طرف دیکھتے ہوئے بی بی کے ساتھ ہی باہر نکل گئی۔ چند منٹ بعد وہ باہر مارکیٹ بند کر کے واپس آگئی اور صوفے پر بیٹھنے کی بجائے سینئر ٹیبل کے قریب قائلین پر بیٹھ گئی اور ایک کپ بشارت کو طرف سرکا دیا۔ صوفے پر بیٹھے ہوئے بشارت نے اس کی طرف دیکھا تو دل کی دھڑکن کچھ اور تیز ہو گئی۔

”میرا نام سینا ہے۔“ اس عورت نے اپنا کپ اٹھاتے ہوئے کلمہ ”تم یقیناً یہ جاننے کے لئے بے چین ہو گئے کہ میں کون ہوں اور اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر میں۔“

”تمہیں پولیس سے کیوں بچایا؟“

”اور تم یہ بھی جانتی ہو کہ میں قاتل ہوں۔“ بشارت نے اس کے چہرے پر نظریں



ہولی۔ ”میں نے ایک چھوٹا سا برنس شروع کر رکھا ہے جس سے مجھے اتنی آمدنی ہو جاتی ہے کہ مجھے کسی چیز کی محسوس نہیں ہوتی۔ مجھے چند ایسے مخلص دوست بھی مل گئے ہیں جو وقتاً فوقتاً میری مدد کرتے رہتے ہیں۔“

بشارت خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا اسے ساری باتیں عجیب سی لگ رہی تھیں۔ سنیا کا شوہر کئی سال سے امریکہ میں تھا جہاں اس نے دوسری شادی کر رکھی تھی۔ اس نے کبھی خراج بھی نہیں بھیجا تھا۔ اور سنیا یہاں شادمانہ زندگی بسر کر رہی تھی۔ اس نے اپنے برنس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ اسے اس بات پر بھی حیرت تھی کہ اس کا شوہر اپنی خوبصورت بیوی کو چھوڑ کر امریکہ کیوں چلا گیا تھا اور سنیا کے وہ دوست کون تھے جو وقتاً فوقتاً اس کی مدد کرتے رہتے تھے۔

کئی سال سے شکرے کے ساتھ رہتے ہوئے وہ بہت کچھ جان چکا تھا۔ یہ تو اس کا اپنا بھی تجربہ تھا۔ بغیر مطلب کے ڈکیتی کسی کو ایک وقت کی روٹی بھی نہیں کھلاتا تھا۔ وہ دوسرے رات تک ہیڈ ماسٹر کے گھر میں کام کرتا تھا۔ اس کی بیوی اور بیٹے کی جھڑپیں اور مار کھاتا تھا اور تب کہیں ایک وقت کی بچی کچی روٹی ملتی تھی۔ اور صفدر بابو جو اسے بغیر فیس کے پڑھایا کرتا تھا لیکن اس کے ذریعے بیرونی کے پیکٹ ادھر ادھر بھجواتا رہتا تھا۔ کئی سال بعد اسے پتہ چلا تھا کہ بیرون کیا ہوتی ہے اور اسٹاک کیسے کی جاتی ہے۔ ایسے کاروبار میں حسین اور جوان عورتوں کو استعمال کیا جاتا ہے جو مردوں کے مقابلے میں زیادہ کالسیاب رہتی ہیں۔ کبھی پکڑی بھی جائیں تو آسانی سے اپنے آپ کو چھڑا لیتی ہیں۔

وہ دو آدمیوں کو قتل کر کے بھاگتا تھا۔ تیسرا قتل بھی اس کے کھاتے میں ڈال دیا گیا تھا۔ وہ پولیس سے بچنے کے لئے بھاگ رہا تھا۔ ایسے میں سنیا اسے اپنی گاڑی پر بٹھا کر آئی۔ اس نے بڑی گھنٹی کا ثبوت دیتے ہوئے راستے ہی میں اس کی شرٹ تبدیل کر دی تھی۔ اگر وہ پکڑا جاتا تو سنیا بھی اس کے ساتھ آہنی سلاخوں کے پیچھے بند ہوتی۔ اس نے اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر اسے پولیس سے بھلا دیا تھا۔ بشارت یہ مانتے کو تیار نہیں تھا کہ سنیا نے یہ سب کچھ اپنی سمجھ بوجھ سے نہ کیا تھا بلکہ اس کی رعنائی مرثی تھی۔ شریف لوگ تو ہر نام پریشہ لوگوں سے دور بھاگتے ہیں۔ چہ جائیکہ سنیا ایک عورت ہوتے ہوئے ایک ایسے اجنبی کو گھر لے آئی تھی جس نے اس کی آنکھوں سے

سارے دو آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ یقیناً کوئی خاص بات تھی۔

دفعۃً بشارت کے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ کیا سنیا اسے بلیک میل کرنے کا ارادہ تو نہیں رکھتی؟ مگر بشارت نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ بشارت جیب تراش اور اچکا ہے۔ بلیک میل کر کے اسے کیا ملے گا اور اگر بلیک میل کرنا ہی ہو تو اسے ساتھ لائے کی بجائے خاموشی سے اس کا پیچھا کرتی اور اس کا ٹھکانہ معلوم کر لینے کے بعد پس پردہ رہ کر اس سے کسی قسم کا کوئی مطالبہ کرتی۔

بشارت اس حسین عورت سنیا کے بارے میں بھی کوئی رائے قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ جوان اور حسین تھی۔ اتنے بڑے مکان میں اکیلی رہتی تھی اور بڑی شاندار زندگی بسر کر رہی تھی۔ اس کے لباس اور انداز گفتگو سے بھی بشارت نے اس کے بارے میں کوئی اچھی رائے قائم نہیں کی تھی۔

”کیا سوچ رہے ہو.....؟“ سنیا نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

”اوہ۔ کچھ نہیں۔“ بشارت گڑبڑا سا گلیہ۔ ”میں سوچ رہا ہوں اب مجھے پتہ چاہیے۔ تم نے مجھے پولیس سے بچا کر جو احسان کیا ہے میں اسے زندگی بھر نہیں بھول سکوں گا۔“

”میں نے تم پر اگر کوئی احسان کیا ہے تو اسے مٹھی میں ملا دینا چاہیے ہو۔“ سنیا نے اسے گھورا۔

”میں سمجھا نہیں۔“ بشارت نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”یہ توقف آدمی۔“ سنیا اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔ ”کیا تم سمجھتے ہو کہ پولیس والے گھر جا کر آرام سے سو گئے ہوں گے۔ پچھلے آدمی اس وقت تمہارا باہر ٹھکانا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ لباس تو تم نے بدل ہی لیا ہے، پوسٹا ہے کسی نے پولیس کو تمہارا مکمل حلیہ بھی بتا دیا ہو۔ وہ آدمی آخری وقت تک وہیں موجود رہا تھا۔ جہاں سے چری بیگ چھینا گیا تھا۔ اس نے تمہیں اچھی طرح دیکھا ہو گا۔“

بات غلط نہیں تھی۔ گرے سفاری سوٹ والا فائرنک ہونے پر اگرچہ ایک کار کے پیچھے چھپ گیا تھا لیکن اس نے بشارت کو اچھی طرح دیکھا ہو گا۔

”ایک منٹ۔“ سنیا کہتے ہوئے اٹھ کر باہر چلی گئی۔ اس کی دایبھی میں چند منٹ



سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ وہ سیاہ چڑی بیک اس نے ہاتھ میں لٹکار رکھا تھا۔ قریب آکر اس نے بیک بشارت کے سامنے میز پر رکھ دیا۔

”اس بیک کے لئے تین قفل ہوئے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم اس میں کیا ہے۔ کھول کر دیکھو تو یہ پتل چل جائے گا کہ تمہارے دوست نے اپنی جان کیوں ضائع کی تھی۔“

بشارت نے بیک اٹھالیا۔ سنیا بھی اس کے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔ بشارت نے آہستہ آہستہ بیک کی زپ کھولی اور پھر وہ دونوں ہی اچھل پڑے۔ بیک میں ہزار ہزار اور پانچ پانچ سو روپے والے نوٹوں کے بڈل بھرے ہوئے تھے۔ ان میں ایک سرخ بڈل بھی تھا سو روپے کے نوٹوں والا۔ بشارت بڈل نکال کر میز پر رکھنے لگا۔

سنیا کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ بڈل اٹھا کر دیکھنے لگی۔ ہر بڈل پر بیک کی سر لگی ہوئی تھی۔ سو والے نوٹ نئے تھے جبکہ ہزار اور پانچ سو والے پرانے اور استعمال شدہ نوٹ تھے۔

”چار لاکھ ساٹھ ہزار روپے۔“ سنیا کے لیے جب حیرت تھی۔ اس نے تمام بڈل ایک طرف رکھ دیے تھے۔ ”تمہارے دوست کی زندگی کی قیمت!“

بشارت کے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ وہ نوٹوں کے بڈلوں کو دیکھ رہا تھا۔ ظاہر ہے رقم بیک سے نکلائی گئی تھی۔ ہو سکتا ہے شکر اس وقت اس پاس ہی موجود ہو اور اس نے اس شخص کو یہ رقم لے کر بیک سے نکلے ہوئے دیکھ لیا ہو اور اس کے پیچھے لگ گیا ہو۔ شکر نے بہت بڑا ہاتھ مارا تھا لیکن خود اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

سنیا اس سے بیک لے کر اس کی مزید تلاش لے رہی تھی لیکن بیک میں اور کچھ نہیں تھا۔ کوئی ایسا کاغذ یا کوئی اور چیز بھی نہیں نکلی جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہو کہ جس شخص نے یہ رقم بیک سے نکلائی تھی وہ کون ہے۔ اس نے تمام بڈل اٹھا کر دوبارہ بیک میں ڈال دیے اور بیک بشارت کے سامنے رکھ دیا۔

”وہ تمہارا دوست تھا جو اس کے لئے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اس لئے اس رقم پر اب صرف تمہارا حق ہے۔“

بشارت چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اتنی بڑی رقم دیکھ کر سنیا کے دل میں لالچ پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس نے حصہ بھی نہیں مانگا تھا۔

”وہ کون تھا؟“ سنیا نے پوچھا۔ ”تم نے اسے بچانے کے لئے جس طرح اپنی جان کی بازی لگا دی تھی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ.....“

”میرا دوست تھا۔ شکر۔“ بشارت نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”اس سے میری بہت گہری دوستی ہو گئی تھی اور وہ مجھے سب کے مایوں کی طرح عزیز ہو گیا تھا۔“

”شاید بچپن کا دوست تھا۔“ سنیا بولی۔

”نہیں۔ اس سے میری پہلی ملاقات جیل میں ہوئی تھی۔“ بشارت نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اسے اپنے اور شکر کے بارے میں تفصیل بتانے لگا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔ ”میں وہ تو نہیں بن سکا جو بڑا چاہتا تھا۔ اگر شکر سے میری ملاقات نہ بھی ہوتی تو بھی شاید میں یہی کچھ کرتا۔ چوری، رہنمی، جیب تراشی، کیونکہ جیل سے نکلنے کے بعد یہ بات میری سمجھ میں آ گئی تھی کہ مجھ جیسے لادارث اور بے سارا لوگ چور، ڈاکو اور قاتل بن کر کتنے ہیں“ اقبال نہیں بن سکتے۔“

”بہت افسوس ہوا تمہاری کمائی سن کر۔“ سنیا کے لیے جب میں ہمدردی تھی۔ ”تو تمہاری بہن کا ابھی تک کوئی پتہ نہیں چلا۔“

”نہیں۔ وہ نہ جانے کہاں اور کس حال میں ہوگی۔“ بشارت کی آواز رندھ گئی۔

”میں اسے تمہارے ساتھ مل کر تلاش کروں گی۔ مجھے یقین ہے ایک نہ ایک دن وہ مل جائے گی۔“ سنیا نے کہا۔

”تم.....؟“ بشارت نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”اب ہمارا تمہارا تو کیا ساتھ رہے گا۔“ سنیا نے معنی خیز لہجے میں کہا اور پھر اٹھ کھڑی ہو گئی۔ ”دونج رہے ہیں، بھوک لگ رہی ہے۔ میں کھانا نکالتی ہوں۔ تم بھی منہ ہاتھ دھو لو۔ آؤ میں تمہیں ہاتھ روم دکھا دوں اور یہ بیک یہاں سے اٹھاؤ۔“

بشارت اس کے ساتھ ایک شاندار بیڈ روم میں آگیا۔ ڈریسنگ ٹیبل پر میک اپ میں استعمال ہونے والی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ بشارت نے بیک دھیں رکھ دیا اور سنیا کا بتایا ہوا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

ہاتھ روم بھی شاندار تھا۔ فرش ماربل کے ٹکڑوں کا تھا اور دیواروں پر پانچ فٹ کی بلند کی خوبصورت ٹائلز لگی ہوئی تھیں۔ ایک دیوار پر شیشے کے کینٹ میں کریمر اور

لوٹن کی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ دائیں طرف کھوئی پر شب خوابی کا خوبصورت زنان لباس اور زیر جامے وغیرہ لٹکے ہوئے تھے۔

بشارت نے سرخ نی شرت اتار کر اپنی بنیان بھی اتار کر کھوئی پر ٹانگ دی اور سرخ نی شرت دوبار پہن لی۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا اور ہاتھ روم سے باہر آگیا۔

سینا میز پر کھانا لگا رہی تھی اور پھر وہ دونوں آنے سامنے بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی گنگو کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ بشارت کو کچھ اندازہ ہو رہا تھا کہ سینا وہ نہیں ہے جو اس نے اپنے آپ کو ظاہر کیا تھا۔

کھانے کے بعد وہ ہال کمرے میں بھی صوفے پر بیٹھے دیر تک باتیں کرتے رہے۔ بشارت پر غصہ کی سی طاری ہو رہی تھی۔

”تمہیں نیند آ رہی ہے۔“ سینا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بہتر ہے تم تھوڑی دیر آرام کرو۔ آؤ میرے ساتھ۔“

سینا اسے اسی بیڈ روم میں لے آئی۔ وہ چری بیک اب بھی ڈرننگ ٹیبل پر رکھ ہوا تھا۔

”تم یہاں سو جاؤ۔ میں اتنے میں گھر کے چھوٹے چھوٹے کام نمٹا لوں گی۔“ سینا نے بیڈ کی طرف اشارہ کیا۔

بشارت کو ایک دم نیند کے جھوٹے آنے لگے تھے۔ وہ کچھ کے بغیر بستر پر گر گیا۔ اس نے یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی دھوکا بھی ہو سکتا ہے۔ چار لاکھ ساٹھ ہزار کی رقم اس بیک میں موجود تھی۔ اس رقم کے لئے تین قفل ہو چکے تھے۔ سینا کا نیت بدل گئی تھی۔ وہ اس رقم پر قبضہ کرنے کے لئے اسے سوئے میں قفل بھی کر کٹو تھی لیکن پوری شدت سے حملہ آور ہونے والی نیند نے اسے کچھ سوچنے کا موقع نہیں دیا۔ اور اس کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں۔

☆=====☆

جب وہ بیدار ہوا تو شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ سینا ہال کمرے میں بیٹھی ہوئی کوڑا کتاب پڑھ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ مسکرا دی۔

”میں نے ہاتھ روم میں کپڑے رکھ دیئے ہیں۔ تم نما کر کپڑے بدل لو۔ میں چا۔

بٹانے جاری ہوں۔“ سینا کتاب ایک طرف رکھ کر اٹھ گئی۔

بشارت دوبارہ اس کمرے کے ہاتھ روم میں گھر گیا۔ کھوئی پر پلے پائے شرت اور جینز کی ایک پیٹنگ تھی۔ اس نے دوپٹر کو اپنی جو بنیان ٹانگی تھی وہ غائب تھی۔

ٹھنڈے پانی کے غسل سے اس کی ساری کسلندی دور ہو گئی۔ اس نے کھوئی پر لٹکے ہوئے کپڑے پہن لئے۔ پیٹ اسے اس طرح ف آئی تھی جیسے اس کے لئے بوائے گئی ہو۔ وہ تیار ہو کر کمرے سے باہر نکلا تو سینا بھی پکے سے نکل رہی تھی۔ اسے دیکھ کر سینا کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی۔ اس نے چائے کے برتن میز پر لگا دیئے۔ چائے پینے کے فوراً ہی بعد بشارت اٹھ گیا۔

”میں تمہاری ہمدردی کا شکریہ ادا ادا نہیں کروں گا کہ اس سے تمہارے جذبات کی توجہ نہ ہو گی۔“ وہ سینا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں اب جانا چاہوں گا۔ میرا میلا رہنا مناسب نہیں ہے۔“

”کیا باہر لگنا مناسب ہو گا؟“ سینا نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔

”میں یہاں چھپ کر تو بیٹھا نہیں رہ سکتا۔ باہر لگنا ہی ہو گا۔ دیسے بھی اب تلاش کا ہنگامہ سرد پڑ چکا ہو گا۔“

”سوچ لو کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤ۔“ سینا نے کہا۔

”رہک تو لیتا ہی پڑے گا۔“ بشارت نے جواب دیا۔

سینا چند لمحوں کی طرف دیکھتی رہی پھر کمرے سے چلی گئی۔ واپس آئی تو اس نے براؤن کلر کا ایک بریف کیس اٹھا رکھا تھا۔ جو اس نے بشارت کی طرف بڑھا دیا۔

”یہ کیا ہے؟“ بشارت نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”مجھے یقین تھا کہ تم یہاں نہیں رو گے۔“ سینا نے کہا۔ ”وہ سیاہ چری بیک لے

جانا مناسب نہیں ہو گا۔ اس لئے میں نے وہ رقم اس میں ڈال دی ہے۔ اپنا اطمینان کر لو۔“ اس نے بریف کیس کھول دیا۔ اس میں نوٹوں کے ہنڈل رکھے ہوئے تھے۔

”یہ لوٹ کا مال ہے۔“ بشارت نے کہا۔ ”تم مجھے اس خطرے سے نکال

تھیں اس لئے اصرار تھا کہ اس پر تمہارا بھی حق بنتا ہے۔ اگر تم چاہو

رقم.....

”میں اگر چاہتی تو پوری رقم پر قبضہ کر سکتی تھی۔“ سنیتا نے اس کی بات کاٹ دی۔  
”میرے دل میں کوئی لالچ نہیں ہے۔ یہ رقم تمہاری ہے اور اپنا خیال رکھنا۔ کوئی براہم  
محسوس کرو تو بے دھڑک چلے آنا۔ اس گھر کا دروازہ تمہیں بیش کھلا ملے گا۔ چلو۔ تمہیں  
گاڑی پر چوک تک چھوڑ دوں۔ وہیں سے تمہیں کوئی ٹیکسی وغیرہ مل جائے گی۔“  
اس کے تقریباً بیس منٹ بعد بشارت وہ براؤن بریف کیس لئے چوک پر سنیتا کی کار  
سے اتر رہا تھا۔ اسے اتارنے کے بعد سنیتا وہیں رکی نہیں۔ گاڑی کو ایک طرف لپٹی چلی  
گئی۔

دو منٹ بعد ہی بشارت کو رکشہ مل گیا۔ اس کے خیال میں رکشہ ٹیکسی سے زیادہ  
مناسب تھا۔ ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے شخص کو باہر سے دیکھا جا سکتا تھا جبکہ رکشہ کے ریگزین  
کے اسپرنگ والے دروازے بند ہو جاتے تو باہر سے رکشے میں بیٹھے ہوئے مسافر کو دیکھنا  
ممکن نہ تھا۔

لکشی چوک سے اس نے رکشہ نسبت روڈ کی طرف مڑا لیا اور کچھ آگے جا کر  
ایک نہایت تاریک جگہ پر رکشہ رکوا لیا۔ کرایہ ادا کیا اور محتاط انداز میں اُدھر اُدھر دیکھا ہوا  
آگے چلے گا۔

استاد گنگو کے ڈیرے والی گلی میں مڑتے ہوئے بھی اس نے محتاط نگاہوں سے  
اطراف میں دیکھا تھا۔

اس وقت رات کے نو بج رہے تھے۔ اس وقت اڑے پر کوئی نہ کوئی لڑکا موجود رہتا  
تھا لیکن اس وقت سنا تھا۔ کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ احاطے کے وسط میں  
کلوی کے پول پر شام کے بعد ساٹھ واٹ کا ایک بلب جلا رہتا تھا لیکن بلب تو فیوز ہو گیا  
تھا یا کسی نے بجایا نہیں تھا۔ کرے کی جی جی بھی بجھی ہوئی تھی اور کسی گھوڑے کی آواز بھی  
سنائی نہیں دے رہی تھی۔ حلاکتہ شام کے بعد دو تین کوچوان اپنے آگے کھول کر  
گھوڑے باندھ جایا کرتے تھے۔

بشارت کی چمٹی جس اسے کسی گڑبڑ کا احساس دلاری تھی لیکن وہ آگے بڑھتا رہا۔  
غور ہے بھی؟ ”چاچا جانو کی جانی پچانی آواز تاریکی میں ابھری۔ وہ گھوڑوں کو

چارہ وغیرہ کھلایا کرتا تھا اور کوچوان اسے کچھ نہ کچھ دے دیا کرتے تھے۔

”میں ہوں چاچا۔ بشارت۔“ بشارت نے جواب دیا۔

چاچا جانو تیزی سے اس کے قریب آگیا۔

”بشارت بیٹے۔ بھاگ جا رہا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے پولیس تمہاری تلاش میں آئی

تھی۔ یہاں دو لڑکے تھے انہیں پکڑ کر لے گئے۔ وہ لوگ آس پاس ہی کہیں موجود ہوں

گے۔ بھاگ جاؤ یہاں سے۔“ جانو چاچا نے سرگوشی میں کہا۔

بشارت تیزی سی مزین ٹیکسٹ ایس لمہ ایک گونجی ہوئی آواز سنائی دی۔

”اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔ گولیوں سے چھلنی ہو جاؤ گے۔“

بشارت کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ دماغ سن ہو گیا۔ اور پھر دفعتاً اس کی آنکھیں

چندھیا گئیں۔ کسی تاراج کی تیز روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

”ہاتھ اوپر اٹھا لو اور اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔“ وہی گونج دار آواز دوبارہ

سنائی دی۔

بشارت دونوں ہاتھ آہستہ آہستہ اوپر اٹھانے لگا۔ اس کے سیدھے ہاتھ میں بریف

کیس بھی موجود تھا۔ اس صورت حال سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ پولیس کو معلوم تھا کہ

وہ یہاں آنے والا ہے۔ مگر پولیس کو یہ اطلاع کس نے دی۔ اس کے ذہن میں صرف ایک

ہی نام ابھرا تھا۔

”سنیتا..... اس کے علاوہ کون ہو سکتا ہے۔ صرف سنیتا ہی جانتی تھی کہ وہ کہاں

جا رہا ہے۔ اس نے فون پر پولیس کو اطلاع دے دی۔

شدید نفرت کے باعث بشارت کے چہرے کے اثرات مجبوزے چلے گئے اور وہ اس

پولیس والے کی طرف دیکھنے لگا جو اس پر ریوالتے آگے بڑھ رہا تھا اور دوسرے

پولیس والے نے اسے تاراج کی روشنی کی زد میں لے رکھا تھا۔

☆=====☆=====☆

سے تیزی سے حرکت میں آیا۔ بریف کیس اس پولیس والے کے منہ پر لگا اور وہ ایک بار پھر ہلانا ہوا ہائیں طرف کھڑے ہوئے دوسرے تانگے سے ٹکرا کر گر گیا۔ اس کے منہ سے ایک بار پھر کندی کا گزرا ہلنے لگا تھا۔

بشارت نے ادھر ادھر دیکھا۔ اس نے دونوں پولیس والوں کو وقتی طور پر مطلوب کر دیا تھا لیکن اس بات کا سو فیصد امکان تھا کہ باہر بھی ان کے کچھ ساتھی موجود ہوں گے۔ انہوں نے ان کے پیچھے کی آوازیں بھی سنی ہوں گی اور وہ کسی بھی لمحے اندر آ سکتے تھے۔ یا یہ دونوں سورے اس پر دوبارہ حملہ آور ہو سکتے تھے۔ اب یہاں رکنا خود کسی کے مترادف تھا۔ اس نے جانو چاچا کی طرف دیکھا جو ایک طرف کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔

”جانو چاچا ہنگامہ کو.....“ بشارت نے پیچھے ہوئے ایک طرف چھلانگ لگا دی۔

جانو چاچا بھی اس کے پیچھے ہی دوڑا تھا۔ ان دونوں کا رخ طویلے کے گیٹ کی طرف تھا لیکن بشارت کا گیٹ کے راستے باہر نکلنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ گیٹ کے باہر سے بھی دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر وہ رگید رگید اس کے پیچھے آنے والا جانو چاچا بدحواسی میں اس سے ٹکرا گیا اور اس ٹکر سے بشارت گرتے گرتے بچا تھا۔

”جانو چاچا۔ بھاگو اس طرف۔“ بشارت نے پیچھے ہوئے ایک طرف اشارہ کیا جس میں چار ٹانہ دار تانگے کھڑے تھے۔

”میں تو اب بھاگ کر کیس نہیں جاسکتا۔ تو بھاگ جا پتر۔ میں ان پولیس والوں کو یہیں روکنے کی کوشش کروں گا۔“ جانو چاچا نے کہہ دیا۔

اس سے پہلے کہ بشارت کچھ کہتا، فضاء فائز کی آواز سے گونج اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی جانو چاچا کے منہ سے خوفناک چیخ نکلی۔ یہ گولی اس اے ایس آئی نے چلائی تھی جسے بشارت نے ٹھوکروں سے بے بس کر کے گر دیا تھا۔ وہ گولی جانو چاچا کی پشت پر لگی تھی۔ اگر جانو چاچا وہاں نہ ہوتا تو بشارت اس گولی کا نشانہ بنتا۔

جانو چاچا کو سنبھالنے یا دیکھنے کا وقت نہیں تھا۔ بشارت نے ہائیں طرف ایک تانگے کے پیچھے چھلانگ لگادی اور تانہ کی میں دوڑنا چلا گیا۔ احاطے کی اس دیوار کے قریب گھوڑوں کو پانی پلانے کے لئے حوض سی بنی ہوئی تھی۔ بشارت اس حوض پر چڑھ گیا اور دوسری طرف چھلانگ لگا ہی رہا تھا کہ فضاء ایک بار پھر فائز کی آواز سے گونج اٹھی۔ گولی

ٹارچ کی روشنی صرف ایک لمحے کو بشارت کے چہرے سے ہٹتی تھی اور اس کے ساتھ ہی ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح اس کے ذہن میں لپکا تھا۔ ”اب یا کبھی نہیں۔“ اور پھر اس خیال کو عملی جامہ پہنانے میں اس نے ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کی۔ اس کا بریف کیس والا ہاتھ بڑی تیزی سے حرکت میں آیا۔

بریف کیس اس پولیس والے کے ہاتھ پر لگا جس نے اس پر پستول تان رکھا تھا۔ قانون کا وہ محاذ اس رد عمل کے لئے تیار نہیں تھا۔ بریف کیس بڑے زور سے اس کے ہاتھ پر لگا تھا۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جاگرا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے گندی مٹی نکل گئی تھی۔

بشارت نے صرف اس پر اکتفا نہیں کیا تھا۔ ایک پولیس والے پر بریف کیس سے حملہ کرنے کے ساتھ ہی اس کی لات بھی حرکت میں آگئی تھی۔ پیر میں ٹوکدار جوتے کی ٹھوکرا اس پولیس والے کی پٹلی پر لگی۔ وہ ہلکا اٹھل اس کے ہاتھ سے ٹارچ بھی گر گئی اور وہ ایک ٹانگ پر ٹپانے لگا۔ اس کے منہ سے بھی غلیظ گالیوں کا گزرا ہل پڑا تھا۔

ٹارچ لید کے ذمہ پر گری تھی اور اس کی روشنی اس پستول پر پڑ رہی تھی جو پہلے پولیس والے کے ہاتھ سے نکل کر ایک تانگے کے پینے کے قریب گرا تھا۔ روشنی میں پستول نظر آتے ہی اس پولیس والے نے اس طرف چھلانگ لگادی لیکن بشارت بھی حرکت میں آچکا تھا۔ اس کے پیر کی زوردار ٹھوکرا سامنے سے پولیس والے کے کندھے پر لگی۔ وہ پیچھے کو الٹ گیا۔ اس کا سر بڑے زور سے تانگے کے پینے سے ٹکرایا تھا۔ وہ اس طرح گرا تھا کہ اس کے شلڈر پر لگا ہوا ایک اشار ٹارچ کی روشنی میں جھلنے لگا تھا۔

اس دوران میں دوسرا پولیس والا سنبھل چکا تھا۔ وہ دوڑتا ہوا بشارت پر حملہ آور ہوا۔ اس کی دہاڑ بشارت کے لئے وارننگ ثابت ہوئی۔ اس کا بریف کیس والا ہاتھ بجلی کی

بشارت کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بریف کیس پر لگی۔ یکے بعد دیگرے دو اور فائر ہوئے مگر بشارت دیوار سے کود چکا تھا۔

اس دیوار کے دوسری طرف بھی ایک لمبا چوڑا احاطہ تھا جس پر طویل عرصے سے کسی کباڑیے نے قبضہ جما رکھا تھا۔ اس احاطے میں جگہ جگہ کباڑ کے انبار لگے ہوئے تھے۔ بشارت بکھرے ہوئے کباڑ سے بچتا ہوا گیٹ کی طرف دوڑا۔ احاطے میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ لوہے کے تاروں والا اونچا گھٹا بند تھا۔ بشارت گیٹ پر چڑھ رہا تھا کہ بریف کیس ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا۔ اس نے نیچے اتر کر بریف کیس اٹھایا اور دوبارہ گیٹ پر چڑھنے لگا۔

طویلے کی طرف سے پولیس والوں کے شور کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ گیٹ پر چڑھ کر دوسری طرف چھلانگ لگانے سے پہلے بشارت نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اسے طویلے کی دیوار پر ایک انسانی بیولہ نظر آیا جس نے اسی وقت احاطے کی طرف چھلانگ لگادی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک انسانی چیخ اترتے ہوئے تھی۔ بہت سارے خلی ڈیوں کے لڑکنے کا شور سنائی دیا۔ دیوار سے چھلانگ لگانے والا خلی ڈیوں کے ڈھیر پر گرنا تھا۔

بشارت نے گیٹ سے چھلانگ لگادی اور گلی میں سڑک کی طرف دوڑنے لگا۔ سڑک پر روشنی تھی اور ٹریفک کی آمدورفت جاری تھی مگر زیادہ رش نہیں تھا۔ بشارت نے رک کر دائیں طرف دیکھا۔ طویلے والی گلی کے سامنے سڑک کے دوسری طرف پولیس کی ایک گاڑی کھڑی تھی اور دو پولیس والے رائفلیں سنبھالے طویلے کی طرف دوڑ رہے تھے۔ وہ جیسے ہی گلی میں داخل ہوئے، بشارت نے پائیں طرف دوڑ لگادی۔

اس نے ابھی تقریباً بیس میٹر کا فاصلہ طے کیا تھا کہ پیچھے سے آنے والی ایک کار برنگوں کی تیز چڑچڑاہٹ کی آواز کے ساتھ اس کے قریب رگ گئی۔ اس کے ساتھ ہی کا پتھر جڑ میٹ کا دروازہ کھل گیا اور ایک جالی پھیلائی آواز اس کی سماعت سے گزرائی۔

”اندر بیٹھو۔ جلدی کرو۔“

یہ آواز بشارت کے لئے ہم کے دھماکے سے کم نہیں تھی۔ اس نے جھک کر دیکھا وہ سنیتا ہی تھی جس نے ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ سنبھال رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے

اسے کار میں بیٹھنے کا اشارہ کر رہی تھی۔

”تم۔۔۔۔۔“ بشارت نے دانت کچکپائے۔ ”تم ہی ان لوگوں کو یہاں لے کر آئی ہو۔ کاش! میرے پاس پستول ہوتا تو اس کی ساری گولیاں تمہارے سینے میں اتار دیتا۔“  
”کیا ایک رہے ہو۔ گاڑی میں بیٹھو۔ جلدی۔“ سنیتا نے کہتے ہوئے گردن ہموار کر پیچھے دیکھا۔

”اگر مجھے پتہ ہو تاکہ تم میرے ساتھ اس طرح دھوکا کرو گی تو میں تمہارے گھر میں ہی تمہارا گلا گھونٹ دیتا۔“ بشارت غریبا۔ ”پہلے پولیس کو یہاں لے کر آئیں اور جب دیکھا کہ میں بچ کر نکل رہا ہوں تو اس طرح مجھے چھانسنے کی کوشش کر رہی ہو۔“

”اوہ!“ سنیتا بولی۔ ”تم غلط سمجھ رہے ہو۔ بشارت، جلدی سے کار میں بیٹھ جاؤ۔ پولیس والے گلی سے نکل رہے ہیں۔ یہاں کھڑے ہو کر بحث کرنے کا وقت نہیں ہے۔ اگر انہوں نے دیکھ لیا تو ہمیں گولیوں سے بھون کر رکھ دیں گے۔ کار میں بیٹھو۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گی۔ جلدی کرو۔“

بشارت کے دماغ میں آنسو عیاں ہی چل رہی تھیں۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا جو پولیس والے دوڑتے ہوئے طویلے والی گلی میں گئے تھے، وہ دونوں واپس آگئے تھے۔ ان میں سے ایک تو سڑک کے دوسری کھڑی ہوئی موبائل کی طرف دوڑ گیا اور دوسرا وہیں رک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

بشارت مزید ایک لمحہ ضائع کیے بغیر کار میں بیٹھ گیا۔ اس نے دروازہ بند کر کے بریف کیس گود میں رکھ لیا۔ سنیتا نے ایک جھٹکے سے کار آگے بڑھا دی۔

”تم نے یہ سب کیوں کیا۔“ بشارت نے خوشخوار نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔  
”میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا تم نے میرے ساتھ اتنا بڑا دھوکا کیوں کیا؟“

”ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔“ سنیتا نے جھبی منظر پیش کرنے والے آئینے میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”پولیس کی گاڑی اسی طرف مڑی ہے اور دوسری گلی سے بھی پولیس والے باہر آ رہے ہیں جہاں سے تم آئے تھے۔ اس وقت تم خاموشی سے بیٹھے رہو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہاری باتوں سے بدحواس ہو کر میں کسی ٹانگے یا گاڑی کو ٹکر مار دوں۔“

بشارت اسے گھور کر رہ گیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پولیس کی گاڑی اس گلی کے سامنے رک گئی تھی جہاں سے وہ خود باہر آیا تھا۔ وہاں سے اس وقت تین پولیس والے تھے۔ دو ایک کر گاڑی میں سوار ہو گئے۔ ان میں سے ایک ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا اور دوسرا پچھلے حصے میں کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی پولیس کی گاڑی بڑی تیزی سے حرکت میں آئی تھی۔ سینٹا نے بھی کار کی رفتار بڑھا دی۔

بشارت سیدھا ہوا کہ بیٹھ گیا۔ پولیس کی گاڑی کو پیچھے آتے دیکھ کر اس کے دل کی دھڑکن جیز ہو گئی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر پولیس نے ان کی کار روک لی اور اسے شناخت کر لیا گیا تو اس کے بچنے کے امکانات ایک فیصد بھی نہیں ہو سکتے تھے۔ سینٹا کی طرف سے بھی وہ شکوک و شبہات میں مبتلا تھا۔ سینٹا کی یہاں موجودگی اس کے لئے الجھن کا باعث بنی ہوئی تھی۔ وہ پیدل ہوتا تو تاریک اور تنگ گلیوں میں غائب ہو جاتا لیکن کار میں بیٹھ کر اس کے فرار ہونے کے امکانات بھی محدود ہو گئے تھے۔

اس کی نظرس گود میں رکھے ہوئے بریف کیس پر پڑیں تو وہ اچھل پڑا۔ گولی لگنے سے بریف کیس میں سوراخ ہو گیا تھا۔ اس نے بریف کیس اٹھا کر فٹ میٹ پر رکھ کر اوپر چیر رکھ دیئے۔

پولیس موبائل کے ڈرائیور نے سائرن کھول دیا تھا اور وہ گاڑی کو آگے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مزک زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ دونوں طرف سے ٹریفک کی آمد و رفت کی وجہ سے اورور ٹیک کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ ٹانگوں کی وجہ سے تو ٹریفک میں اور بھی بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں سینٹا کی کار کے آگے بھی دو ٹانگے تھے جس وجہ سے وہ اپنی کار کی رفتار بھی نہیں بڑھا پا رہی تھی۔ پولیس موبائل اس کے پیچھے تھی۔

پولیس موبائل کسی طرح آگے نکل کر سینٹا کی کار کے برابر آ گئی۔ ڈرائیور نے سیٹ پر بیٹھ کر فٹ میٹ پر بٹھا ہوا تھا۔ وہ سینٹا کی طرف دیکھتے ہوئے چنپلا۔

”کار کو سائیڈ پر ہٹاؤ۔ چلائنا نہیں آتی تو گاڑی لے کر گھر سے نکلیں کیوں ہو۔“

”ان ٹانگوں کو سامنے سے ہٹاؤ میں تمہارے ساتھ رہیں کرنے کو تیار ہوں۔“ سینٹا نے بھی اس کی طرف دیکھ کر چیخے ہوئے کہا۔

موبائل کا ڈرائیور اونچی آواز میں ٹانگے والوں کو گالیاں بکنے لگا۔ اگرچہ سائرن بج رہا

تھا مگر وہ بار بار ہارن بھی بجا رہا تھا۔

بشارت نے ذرا سی گردن گھما کر دیکھا۔ ڈرائیور کے ساتھ دوسری طرف ایک اسے ایس آئی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ٹولڈر پر لگا ہوا اسٹارڈسٹیل بورڈ کے دائیں طرف سی روشنی میں چمک رہا تھا۔ بشارت کے دل کی دھڑکن بے قابو ہوئے تھی۔ یہ اسے ایس آئی بیٹھا دہی تھا جس سے احاطے میں دو بد مقابلہ ہوا تھا۔ اس نے تاراج کی روشنی میں بشارت کا چہرہ بھی دیکھا تھا اور بشارت سوچ رہا تھا کہ اگر اسے ایس آئی نے اس طرف دیکھ لیا تو اس پر قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ اس نے سینٹا کی طرف دیکھ کر بغیر بہت مدد مہم لیے میں کہا۔ ”موبائل میں بیٹھا ہوا اسے ایس آئی ٹولے میں میرا چہرہ دیکھ چکا ہے۔ کار کو آگے نکالنے کی کوشش کرو۔“

سینٹا نے کار کو بڑی آہستگی سے گھمایا اور ایک ٹانگے سے آگے نکال کر اسے تیزی سے اس طرح گھمایا کہ کار کا پچھلا حصہ گھوڑے کی ٹانگ پر لگھ گھوڑا بدک گیا اور نہٹانے ہوئے تھیں۔ سڑک پر کھڑا ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ کوچوان نے جلدی سے پھلانگ لگا دی اور منہ کے قریب سے اس پکڑ کر گھوڑے کو منہالنے کی کوشش کرنے لگا۔ ٹانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی عورتیں خوف سے چیخنے لگیں۔

گھوڑا بدک چکا تھا اور آسانی سے قابو میں آنے والا نہیں تھا۔ تاکہ مزک پر آڈا ترچھا ہو گیا جس سے پیچھے آنے والی موبائل اور دوسرے ٹریفک کو بھی رکنا پڑا۔

سینٹا نے سامنے معلق منظر پیش کرنے والے آئینے میں دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ بشارت بھی اس کی ذہانت پر دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

آگے میو اسپتال سے ذرا پہلے ایک چھوٹا سا چوراہا تھا۔ سینٹا نے کار اس چوراہے سے بائیں طرف موڑ لی۔ یہ تنگ سی سڑک تھی۔ دونوں طرف دوکانیں تھیں اور ٹریفک بھی زیادہ تھا۔ کار کی رفتار زیادہ نہیں تھی۔ سینٹا کی توجہ ڈرائیور پر تھی جبکہ بشارت ہالدار مڑ کر پیچھے دیکھ رہا تھا۔ یہ تنگ سی سڑک نیم دائرے کی صورت میں گھومتی ہوئی اس سڑک سے جا ملتی تھی جو میو اسپتال کے گیٹ کی طرف سے آتی ہوئی میگلڈ روڈ کو کراس کر کے کیتھڈرل چرچ کے قریب ہال روڈ سے جا ملتی تھی لیکن میگلڈ روڈ سے کچھ پہلے دائیں

طرف ایک اور چھوٹی سڑک بھی ملتی تھی جو تھوڑی ہی آگے جا کر مال روڈ سے مل جاتی تھی۔ ہینتا نے کار اس سڑک پر موڑ لی تھی۔ مال روڈ پر پہنچ کر اس نے کار دائیں طرف موڑ لی۔ بشارت نے اس وقت بھی ایک دو درجہ پیچھے سڑک دیکھا تھا۔

”ایک بات میری سمجھ میں نہیں آسکی۔ پولیس کو تو مجھے ان ہی گلیوں میں تلاش کرنا چاہئے تھا۔ مہا سبک میو اسپتال کی طرف کیوں آئی تھی جبکہ میں نے انہیں جانو چاچا کو بھی گاڑی میں ڈالتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔“

”جانو چاچا کون؟“ ہینتا نے پوچھا۔  
”طویلے میں رہتا تھا۔ اسے کوئی گلی تھی۔ پتہ نہیں وہ زندہ بچا ہے یا مر گیا ہے۔“  
بشارت نے کہا۔ ”لیکن پولیس کی گاڑی اس طرف کیوں آئی تھی؟“

”میرے خیال میں وہ اس پورے علاقے کی ناکہ بندی کرنا چاہتے ہوں گے۔“ ہینتا نے جواب دیا۔ ”میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ پولیس کی وہ گاڑی میو اسپتال سے پہلے اس چھوٹے چوک پر رک گئی ہوگی اور دائیں پس پر آس پاس کے علاقوں میں موجود دوسری گشتی گاڑیوں کو بھی اطلاع کر دی گئی ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ کلشی چوک کی طرف سے بھی اس علاقے کی ناکہ بندی کر دی گئی ہوگی۔“

”ایک بات میری سمجھ میں نہیں آسکی۔“ بشارت نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔  
”تم نے میرے بارے میں پولیس کو اطلاع دی تھی۔ پھر مجھے وہاں سے بچا کر کیوں نکال لائی ہو؟ کیا چاہتی ہو تم..... کون سا مکمل مکمل رہی ہو میرے ساتھ؟“

”کھیل؟“ ہینتا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”یہ ازہم تم پہلے بھی لپکا گئے ہو کہ پولیس کو اس طویلے میں تمہاری موجودگی کی خبر میں نے دی تھی لیکن مجھے ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے جنہیں اس وقت پولیس کے ہاتھ لگتے سے بچایا تھا جب وہ تمہارے گرد گھبراہٹ کر چکے تھے۔ بات زیادہ پرانی تو نہیں۔ آج دوسرے پہلے ہی کا تو واقعہ ہے۔ اگر میں رنگ محل کے قریب سے جنہیں اپنی کار میں بٹھا کر نہ لے جاتی تو تم پکڑے جا چکے ہوتے اگر مجھے پولیس سے کچھ انصاف لینا ہی تھا تو جنہیں بڑے اطمینان سے اس چوک پر پولیس کے حوالے کر دیتی جہاں گاڑیوں کی چٹیک ہو رہی تھی لیکن پولیس کو کسی شبیہ کا موقع دینے بغیر میں وہاں سے بھی جنہیں نکال لے گئی۔ تم سارا دن میرے گھر

پر رہے۔ کئی گھنٹوں تک غفلت کی غیند سوئے رہے۔ تقریباً ساڑھے چار لاکھ روپے کی رقم بھی عملی طور پر میرے قبضے میں تھی۔ میں اگر چاہتی تو بڑے اطمینان سے جنہیں پولیس کے حوالے کر دیتی اور وہ گرفتار رقم بھی اپنے پاس رکھ لیتی۔ تم کیا گاڑ لیتے میرا؟“  
”لیکن پولیس کو میرے بارے میں اطلاع کس نے دی اور وہاں تمہاری موجودگی۔ اسے میں کیا سمجھوں؟“ بشارت نے کہا۔

”اوہ!“ ہینتا کے منہ سے بے اختیار گھبراہٹ سانس نکل گیا۔ ”اس لئے تم مجھ پر شبہ کر رہے ہو؟“

”اس کے علاوہ شبہ کی اور کیا وجہ ہو سکتی ہے؟“ بشارت نے کہا۔ ”تم واحد ہستی ہو جسے معلوم تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں اور جب میں وہاں پہنچا تو پولیس میری سختی تھی۔“

”میں بتاتی ہوں کہ میں وہاں کیوں موجود تھی۔“ ہینتا نے کہا۔ ”جب تم اپنے ڈیرے پر آنے کے لئے میری گاڑی سے اتار کر رکشے میں بیٹھے تو ایک اور آدمی کو دوسرے رکشے پر تمہارے پیچھے روانہ ہوتے دیکھ کر مجھے شبہ ہوا تھا۔ وہ اگرچہ ساڑھ لپاس میں تھا مگر شکل سے پولیس والا ہی لگتا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ تم کسی معیت میں نہ پھنس جاؤ اس لئے میں نے تمہارا تعاقب شروع کر دیا۔ اس فیصل پر میرا شبہ غلط نکلا۔ وہ رکشہ بھائی چوک سے چوری کی طرف جانے والی سڑک پر مڑ گیا تھا۔ مجھے مطمئن ہو کر وہاں چلے جانا چاہئے تھا لیکن میں نے تمہارا تعاقب جاری رکھا۔ مجھے خود بھی معلوم نہیں میں نے ایسا کیوں کیا؟“ وہ چند لمحوں کا خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

”تم نے بتایا تھا کہ تمہارا ڈیرہ نسبت روڈ پر کلشی چوک سے ذرا ہی آگے ہے۔ کلشی چوک سے نسبت روڈ پر مڑ کر چند گز کا فاصلہ طے کر کے میں نے کار روک لی۔ اس وقت ٹریفک بھی زیادہ تھا لیکن میں نے تمہارے رکشے کو لگا ہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔“

”تمہارا رکشہ تقریباً ڈیڑھ سو گز آگے جا کر روک گیا اور تم اتار کر اس گلی میں داخل ہو گئے۔ میں تین چار منٹ تک وہاں کھڑی رہی اور پھر انجن اسٹارٹ کر دیا تھا۔ میری چٹھی جس خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔ مجھے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ تم خطرے میں تھے مگر میری

اس طرح ڈیرے پر کبھی ریٹ نہیں کیا اور پھر چلے جانے لگا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا تھا کہ پولیس میری تلاش میں آئی تھی۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ میں رات کو ڈیرے پر نہیں جاتا کہیں اور سوجاتا ہوں، لیکن آج پولیس کو یہ اطلاع تھی کہ میں وہاں آؤں گا۔ انہیں وقت کا بھی اندازہ تھا اور وہ لوگ میرے انتظار میں تھے۔

”تو پھر معلوم کرو تمہاری خبری کس نے کی تھی۔ وہ کون تھا جو تمہارے پردگرم سے واقف تھا؟“ سینا نے کہا۔

”تم.....؟“ بشارت کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”معاف کرنا سینا۔ میرے پردگرم سے تو صرف تم ہی واقف تھیں لیکن..... سب کچھ جاننے کے بعد میں تمہیں اہرام نہیں دوں گا لیکن..... لیکن میرا ذہن اس وقت بری طرح الجھا ہوا ہے۔“

”بہتر یہی ہے کہ اس وقت تم بالکل مت سوچو۔“ سینا نے کہا گاڑی اس وقت مختلف سڑکوں پر گھومتی ہوئی داتا دہارے کے آگے نکل کر راوی روڈ پر پہنچ چکی تھی۔ ”دماغ پر بوجھ بالکل مت ڈالو۔ اس وقت جتنا سوچو گے اتنا ہی الجھتے جاؤ گے۔“

”اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ بشارت نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس کا ذہن واقعی الجھا ہوا تھا۔ اسے اب تک یہ پتہ نہیں چل سکا تھا کہ وہ کس طرف جا رہے ہیں۔

”گھر..... اور کہاں؟“ سینا نے جواب دیا۔

”تمہارے گھر ہی کیوں؟“ بشارت نے کہا۔ ”مجھے کسی جگہ اتار دو۔ میں کہیں بھی چلا جاؤں گا۔“

”اس وقت تمہارے لئے محفوظ ترین جگہ میرا گھر ہے۔“ سینا نے جواب دیا۔

”بھول گئے ہو کہ پولیس نے تمہاری تلاش میں اس اڈے پر چھاپے مارا تھا اور وہاں ایک قتل بھی ہو گیا تھا۔ وہ قتل اگرچہ پولیس والے کے ہاتھوں ہوا تھا لیکن میں دعوے سے کہتی ہوں کہ وہ قتل یا تو تمہارے کھاتے میں ڈال دیا جائے گا یا اسے پولیس مقابلہ ظاہر کیا جائے گا۔ آئے دن لوگ ایسے ”پولیس مقابلوں“ میں مارے جاتے ہیں لیکن پولیس کو کبھی مورد اہرام نہیں ٹھہرایا جاتا۔ وہ قانون کے محافظ ہوتے ہیں کسی بے گناہ کو بید روی سے موت کے گھاٹ اتار کر اسے مفروز قاتل“ ڈاکو یا دہشت گرد ثابت کر دینا پولیس کے لئے

کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تمہیں خطرے سے کس طرح آگاہ کروں یا تمہاری کس طرح مدد کر دوں۔ اور پھر گولی چلنے کی آواز سن کر میں دہشت زدہ سی ہو گئی۔ اس کے فوراً ہی بعد میں نے دو اور پولیس والوں کو دوڑتے ہوئے اس گلی میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ وہ گولی یقیناً کسی پولیس والے نے چلائی تھی۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد ہی بعد دیگرے تین اور فائر ہوئے۔ میرے ہاتھ پیر کاٹنے لگے۔ جسم پیسے میں شرابور ہونے لگا۔ میری کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تمہاری فائر چڑھ لیتی چاہئے یا کسی بھڑکی امید رکھنی چاہئے۔

”اور پھر میں نے تمہیں آگے والی گلی سے نکلے ہوئے دیکھا۔ اس جگہ اگرچہ کچھ اندھیرا تھا لیکن میں نے تمہیں پہچان لیا۔ تم مخالف سمت میں دوڑے تھے۔ میں نے بھی گاڑی تیزی سے دوڑادی اور اس سے پیسلے کے پولیس والے گلی سے نکل کر تمہیں گولیوں سے بھون دیتے“ میں تم تک پہنچ گئی۔ ”سینا ایک بار چند لمحوں کو خاموش ہو گئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”یہ دوسرا موقع تھا کہ میں نے اپنی جان تمہارے لئے خطرے میں ڈالی تھی۔ اگر پولیس والے تمہیں میری گاڑی میں بیٹھے دیکھ لیتے تو تمہارے ساتھ میں بھی ماری جاتی۔ میں نے تو تمہیں بچانے کے لئے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی اور تم کہہ رہے ہو کہ میں نے تمہیں پکڑوانے کے لئے پولیس میں خبری کی تھی؟“

”سوری سینا۔“ بشارت کے لیے میں معذرت تھی۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میری باتوں سے تمہارے جذبات کو ٹھیس پہنچ لیکن میں جس ذہنی کرب میں مبتلا تھا اس کا تم اندازہ لگا سکتی ہو۔ صورت حال کچھ ایسی تھی کہ میں تمہارے سوا کسی اور پر شبہ نہیں کر سکتا تھا۔ بہر حال“ مجھے افسوس ہے لیکن اس بات پر بھی حیرت ہے کہ پولیس کو میرے بارے میں اطلاع کس نے دی تھی۔“

”تمہارا وہ ڈیرہ کوئی عبادت گاہ نہیں ہے۔ جب تراشوں اور جراثیم پیشہ لوگوں کا اڈا ہے۔“ سینا نے کہا۔ ”پولیس کا وہاں چھاپے مارنا کوئی حیرت کی بات تو نہیں۔ ایسے اڈے پولیس کی نظروں میں رہتے ہیں۔ بہتہ وصول کرتے ہیں وہ لوگ۔ ہو سکتا ہے پولیس اس سلسلے میں وہاں آئی ہو۔ یا اس علاقے میں کوئی بڑی واردات ہو گئی ہو۔ ایسی صورت میں پولیس سب سے پہلے علاقے کے بدنام اور جراثیم پیشہ لوگوں کو پکڑتی ہے۔“

”نہیں!“ بشارت نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ہم بہتہ ضرور دیتے ہیں لیکن پولیس نے



ذرا بھی مشکل نہیں ہو گا۔ ہاتھ چاچا پولیس کے ہاتھوں مارا گیا مگر تم فرار ہونے میں کامیاب ہو چکے۔ پولیس تمہاری تلاش میں رات بھر چھاپے مارے گی۔ تمہارے لئے کوئی جگہ محفوظ نہیں ہو گی، سوائے میرے گھر کے۔“

بشارت جواب میں کچھ نہیں بولا۔ سنیٹ فلک ہی کہہ رہی تھی۔ اس کے جتنے بھی جاننے والے تھے، سب اس پیشے سے وابستہ تھے۔ جرائم پیشہ لوگ۔ جو پہلے ہی پولیس کی نظروں میں تھے۔ سب سے پہلے پولیس ایسی ہی جگہوں پر چھاپے مارے گی۔ کسی ہوش کا رخ کرنا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا اور پھر اس کے پاس ایک خطرناک رقم بھی موجود تھی۔ یہ رقم بھی کسی کو اس کا شرم نہ سکتی تھی۔ اس کے لئے واقعی کوئی جگہ محفوظ نہیں تھی۔ سنیٹ کامکان ہی اس کے لئے بہترین پناہ گاہ ثابت ہو سکتا تھا۔

☆————☆————☆

نکار لیڈی ونگٹن اسپتال کے ساتھ سڑک کھنڈی دروازے میں داخل ہو گئی۔ دس اور گیارہ کے بیچ کا وقت تھا۔ آگے بازار حسن کے علاقے میں تو بڑی رونق تھی۔ ہر طرف سے ٹبلے کی قہقہ اور ٹھٹھروؤں کی جھنکار سنائی دے رہی تھی۔ بازار حسن کے عین بیچ سے گزرنے والی اس سڑک پر رش تھا۔ دونوں طرف گاڑیاں کھڑی تھیں۔ چھاپڑی والے اور بار پھول بیچنے والے بھی اپنی دکانیں کھلے ہوئے تھے جس سے سڑک کچھ اور تنگ ہو گئی تھی۔ کاری رفتار بہت تیزی تھی۔ ادھر ادھر کھڑے ہوئے لوگ ہوس بھری نظروں سے سنیٹ کو دیکھ رہے تھے۔ بعض لوگوں نے سنیٹ کو دیکھتے ہوئے جلتے بھی کئے تھے۔ بشارت اپنی سیٹ پر بے چینی سے ہلچلنے لگے لیکن سنیٹ کے چہرے پر کوئی تاثر ظاہر نہیں ہوا۔

”میں اس لئے شام کے بعد کبھی اس راستے سے نہیں آئی۔“ سنیٹ نے بشارت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس طرف سے گزرنے والی ہر عورت طوائف ہے۔ ان کی ماں بہن کو کوئی دوسرا مرد ایسی نظروں سے دیکھ لے تو شاید.....“ اس کا جملہ مکمل نہیں ہو سکا تھا۔ ایک ہیروئن کی اچانک ہی گاڑی کے سامنے آکر گر گیا تھا اور اسے اچانک ہی بریک لگانی پڑی تھی۔

دو آدمیوں نے گاڑی کی طرف دیکھا پھر آگے بڑھ کر ہیروئن کی کھینچتے ہوئے سڑک سے ہٹا کر ایک طرف ڈال دیا۔

”تم سمجھتے ہو یہ نشئی محض اتفاق سے گاڑی کے سامنے آیا ہو گا۔“ سنیٹ نے گاڑی کے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ”وہ اس نیت سے جان بوجھ کر سامنے آیا تھا کہ اسے گاڑی کی ٹکر لگے۔ اگر میری گاڑی اس کے پکڑوں کو کبھی چھو جاتی تو چاروں طرف کھڑے ہوئے ہی لوگ گاڑی کو گھیر لیتے۔ سب لوگ اس نشئی کے ہمدرد بن جاتے اور مجھے سوچا پس روپے دے کر جان چھڑانا پڑتی۔“

بشارت نے گردن گھما کر سڑک کے کنارے پر پڑے ہوئے ہیروئن کی طرف دیکھا۔ اس کا میلا جٹ لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ بال بے تحاشہ بڑھے ہوئے اور اچھے ہوئے تھے۔ ہاتھوں اور پیروں پر میل کے پچھتے تھے ہوئے تھے۔ پیشانی، رخسار اور ٹھوڑی پر زخم کے نشان تھے جن پر خون جما ہوا تھا۔ اندر کو دھکی ہوئی آنکھیں اور پیچھے ہوئے گال۔ اس کا چہرہ زندگی کی دیرانی کی بھرپور عکاسی کر رہا تھا۔

بشارت شر کے مختلف علاقوں میں ایسے کئی لوگوں کو دیکھ چکا تھا جنہوں نے منشیات کی لعنت کو گلے کا طوق بنالیا تھا اور اپنے آپ کو اس طرح بربادی کے دہانے پر پہنچایا تھا کہ ان کی دہائی کا کوئی راستہ نہیں رہا تھا۔

مزید چندہ منٹ بعد وہ گھر پہنچ گئے۔ کمرے میں آکر بشارت نے اطمینان کا سانس لیا اور ہاتھ میں بکڑے ہوئے بریف کیس کواٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ بریف کیس کے دونوں طرف سوراخ تھا۔ گولی ایک طرف سے داخل ہو کر دوسری طرف سے نکل گئی تھی۔ اچانک ہی اس کے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ اس نے بریف کیس سینئر ٹیبل پر رکھ کر کھول دیا اور اس کے ساتھ ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ سنیٹ بھی قریب کھڑی دیکھ رہی تھی۔ بشارت نے بریف کیس میں رکھے ہوئے سوسو والے نوٹوں کا ایک ہنڈل اٹھالیا۔ گولی نے نوٹوں کے اس ہنڈل میں بھی سوراخ کر دیا تھا۔

سنیٹ نے نوٹوں کا ہنڈل اس کے ہاتھ سے لے لیا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی پھر مسکراتے ہوئے بولی۔ ”دس ہزار کے یہ نوٹ تو خالص ہو گئے۔ سمجھو تمہاری جان کا مدد تو نکل گیا۔“

”مدد؟ اپنی کمائی میں سے دیا جاتا ہے۔ لوٹ مار کی رقم میں سے نہیں۔“ بشارت نے کہا۔

”ایک بات ہے۔“ سنیتا نے کہ۔ ”اب اگر تم منہ ہاتھ دھو لو تو میں کچھ کھانے کا بندوبست کروں۔ بڑے زور کی ہموک لگ رہی ہے۔“

”کچھ کھانے کو تو دل نہیں چاہتا۔ البتہ چائے کی طلب ہو رہی ہے۔“ بشارت نے بریف کیس بند کرتے ہوئے جواب دیا اور اٹھ کر کھانے روم میں گھس گیا۔

اس کا دماغ سلگ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ پولیس کو اس کے بارے میں اطلاع کس نے دی تھی۔ اسے سنیتا پر شبہ تھا لیکن صورت حال کا تجزیہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ سنیتا نے جو کچھ کہا تھا وہ غلط نہیں تھا۔ سب سے پہلے اسی نے تو اسے پولیس سے پہلیا تھا۔ اس کے بعد ہر لے اسے یہ موقع حاصل تھا کہ وہ اسے پولیس کے حوالے کر سکتی تھی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ ایسا کیوں کرتی۔ پولیس نے اس کی گرفتاری پر کوئی اہتمام تو مقرر نہیں کیا تھا جس کے لالچ میں وہ اسے پولیس کے حوالے کرتی، اور پھر اس کے پاس تو ساڑھے چار لاکھ سے زیادہ کی رقم موجود تھی۔ اسے کسی اور لالچ میں آنے کی ضرورت نہیں تھی۔

اسے اس بات کا یقین کرنی لیتا پڑا کہ سنیتا نے اس کی مجبوری نہیں کی تھی۔ اگر مجبوری کی ہوتی تو وہ اسے پچانے کے لئے کیوں پہنچ جاتی۔

بشارت جب ٹھٹھے پانی سے نہار باہر نکلا تو اس کے دماغ کی گرمی کچھ کم ہوئی تھی۔ سنیتا اس وقت تک چائے کے ساتھ کچھ سینڈویچ بھی تیار کر چکی تھی۔ سینڈویچ کھانے اور چائے پینے کے بعد بھی وہ دیر تک وہیں بیٹھنے باتیں کرتے رہے۔ بشارت بار بار سنیتا سے یہی پوچھ رہا تھا کہ اسے اس سے ہمدردی کیوں ہے۔ دوسرے اپنی جان خطرے میں ڈال کر اسے پولیس سے کیوں پہلیا۔ اس نے تو اب بھی اپنے آپ کو داؤ پر لگا رکھا تھا۔ پولیس کو اگر کسی طرح پتہ چل جائے کہ سنیتا نے بشارت کو اپنے گھر میں پناہ دے رکھی ہے تو پولیس کے عتاب سے وہ بھی نہیں بچ سکے گی۔ بشارت یہ بات کسی طرح بھی ماننے کو تیار نہیں تھا کہ سنیتا نے محض اپنی مہم جو فطرت اور تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کی مدد کی تھی۔ ہمدردی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ پہلی مرتبہ پولیس سے پچانے کے بعد اسے کسی محفوظ جگہ پر چھوڑ دینا چاہئے تھا لیکن وہ تو اس خطرے کو اپنے گھر میں لے آئی تھی۔

”تمہیں شاید میری باتوں کا یقین نہیں آیا؟“ سنیتا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہل۔

”بالکل نہیں۔“ بشارت نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہل۔ ”میں وہ مقصد جانتا چاہتا ہوں جس کے لئے تم نے دوسرے اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر مجھے پہلیا تھا اور پھر میں یہ بھی جانتا چاہتا ہوں کہ تم کون ہو۔ تم اکیلی رہتی ہو مگر تمہارا یہ ٹھٹھا باٹ.....“

”میں تمہیں بتا چکی ہوں۔“ سنیتا نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میرا شوہر امریکہ میں رہتا ہے جو مجھے خفیہ بھیجتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ میں نے یہاں ایک چھوٹا سا بزنس بھی شروع کر رکھا ہے۔ میرے کچھ ٹھٹھ دوست ہیں جو کاروباری معاملات میں اور ویسے بھی میری مدد کرتے رہتے ہیں۔ اور.....“

”کوئی دوست ٹھٹھ نہیں ہو گا۔“ بشارت نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”ہر شخص یہاں غرض کے رشتوں سے بندھا ہوا ہے۔ کسی تحریص کے بغیر کوئی کسی کے کام نہیں آتا۔ میرا باپ بیماری سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا کسی نے اس کے حلق میں دوا کا ایک قطرہ نہیں پیلا۔ میں نے سسک سسک کر زندگی گزاری ہے۔ روٹی کے ایک ایک نوالے کو ترسا ہوں میں۔ میری بہن کو بھرے بازار میں غنڈے اٹھا کر لے گئے۔ میں چپٹا چلاتا رہا کسی نے میری مدد نہیں کی۔ اس لئے کہ میرے پاس کسی کو دینے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ مجھ سے کسی کی کوئی غرض وابستہ نہیں تھی۔ مجھے جب تراثی کے اٹرام میں سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا گیا اور جب میں جیل سے باہر نکلا تو زندگی کے راستے میرے لئے پہلے سے زیادہ تاریک اور جھلجھلکے ہوئے تھے۔ میں روٹی کے ایک ایک نوالے کے لئے ترستا رہا میں نے تین تین دن تک فالتے کئے، کسی نے مجھے اپنے قریب پھٹکے نہیں دیا۔ ہر شخص مجھے لمبے اور اچھوت سمجھ کر مجھ سے دور بھاگتا رہا۔ کسی نے مجھے سارا نہیں دیا۔ کوئی میری مدد کے لئے نہیں آیا۔ اس لئے کہ کسی کو مجھ سے کوئی غرض نہیں تھی، لیکن تم اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر یہاں لے آئیں۔ آخر اس کی کوئی تو وجہ ہوگی اور تمہارے وہ ٹھٹھ دوست جو تمہاری مدد کر رہے ہیں، کون ہیں وہ؟ وہ بلاوجہ تم پر اس قدر مہربان نہیں ہوں گے۔ مجھے کسی نے سارا کیوں نہیں دیا تھا۔ کوئی مجھ پر اتنا مہربان کیوں

نہیں ہوا تھا؟

”تم جذباتی ہو رہے ہو۔“ سنیتا نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہہ ”اور میں یہ بھی جانتی تھی ہوں کہ تمہیں میری باتوں کا یقین نہیں آیا۔ میں یہ بھی تسلیم کرتی ہوں کہ غرض اور لالچ کے بغیر کوئی کس پر مہربان نہیں ہو سکتا۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں تمہیں پولیس سے بچا کر یہاں لائی ہوں تو اس میں یقیناً میری غرض پوشیدہ ہے۔ آؤ۔ میں تمہیں اصل کہانی بتاتی ہوں۔“

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ گئی۔ بشارت نے بھی کرسی چھوڑ دی۔ سنیتا اپنے بیڈ روم میں آگئی۔ اس نے الماری کا دروازہ کھولا اور اس کے نچلے خانے میں لا کر کھولنے لگی، اور پھر اس نے ایک اہم نکال کر بشارت کے سامنے بیڈ پر پھینک دی۔

”پہلے یہ اہم دیکھ لو تاکہ میری کہانی سمجھنے میں آسانی رہے۔“

بشارت نے اہم اٹھالیا اور بیڈ پر بیٹھ کر ایک ایک لف پلٹ کر دیکھنے لگے۔ سنیتا بھی اس کے قریب بیٹھ گئی۔ پہلی تصویر ایک بہت بڑی خولی کی تھی۔ جس کے گیٹ کے سامنے ایک ادھیر عمر مرد، ایک عورت اور دو نو عمر بچے کھڑے تھے۔ ان میں ایک لڑکے کی تصویر تھی جس کی عمر گیارہ برس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ دوسری لڑکی تھی جو لڑکے سے دو ڈھائی سال بڑی ہوگی۔

”یہ میرے ماں باپ ہیں۔“ سنیتا نے تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ میرا چھوٹا بھائی اور یہ میں ہوں۔“

بشارت لیف پلٹتا رہا اور سنیتا اسے تصویروں کے بارے میں بتاتی رہی۔ ان تصویروں کو دیکھنے کے بعد بشارت اس نتیجے پر پہنچا کہ سنیتا کا تعلق ایک خوشحال زمیندار گھرانے سے تھا۔

”اب میں تمہیں بتاتی ہوں کہ یہ سب کچھ کیا ہے۔“

سنیتا نے اہم لے کر ایک طرف رکھ دیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہنے لگی۔ ”فیصل آباد سے چند میل دور ب سڑک ایک چھوٹا سا گاؤں ہے بلکہ چند گھروں پر مشتمل ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ میں اس بستی کی رہنے والی ہوں۔ میں یہ بھی بتاتی چلوں کہ اب اس بستی کا وجود ختم ہو چکا ہے۔ اس بستی سے ملحق زرعی اراضی میں ڈیڑھ مربع زمین

ہماری ملکیت تھی۔ ان تصویروں سے تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ ہم بہت خوشحال زندگی گزار رہے تھے۔ میں اور میرا چھوٹا بھائی سلطان فیصل آباد کے ایک بہت اچھے اسکول میں زیر تعلیم تھے۔ میرے والد کے پاس ایک برائی سی فائٹ کار بھی تھی۔ ہم اس کار پر اسکول آتے جاتے تھے۔ میں اس وقت ساتویں کلاس میں تھی اور میرا بھائی پانچویں کلاس میں۔ ”زندگی بہت سکون و اطمینان سے گزر رہی تھی پھر ایک روز یہ خبر آئی کہ حکومت فیصل آباد میں انزپورٹ بنانے کا منصوبہ بنا رہی ہے اور اس کے لئے جس علاقے کا انتخاب کیا گیا تھا اس میں ہماری اراضی بھی شامل تھی۔ حکومت نے انزپورٹ کے لئے زمین حاصل کرنے کے لئے علاقے کے زمینداروں سے مذاکرات شروع کر دیئے۔ میرے والد کو یہ پیشکش کی گئی کہ ہماری زمین کی دیکھو کہ آدمی قیمت نقد ادا کی جائے گی اور باقی آدمی قیمت میں کسی دوسری جگہ اتنی ہی زمین دی جائے گی۔ اگر ہم وہ زمین نہ لینا چاہیں تو ہم اپنی زمین کی پوری قیمت بھی وصول کر سکتے ہیں۔“

”میرے والد کو یہ میں قتل کے علاقے میں زمین کی پیشکش کی گئی تھی اور وہ علاقہ ریگستان پر مشتمل ہے۔ وہاں پانی کی بھی قلت ہے۔ وہاں زراعت کے لئے زمین تیار کرنے میں بڑی محنت کی ضرورت تھی۔ اس میں برسوں لگ سکتے تھے۔ میرے والد نے وہاں زمین لینے سے انکار کر دیا اور اپنی زمین کی پوری قیمت وصول کرنے پر اصرار کیا۔ اس طرح تقریباً ایک سال بعد معاملہ طے ہو گیا اور ہم وہ زمین چھوڑ کر شہر منتقل ہو گئے۔“

”میرے والد نے مجھ آباد میں ایک مکان خرید لیا جو ہماری ضروریات کے لئے کافی تھا۔ وہ علاقہ ابھی پوری طرح آباد نہیں ہوا تھا۔ کہیں مکان بن چکے تھے اور کہیں زیرِ تعمیر تھے۔ ہم نے جس جگہ مکان لیا تھا اس کے آس پاس چار چھ گھر بھی آباد ہوئے تھے۔ بہت سے پلاٹ خالی پڑے تھے۔ کچھ مکان زیرِ تعمیر تھے۔ وہاں زندگی کی سہولتیں بھی مفقود تھیں۔“

”میرے والد نے زندگی کی سب سے بڑی غلطی یہ کی کہ اراضی کی فروخت سے لاکھوں روپے کی جو رقم ملی تھی اسے چیک میں رکھوائے۔ بے بجائے سونا خرید لیا۔ انہیں شاید بینکوں پر اٹھو نہیں تھا۔ اس کی وجہ بھی معقول تھی۔ کئی سال پہلے جنرل چیک کے ذریعے ان کے بینک اکاؤنٹ سے بیس ہزار روپے نکلوا لئے گئے تھے اور بینک نے اس کی

خود دوبارہ کھڑی کی طرف دوڑی تھیں لیکن وہ ابھی کھڑی سے دوڑی تھیں کہ کسی ڈاکو کی چلائی ہوئی گولی لگی اور وہ چیخ کر زمین پر گر پڑیں۔ سلطان اہل کی طرف لپکے اسے بھی گولی لگی اور وہ بھی چیختا ہوا گر پڑا۔ میں بھی شاید اہل اور سلطان کی طرف دوڑ پڑتی لیکن اسی لمحے اہل کی چیخ ہوئی آواز سنائی دی۔

”وہ مجھے وہاں سے دور جانے کو کہہ رہی تھیں۔ یہ آواز میں نے آخری مرتبہ سنی تھی۔ میں مڑ کر ایک طرف کو بھاگ نکلی۔ کسی ڈاکو نے مجھ پر بھی گولی چلائی تھی لیکن میں بچ گئی اور تاریکی میں دوڑتی ہوئی ایک گلی میں مڑ گئی۔

”میں ہوش میں آئی تو اسپتال میں پڑی تھی۔ پڑوس کے مکانوں میں رہنے والی دو تین عورتیں میرے پاس کھڑی تھیں۔ میرے ہوش میں آنے کے تقریباً ایک گھنٹے بعد ایک عورت نے بتایا کہ میرا باپ اور بھائی سلطان مر چکے ہیں۔ اہل کے سینے میں گولی لگی ہے۔ وہ اگرچہ زندہ ہیں لیکن بیہوش پڑی ہیں۔ گولی ان کے دل کے قریب ایسی جگہ پیوست ہے جسے ٹکانا خطرناک ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر سکے کہ فوری طور پر آپریشن کیا جائے یا نہیں۔“

سینٹا خاموش ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں دیرانی اور چہرے پر بے پناہ اداسی تھی۔ پرانی یادوں نے اسے افسردہ کر دیا تھا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر بشارت کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اس وقت میری عمر تیرہ سال تھی۔ دو تین مہینے زیادہ ہو گئی۔ تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ میرا کیا حال ہوا ہو گا۔ باپ اور بھائی مر چکے تھے۔ میں ان سے کبھی نہیں بنی تھی۔ ویسے فیملی آباد میں ہمارا دور کا بھی کوئی رشتے دار موجود نہیں تھا۔ میں غیروں کے رحم و کرم پر تھی۔

”تین دن تک زندگی اور موت کی کشمکش میں جھلا رہنے کے بعد اہل نے بھی دم توڑ دیا۔ امید کی جگہ جی کرنا تھی وہ بھی تاریکی میں ڈوب گئی۔ میں اس دنیا میں باہل اہلی رہ گئی۔ چہدہری عمو دراز کی بیوی مجھے اپنے کمرے آئی۔ چہدہری عمو دراز کی عمر پچاس اور بچپن کے درمیان تھی اور اس کی اس علاقے میں کربانے کی دکان تھی۔ اس کی بیوی عنایت بی بی بیٹیا لیس کے گنگ بھگ تھی۔ ان کی شادی کو بیس بائیس سال ہو گئے تھے لیکن اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ عنایت بی بی انکڑ ہمارے گھر آتی رہتی تھی۔ وہ

زمہ واری بھی قبول نہیں کی تھی۔ میرے والد نے بینک سے اپنا اکاؤنٹ ختم کر دیا اور اس کے بعد سے کبھی اکاؤنٹ نہیں کھولا۔ اس لئے زمین کی فروخت سے ملنے والی رقم کسی بینک میں رکھوانے کے بجائے انہوں نے سونا خرید لیا۔ ان کا خیال تھا کہ سونے کی قیمت بڑھتی رہے گی تو رقم میں بھی اضافہ ہو گا۔ وہ کسی کاروبار کے لئے بھی سوچ رہے تھے لیکن ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔“ سینٹا بات کرتے رک گئی۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ بار بار ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔

بشارت اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا اور ڈاننگ نیبل پر سے پانی کا بھرا ہوا گلاس اٹھا کر لے آیا۔ اس نے کچھ گئے بغیر گلاس سینٹا کی طرف بڑھا دیا۔ سینٹا نے آدھا پانی پیا اور گلاس سائیز نیبل پر رکھ دیا۔ وہ چند لمحے خاموش رہی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ”میں غلام محمد والے مکان میں آئے ہوئے تین مہینے ہو چکے تھے اور پھر اس رات ایسا طوفان آیا جس نے سب کچھ تباہ کر دیا۔

”وہ رات کا آخری پہر تھا۔ میں گری نیند سو رہی تھی کہ شور کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی اور پھر یہ سنسنی خیز انکشاف مجھے لرزادینے کے لئے کافی تھا کہ ڈاکوؤں نے ہمارے گھر پر حملہ کر دیا تھا۔ وہ تعداد میں کئی تھے اور میرا باپ اکیلا جو ڈبل بیل بندوق سے ان کا مقابلہ کر رہا تھا مگر ڈاکو مکان کے اندر گھس آئے تھے۔ دو ڈاکو چھت پر چڑھ گئے اور کچھ نے مکان کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔

”ہم ایک کمرے میں تھے۔ ہاٹے میری اہل کو کہا کہ وہ مجھے اور سلطان کو لے کر پچھلی کھڑی سے نکل جائیں۔ اہل! باکو اکیلے نہیں چھوڑنا چاہتی تھیں لیکن انہیں اہا کی بات ماننی پڑی اور جب ہم کھڑی سے کود رہے تھے تو اس وقت وہ کمرے کا دروازہ توڑنے کی کوشش کرنے لگے۔ ابا چار پائی دیوار سے لگا کر اس پر کھڑے ہو کر زوشندان سے ڈاکوؤں پر فائرنگ کر رہے تھے لیکن وہ دو ڈاکو کسی طرح آگے آنے میں کامیاب ہو گئے جو دروازہ توڑ رہے تھے۔

”ہم کھڑی سے کود کر پچھلی گلی میں آ گئے۔ اسی وقت شاید ڈاکوؤں نے کمرے کا دروازہ توڑ کر ابا پر حملہ کر دیا تھا۔ ابا کی چیخوں کی آواز سنائی دے رہی تھیں۔ اہل نے مجھے اور سلطان کو ایک طرف دوڑا دیا کہ ہم کسی کے گھر میں چھپ کر اپنی جان بچالیں۔ و

سرگودھا سے ابا کا چچا زاد بھائی اُمید وہ مجھ سے لپٹ کر دواڑیں مار مار کر روتا رہا اس نے کہا کہ وہ مجھے خیروں کے پاس نہیں چھوڑ سکے گا میں اپنا سلمان سیٹھ کرتا رہی کروں۔ وہ کل مجھے سرگودھا لے جائے گا مجھے کچھ اطمینان ہوا کہ انہوں میں سے کوئی تو آگے آیا جو مجھے سارا دے گا۔

”میرا وہ چچا رات کو چوہدری عمودراز کے گھر پر ہی رہا تھا۔ سونے کے بارے میں“ میں نے پولیس کو بھی بتایا تھا اور اس رات چوہدری عمودراز نے میرے اس چاچا کو بھی سب کچھ بتایا کہ ڈاکو میرے ماں باپ اور بھائی کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد سب کچھ لوٹ کر لے گئے۔

”صبح ناشتہ کرنے کے بعد میرا وہ چچا ”ابھی آیا“ کہہ کر گھر سے نکلا اور پھر لوٹ کر نہیں آیا۔ میں اپنا سلمان ہاندے اس کا انتظار کرتی رہی لیکن اسے نہ آتا تھا نہ آیا۔ وہ شاید اس امید پر آیا تھا کہ باپ کی ساری دولت مجھے ملے گی اور وہ مجھ سے بھرپور جتنا کہ اس دولت پر قبضہ کر لے گا لیکن اسے پتہ چل گیا تھا کہ مجھے وراثت میں دیکھوں اور غلوں کے سوا کچھ نہیں ملا۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔

”ہمارا مکان خلیا خلیا رہا تھا۔ میں چوہدری عمودراز کے گھر پر ہی رہ رہی تھی۔ چاچائی عنایت بی بی مجھے بہت چاہتی تھی۔ میرا سبب خیال رکھتی تھی لیکن کچھ عرصے بعد ہی میں نے محسوس کیا کہ چاچا عمودراز کی نظروں میں فرق آیا تھا۔ بعض اوقات وہ ایسی نظروں سے میری طرف دیکھتا کہ مجھے شرم آجاتی۔

”ایک سال مگر گیلہ میں لڑکپن سے کل کر دو تیزگی کی عمر میں قدم رکھ چکی تھی اور پھر ایک روز چاچائی عنایت بی بی بیمار پڑ گئی۔ اسے ہیضہ ہو گیا تھا اس کا علاج بھی ہوا اور میں نے بھی اس کی بڑی خدمت کی لیکن وہ چاہیہ نہ ہو سکی اور آٹھویں دن اس کا انتقال ہو گیا۔

”اس کے دو مہینے بعد چاچا عمودراز مجھے لے کر جھنگ آیا۔ جھنگ شہر سے تقریباً پانچ میل دور چند گھروں پر مشتمل وہ چھوٹی سی بستی ہماری منزل ثابت ہوئی۔ بستی کے سرے پر واقع اس گھر میں ایک بوڑھی عورت اور اس کا شوہر رہائش پذیر تھے۔ وہ کاشتکار تھے۔ ”چوہدری عمودراز مجھے یہ کہہ کر لایا تھا کہ ہم چند روز بعد واپس آجائیں گے لیکن

مجھے اور سلطان کو بہت چاہتی تھی۔ بے اولاد تھی نہ مکے میں دوسرے بچوں کو بھی بہت پیار کرتی تھی۔

”کئی روز بعد میں اپنے گھر گئی۔ جتنی دیر یادیں کا وہ منظر آج بھی میرے ذہن پر نقش ہے۔ اس کمرے میں اب بھی خون کے دھبے موجود تھے۔ وہ میرے باپ کا خون تھا۔ پورے گھر میں ہر چیز گھری ہوئی تھی۔ ابا کے کمرے میں ان کا پتنگ بھی اٹا ہوا تھا اور اس کے نیچے ایک جگہ فرش کھرا ہوا تھا۔

”مجھے اچھی طرح یاد ہے زمین فروخت کرنے کے بعد ہاٹے اس رقم سے سونا خریدا لیا تھا اور پھر ایک روز ابا لوہے کا ایک صندوقچہ بنا کر لائے تھے۔ بہت مضبوط صندوقچہ تھا۔ جتنی نقل کے علاوہ وہ اضافی تالے بھی تھے۔ اور پھر اس رات میں نے ابا کو لوہے کا وہ صندوقچہ یہاں گڑھے میں دفن کرتے ہوئے دیکھا۔ ابا بھی ان کے ساتھ تھیں۔ صندوقچہ دفن کر کے ابا نے فرش پر سینٹ کر کے اوپر پتنگ بچھا دیا اور پھر دوسرے روز اس پر قالین بچھ چکا تھا۔

”مجھے معلوم تھا کہ ابا نے زمین کی فروخت سے ملنے والی رقم سے سونا خریدا تھا اور پھر لوہے کے اس صندوقچے کو رازداری سے دفن کرتے دیکھا تو مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ سونا وہاں دفن کر دیا گیا ہے اور اتفاق سے میں نے وہ جگہ دیکھ لی تھی لیکن اس راز کو میں نے راز ہی رکھ رکھا۔ سلطان کو بھی نہیں بتایا کہ سونا کہاں دفن کیا گیا ہے۔

”اور اس افسوسناک واردات کے بعد گھر میں جاکر میں نے اس کمرے میں گڑھا کھدوا دیکھا تو مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ڈاکو سونے سے بھرا ہوا وہ صندوقچہ نکال کر لے گئے تھے۔ میرا خیال ہے کہ کسی کو پتہ چل گیا ہو گا کہ ابا نے پوری رقم کا سونا خریدا ہے۔ وہ جو کوئی بھی تھا اس نے اپنے ساتھیوں سے مل کر لوٹنے کا پروگرام بنایا اور ہمارے گھر پر بلر پل دیا مجھے یقین ہے کہ انہوں نے ابا پر تشدد کر کے یہ معلوم کر لیا ہو گا کہ سونا کہاں چھپایا گیا ہے اور اس طرح وہ فرش کھود کر سونے سے بھرا ہوا صندوقچہ نکال کر لے گئے۔“

وہ ایک بار پھر خاموش ہو گئی۔ سائیل جیل پر رکھا ہوا گلاس اٹھایا پانی کے دو تین گھونٹ پئے اور بشارت کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ”اس واقعے کے پندرہ دن بعد

میں آنے کے دوسرے دن یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ اس کا داپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ اپنی دکان اور مکان فروخت کر آیا تھا۔

”اس روز گھر پر کوئی نہیں تھا۔ بڑھیا اور اس کا شوہر کیتھن پر گئے ہوئے تھے۔ چوہدری عمودراز بھی گھر پر نہیں تھا۔ ایک گھنٹہ پہلے جب بڑھیا گھر موجود تھی، وہ یہ کہہ کر گیا تھا کہ جھنگ شہر جا رہا ہے، دوپہر تک لوٹ آئے گا۔ اس کے آدھے گھنٹے بعد بڑھیا بھی کیتھن پر چلی گئی۔

”میں آنگن میں کپڑے دھوئے بیٹھ گئی۔ میں صرف تین چار جوڑے ساتھ لے کر آئی تھی اور وہ سب میلے ہو چکے تھے۔ میں نے مقامی عورتوں کی طرح دھوتی باندھ لی اور بڑھیا کا ایک پرانا کرتا پہن لیا۔ میرا خیال تھا کہ تیز دھوپ میں آدھے پونے گھنٹے میں میرے کپڑے سوکھ جائیں گے تو میں بہن لوں گی۔

”میں ابھی کپڑے دھوی رہی تھی کہ باہر کا دروازہ کھلا اور چوہدری عمودراز کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ مجھے انہی طرح یاد تھا کہ میں نے اندر سے دروازے کی زنجیر لگادی تھی۔ پتہ نہیں اس نے کس طرح زنجیر کھول لی تھی۔

”میں بدحواس ہو کر کمرے کی طرف دوڑی لیکن اس سے پہلے کہ اندر داخل ہو کر دروازہ بند کرتی، چوہدری عمودراز دروازے کو دھکا دے کر اندر گھس آیا اور دروازہ بند کر دیا۔

”میں خوف سے قہر قہر کانپنے لگی۔ چوہدری عمودراز نے دروازہ روک رکھا تھا۔ وہ ذرا آگے بڑھا تو میں نے جھٹکی دے کر دروازے کی طرف بڑھنے کی کوشش کی مگر اس نے مجھے پکڑ کر چارپائی پر پیسک دیا۔ میں چیخی چلائی رہی۔ اس کے آگے ہاتھ جوڑے، ”سنت سلامت کی“ خدا اور رسول کے واسطے دینے مگر جب آنکھوں پر ہوس کی پٹی بندھی ہو تو وہ خدا یاد رہتا ہے نہ رسول اور نہ قرآن۔

”چوہدری عمودراز مجھے بتی کہہ کر پکارا کرتا تھا اور اس روز اس نے اپنی بیٹی عزت کی دھجیاں بکیر دی تھیں۔ میری چیخیں کمرے میں گونجتی رہیں۔ میں بے بس چڑھا آ طرح پھر پھڑک رہی تھی۔

”اس رات چوہدری عمودراز نے ایک بار پھر میرے ساتھ وہی شیطانی کھیل کھیلنے

کوشش کی۔ مجھے اس کا اندازہ قلم میں سے چارپائی پر لیٹنے سے پہلے درافتی اپنے گتے کے نیچے چھپا کر رکھ لی تھی۔ چوہدری عمودراز نے جیسے ہی مجھ پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی میں نے اس پر درافتی سے حملہ کر کے اس کا زخروہ اوچر دیا۔ اور پھر میں وہاں سے بھاگ نکلی اور آج تک بھاگ رہی ہوں۔ وہ خاموش ہو گئی۔ اس نے گھاس اٹھایا اور اس میں بچا ہوا پانی ایک ہی سانسی میں حلق میں اڑا لیا۔

”اور وہ تمہارا شوہر..... جو امریکہ میں ہے۔“ بشارت نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اسے اس کی کمائی پر افسوس ہو رہا تھا۔

”وہ ایک الگ کمائی ہے۔“ سنیتا نے گمراہ سا لہجے لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں پتہ نہیں کمال کمال ٹھوکریں کھاتی ہوئی ملتان پہنچ گئی۔ وہاں ایک نیک دل خاتون مل گئی۔ اس نے مجھے سارا دیا اور جی بیٹا کر رکھا۔ میں تقریباً تین سال ملتان میں رہی۔ وہاں دو اور جوان لڑکیاں تھیں جن کے بارے میں مجھے بتایا گیا کہ وہ اس خاتون کی بیٹیاں ہیں۔ تین سال کے اس عرصے میں اس خاتون نے مجھے سلاطین، کڑھائی سمیت ایسے اور بھی کئی کام سکھا دیئے اور پھر ایک دن وہ ہمیں لے کر لاہور آگئی۔ میں ہم سمن آباد کے قریب پکی ٹھنڈی کے ایک مکان میں رہے۔

”اس مکان میں چند روز تو سکون سے گزرے پھر وہاں مختلف لوگوں کی آمدورفت شروع ہو گئی۔ بڑے بڑے لوگ آتے تھے وہاں۔ چم چٹائی ہوئی قیمتی گاڑیوں پر۔ ان سے ہماری بھی ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ بلکہ ان ملاقاتوں کا اہتمام کیا جاتا تھا۔

”ایک روز اس خاتون کی ایک بیٹی تائب ہو گئی۔ ایک ہفتے بعد وہ سری بیٹی بھی کہیں چلی گئی۔ اس کے چند روز بعد وہ خاتون مجھے گھر گھر کی ایک عائشہ نامی عورتی میں لے گئی۔ وہاں دو آدمیوں کے علاوہ ایک اوچر عمر ہماری بھرم عورت بھی موجود تھی۔ وہ عورت مجھ سے باتیں کرتی رہی۔ ”میرے بارے میں“ میرے ماں باپ کے بارے میں پوچھتی رہی۔ اس کا لہجہ بہت ہمدرد پاکر میں سب کچھ اسے بتاتی چلی گئی۔

”بہت دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ وہ نیک دل خاتون جسے میں ابلاں کہا کرتی تھی، وہاں موجود نہیں ہے۔ میں نے کچھ دیر اور انتظار کیا۔ میری پریشانی بڑھتی گئی اور جب میں وہاں سے جانے کے لئے اٹھی تو اس ہماری بھرم عورت نے مجھے روک لیا اور یہ سنسنی

خیرا عکشف کیا کہ وہ ہمدرد اور نیک دل خاتون، جسے میں اہل سکتی تھی، میری قیمت وصول کر کے چاہیگی ہے۔ دھاتی لاکھ روپے اس نے مجھے دھاتی لاکھ روپے میں بیچ دیا تھا۔ میں گلبرگ کی اس عالی شان کوٹھی میں قیدی بن کر رہ گئی۔ کوٹھی میں تو میں آزادی سے محکوم سکتی تھی لیکن مجھے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ شام کے بعد وہ کوٹھی راہ اندر کا دربار بن جاتی۔ پتہ نہیں کہ اس سے اتنی لڑکیاں آجاتی تھیں۔ جوان اور حسین۔ کوٹھی میں بڑے بڑے لوگوں کی آمد رفت تھی۔ ان میں اعلیٰ حکمرانی آفیسر بھی تھے، تاجر اور صنعت کار بھی اور انڈسٹری سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی۔ یہ سب وہ معززین تھے جنہیں معاشرے کے ستون کہا جاتا ہے۔ وہ رات کے اندر میرے میں عیاشی کے لئے اس کوٹھی میں آتے تھے۔ شہر میں اور نہ جانے کتنی ایسی کوٹھیاں تھیں۔

”مجھے پہلی مرتبہ جس شخص کے حوالے کیا گیا کہ ایک قلمی وادیت کا تھا جو رات بھر شراب پی کر مجھے قلمی ہیروئن بنانے کی باتیں کرتا رہا۔ میں آدمی رات کو اسے غافل پارک ہماگ نکلی لیکن میں کہیں جاتی۔ میرا ٹھکانا کہیں تھا مجھ جیسی لڑکیوں کا ٹھکانہ کہیں ہو سکتا ہے۔ میں ایک پارک میں گھر پر لیٹ گئی۔ میرا خیال تھا کہ رات اس پارک میں گزار کر صبح کوئی ٹھکانہ تلاش کروں گی لیکن مجھے بیچ پر لینے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ دو پولیس والوں نے مجھے پکڑ لیا۔ یہ پولیس والے بھی بڑے سیانے ہوتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ کس وقت کہیں شکار مل سکتا ہے۔ اندر میری راتوں میں بعض پارکوں کے کونوں کھدے بھی تھوڑی دیر کے لئے آگاہ ہو جاتے ہیں اور پولیس والوں کو ان کونوں کھدوں میں ایسے ہی جھڑوں کی تلاش ہوتی ہے جو تھوڑی دیر کے لئے دہل آتے ہیں۔ لیکن اس رات میں پولیس کے کچھ آگئی۔

”وہ پولیس والے میرے ساتھی کے بارے میں مجھ سے پوچھتے رہے۔ پھر تھانے لے آئے۔ تھانے دار آدمے کھینچے تک مجھ سے پوچھ گچھ کرتا رہا۔ پھر مجھے دو سٹریٹوں کی گھرائی میں اپنے کوارٹر میں بھیج دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ قانون کا محافظ ہے۔ اب میری سٹریٹوں کے دن ختم ہو جائیں گے۔ مزید آدمے کھینچے بعد تھانہ دار بھی کوارٹر میں آگیا اور ایک بار پھر مجھ سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ میں نے اسے سب کچھ بتا دیا کہ میں کون ہوں اور کہیں سے ہوا کرتی تھی۔ میں نے اسے گلبرگ کی کوٹھی میں لڑکیوں کا دھندا کرنے والی

بھاری بھر کم خیم نامی اس عورت کے بارے میں بھی بتا دیا۔

”اور پھر تھانہ دار کو اپنی فون پر پہنچی دھاتی لاکھ روپے کے بکسے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ قانون کا وہ محافظ بھی لٹیرا نکلا۔ وہ سٹریٹوں کو میرے بارے میں ہدایات دے کر اپنی ڈیوٹی پر چلا گیا اور پھر صبح سویرے وہ موٹی خیم دہل آکر مجھے دوبارہ اپنی کوٹھی میں لے گئی۔

”میں ایک ایسے گرداب پھنس گئی تھی جس سے نکلنا نامکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ میں نے کوشش جاری رکھی۔ مگر یہ گرداب دراصل ایک ایسا طوفانی پتھر ثابت ہوا جس میں قدم قدم پر شکاری گھات لگتے بیٹھے تھے۔ کوئی لڑکی بیچ کر جاتی نہیں سکتی اور پھر میں تو بے سہارا تھی۔

”ایک روز مجھے اور نامی ایک شخص کے حوالے کر دیا گیا۔ وہ منشیات کا سوداگر تھا۔ ہیروئن سپلائی کرتا تھا۔ اس نے مجھے لالچ دیا کہ اگر میں اس بزنس میں اس کے ساتھ شامل ہو جاؤں تو وہ مجھے خیم سے خرید لے گا لیکن میں نے انکار کر دیا۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد میری ملاقات رفیق سے ہوئی۔ اس نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا اور مجھے خیم سے خرید لیا۔

”میں ایک گھر چلائی تھی۔ یا کم از کم ایسی جگہ جسے میں اپنا گھر کہہ سکوں۔ جہاں بلا خوف و خطر سکون کی زندگی گزار سکوں۔ رفیق نے اپنا وعدہ پورا کیا اور مجھ سے شادی بھی کر لی۔ سانپ کا ڈاسر سی جسے بھی ڈرتا ہے۔ رفیق نے نکاح ہو جانے کے باوجود مجھے اس پر اکتفا نہیں تھا۔ میں ڈرتی تھی کہ جب اس کا دل بھر جائے گا تو چار حروف پر مشتمل کلمہ میرے ہاتھ میں تھما دے گا اور مجھے کسی اور کے حوالے کر دے گا لیکن میں بہت ٹھوکریں کھا چکی تھی۔ اب اپنے آپ کو کچھ مضبوط کر لینا چاہتی تھی۔ شادی کے چند ہی روز بعد میں نے رفیق کو مجبور کیا تو اس نے یہ مکان میرے نام ترانسفر کر دیا۔

”رفیق اکثر امریکا، برطانیہ اور کینیڈا کے کاروباری دورے کیا کرتا تھا۔ آخری مرتبہ وہ تین سال پہلے آیا تھا۔ اس کے بعد لوٹ کر نہیں آیا۔ مجھے اس نے خط لکھ دیا تھا کہ اس نے دہلی شادی کر لی ہے اور وہ کچھ عرصے تک واپس نہیں آئے گا۔ اس کی شادی والی خیر درست تھی لیکن کچھ عرصے بعد اکتشف ہوا کہ وہ ہیروئن کا اسمگلر ہے۔ ہر پھیرے میں

میں نے بھی چار پانچ آدمی رکھے ہوئے ہیں جنہیں اپنے خرچ پر بھیجتی ہوں۔ وہ میرے لئے مال لے کر آتے ہیں اور میں انہیں کمیشن بھی دیتی ہوں اور مجھے بھی اس مال پر اچھا خاصا منافع مل جاتا ہے۔“

”ہوں۔“ بشارت نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس میں شبہ نہیں کہ کام محنت کا ہے اور تم اپنے ماضی کو بھلا کر ایک اچھی اور صاف ستھری زندگی گزارنے کی کوشش کر رہی ہو لیکن میں ایک بار پھر اپنا وہی سوال دہراؤں گا کہ تم نے اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر مجھے پولیس سے کیوں بچایا؟“

”میں تو ماضی کو بھلا کر ابھی اور صاف ستھری زندگی گزارنا چاہتی ہوں لیکن کچھ لوگ ایسا نہیں چاہتے۔ وہ مجھے دوبارہ گندگی کی اس دلدل میں گھینٹنا چاہتے ہیں۔ ان سے بچنے کے لئے مجھے کسی ایسے آدمی کی تلاش تھی جو تھکس بھی ہو اور عذر بھی۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی۔ ”تم نے ٹھیک کہا تھا۔ تمہیں پتا دینے میں میری بھی غرض پوشیدہ تھی۔ میں نے تمہیں ایشیاء میں دیکھا تھا۔ تم نے کس طرح اپنے ساتھی کو بچانے کے لئے اپنی جان خطرے میں ڈال دی تھی اور کس طرح وہاں سے نکل گئے تھے۔ تمہاری یہ کارروائی دیکھ کر ہی میرے دل میں خیال آیا تھا کہ میرے مطلوبہ آدمی تم ہو۔ اس لئے میں تمہیں وہاں سے نکال لائی تھی اور پھر نسبت ردو والے اڈے تک بھی میں نے اسی خیال سے تمہارا پیچھا کیا تھا کہ تم کسی معصیت میں نہ پھنس جاؤ۔“

”تم نے مجھے ایک جرم کرتے دیکھا تھا اور اسی لئے مجھے پتا دیا تھا کہ مجھے بلیک میل کر کے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کروگی۔“ بشارت نے کہا۔

”پہلے میں نے یہی سوچا تھا کہ تمہیں دباؤ میں رکھوں گی۔“ سینہ پہلی مرتبہ مسکرائی۔ ”لیکن اب میرے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تمہیں کسی بات پر مجبور نہیں کروں گی۔ میں تمہیں زبردستی یہاں اس لئے لائی تھی کہ یہ جگہ تمہارے لئے سب سے زیادہ محفوظ ہے۔ کم از کم آج کی رات تمہیں ایسی جگہ کی ضرورت تھی جہاں محفوظ رہو۔ رات گزارنے کے بعد تم جب اور جہاں جانا چاہو جا سکتے ہو۔ میں تمہیں روکنے کی کوشش نہیں کروں گی۔“

”وہ کون لوگ ہیں جو تمہیں دوبارہ اس گندگی میں گھینٹنا چاہتے ہیں؟“ بشارت نے

کسی نہ کسی طرح گلوڈیڈھ کلہ ہیروئن لے جاتا ہے۔ امریکہ کی اینٹی نارکوٹکس فورس کو اس پر شبہ ہو گیا تھا۔ اس کے سامان کی اچھی طرح تلاشی بھی لی جاتی تھی۔ اس کی گھرنی بھی لی جاتی تھی لیکن اس کی خلاف کوئی ثبوت نہیں ملا تھا۔

”اینٹی نارکوٹکس فورس نے اسے پھانسنے کے لئے جال پھیلا یا اور وہ بڑی آسانی سے اس جال میں پھنس گیا۔ اس چھپے عیاش لوگ بڑی آسانی سے ایسی جالوں میں آ جاتے ہیں۔ وہ لڑکی اینٹی نارکوٹکس فورس کی اینجن تھی جس نے اس سے شادی کر لی تھی۔ شادی کے چند روز بعد ہی رفیق اس کے سامنے کھل گیا اور اسے بتا دیا کہ اس کا ہیروئن اسکل کرنے کا طریقہ کار کیا ہے اور آخری پھیرے میں لائی ہوئی ہیروئن اس نے کمال چھپا رکھی ہے۔ اسے گرفتار کر لیا گیا۔ اسے آٹھ سال کی سزا ہو گئی جس میں سے تین سال جگت چکا ہے۔“

اس نے خاموش ہو کر گلاس اٹھایا جو خلی ہو چکا تھا۔ بشارت اٹھ کر گلاس میں پانی لے آیا۔ ”اور تمہارے وہ دوست؟“ بشارت نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”یہ وہ لوگ ہیں جن سے شہنم کی کوششی میں ملاقاتیں ہوتی رہی تھیں۔“ سینہ نے جواب دیا۔ ”تم نے ٹھیک کہا تھا۔ کوئی دوست تھکس نہیں ہو۔ یہ حرص و ہوس کے رشتے ہیں۔ کسی لالچ اور مقصد کے بغیر کوئی کسی کی مدد نہیں کرے۔ یہ جاننے کے باوجود کہ میں شادی کر چکی ہوں اور گھر والی بن کر رہنا چاہتی ہوں، یہ لوگ مجھ سے اب بھی توقعات وابستہ رکھے ہوئے ہیں اور مجھے قیمتی تحائف دیتے رہتے ہیں، جنہیں قبول کر لینے میں کوئی حرج نہیں سمجھتی اور مجھے حیرت ہے کہ ہر دوسرے تھیرے مینے مجھے امریکہ سے بھی کچھ رقم آجانی ہے۔ رفیق جیل میں ہے اور میں نہیں جانتی اس کے نام سے یہ رقم کون بھیجتا ہے؟“

”اور وہ کاروبار، جس کا تم نے ذکر کیا تھا؟“ بشارت نے پوچھا۔ ”میں ہانگ کانگ اور سنگاپور سے کچھ چیزیں منگوا کر یہاں بعض بڑے دکانداروں کو چلائی کرتی ہوں۔“ سینہ نے جواب دیا۔ ”مکراچی کا لاہور میں بڑی تعداد میں کھینچ موجود ہیں جو پہلے صرف ہانگ کانگ اور سنگاپور جایا کرتے تھے لیکن اب تو نیشنل ایٹمی کی نوآباد ریاستوں تک جانے لگے ہیں۔ المائدہ آج کل ان کھپوں کا سب سے بڑا مرکز بنا ہوا ہے۔“



سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر

”شہنشاہ اور انور“ سینا نے جواب دیا۔ ”انور بیروٹن کا سپلاز ہے اور شہنشاہ لوڈیوں کی سپلاز۔ انور کی طرف سے زیادہ دباؤ نہیں لیکن شہنشاہ کی مرتبہ مجھے دھکیلی بھی دے چکی ہے۔ اس نے خوشخوار قسم کے غنڈے پال رکھے ہیں۔ اس کے بڑے بڑے لوگوں سے تعلقات بھی ہیں۔ مجھے زیادہ خوف اس کی طرف سے ہے لیکن بہر حال، یہ میرا درد سر ہے۔ میں کسی اور کو اس معاملے میں کیوں گھسیٹوں!“

بشارت خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر باہمی کے سامنے منڈلانے لگے تھے۔ اسے اس کی داستان سن کر بڑا دکھ ہوا تھا۔ سینا نے بڑی سچائی سے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ بشارت کے ساتھ بھی کسی سب کچھ ہوا تھا۔ وہ شہنشاہ کی زندگی بسر کرنا چاہتا تھا لیکن اسے قدم قدم پر پھٹکیا گیا تھا۔ ہر گام پر ٹھوکریں ماری گئی تھیں۔ اس نے جرم و گناہ کی زندگی سے بچنے کے لئے بھوک جیسی اذیت برداشت کی تھی۔ تین تین دن تک فاقے کئے تھے لیکن پیٹ میں لگنے والی آگ آخر کار اسے استاد گنگو کے اڈے پر لے گئی تھی اور وہ اس دلدل میں دھنسا چلا گیا تھا۔ سینا ایک مرتبہ اس گندگی سے نکل آئی تھی اور اس سے دور رہنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اسے مجبور کیا جا رہا تھا کہ وہ دوبارہ ذلت و رسوائی کے اس راستے پر آجائے۔

”نہیں نہیں، اب ایسا نہیں ہو گا۔“ وہ بڑبڑایا۔

”کیا مجھ سے کچھ کہا؟“ سینا نے اس کی طرف دیکھا۔

”میں اب یہیں رہوں گا۔ تمہارے ساتھ۔“ بشارت نے جواب دیا۔

”کیا واقعی؟“ سینا کا چہرہ کھل اٹھا۔

”ہاں۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ وہ لوگ اپنے گھناؤنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہوئے پائیں گے۔ اس کے لئے خواہ مجھے اپنی جان کی بازی ہی کیوں نہ لگانا پڑے۔“ بشارت نے جواب دیا۔

”مجھے تمہاری بات کا یقین نہیں آ رہا۔“ سینا کے لہجے میں اب بھی بے یقینی کی کیفیت تھی۔

”یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔“ بشارت نے جواب دیا اور پھر سائیڈ میبل؛

رکے ہوئے ٹائم ہیں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میرا خیال ہے اب بہت باتیں ہو چکیں۔ کوئی ایک آدھ موضوع صبح کے لئے بھی چھوڑ دینا چاہئے۔ دھاتی بگ رہے ہیں۔ مجھے تو نیند آنے لگی ہے۔ مجھے کوئی جگہ بتا دو جس میں سو سکوں۔“

”جگہ؟“ سینا کی آنکھوں میں چمک سی ابر آئی۔ ”تم نے تو میرے دل میں جگہ پھیل ہے۔ یہ سارا گھر تمہارا ہے جس میں چاہے سو جاؤ۔ ویسے چاہو تو آبی بیڈ پر لیٹ جاؤ۔ میں دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہوں۔“

”نہیں۔ یہ تمہارا بیڈ ہے۔ میں دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہوں۔“ بشارت کہتے ہوئے اٹھ گیا۔ ”اور ہاں۔ میرے یہاں رہنے سے کسی کو کوئی شبہ تو نہیں ہو گا۔ میرا مطلب ہے محلے والے کوئی اعتراض نہیں کریں گے؟“

”کیوں؟“ محلے والے اعتراض کیوں کریں گے؟“ سینا بھی کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ”یہ میرا گھر ہے۔ یہاں کسی کے آنے پر پابندی نہیں لگائی جاسکتی۔ ویسے اس گلی کے سب ہی لوگ جانتے ہیں کہ میں کیا بڑبڑا کر رہی ہوں۔ میرے پاس صحن آتے رہتے ہیں۔ ویسے یہ لوگ مجھے اسمگر کہتے ہیں۔“

”اور اگر کسی نے میرے بارے میں خبری کر دی تو؟“ بشارت بولا۔

”کسی میں اتنی ہمت نہیں۔ سب مجھ سے ڈرتے ہیں۔“ سینا نے سہمکراتے ہوئے کہا۔ ”ویسے تمہیں پہچانا کون ہے۔ تمہاری کیا خبری کریں گے۔ پولیس والوں کو کیا بتائیں گے کہ تم کون ہو۔ فی الحال تو تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ویسے یہ بات تو میں بھی جانتی ہوں کہ برا وقت بتا کر نہیں آتا لیکن جب اب وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔ چلو۔ میں تمہیں کمرہ دکھا دوں آرام سے سو جاؤ۔“

وہ بشارت کے ساتھ اپنے کمرے سے باہر آگئی اور ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھول کر قریبی جلائی۔ یہ بھی بیڈ روم ہی تھا۔ بیڈ پر بے چین چادر پھی ہوئی تھی۔

”اب تم سو جاؤ۔ صبح باتیں ہو گی۔“ سینا کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔ بشارت کچھ دیر کھڑا دھڑا دھڑا دیکھتا رہا۔ پھر اس نے دروازہ کھینچ دیا اور جوئے اتار کر بستر پر گر گیا۔ وہ سوئے کی کوشش کرتے گا لیکن نیند غائب ہو گئی تھی۔ سینا کی باتیں اس کے دماغ پر چکھوے کے لگا رہی تھیں۔ کیا غریب اور بے سارا لوگوں کا کوئی راز نہیں ہوتا۔ ہر

فحص ان کی مجبوریوں سے قائمہ اٹھانے کی کوشش کیوں کرتا ہے۔ خود اس نے قدم قدم پر ٹھوکریں کھائی تھیں۔ کسی بھی موقع پر اسے سنبھلنے نہیں دیا گیا تھا اور سینما کے ساتھ جو کچھ تھا وہ عبرت انگیز تھا۔ اسے تو سینما چاہتے تھے لیکن وہ ہامبت لڑکی تھی۔ حالات کا مقابلہ کرتی رہی اور آج وہ زندگی کے اس دور پر پرکھتی تھی جس میں ایک طرف ذلت و رسوائی اور گناہوں کی دلدل تھی اور دوسری طرف وہ راستہ تھا جس پر کائنات بچے ہوئے تھے۔ اس نے اس کاٹنوں بھرے راستے پر چلنے کا فیصلہ کیا تھا اور اسے کسی ایسے ساتھی کی ضرورت تھی جو اس راستے پر اس کے ساتھ چل سکے اور بشارت نے اس راہ غار زار پر اس کے ساتھ چلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ حلاکت اس کے پیر چھلنی ہو گئے تھے لیکن سینما کی داستان نے اسے ایک نیا حوصلہ بخشا تھا۔

☆=====☆

بشارت یہ سب کچھ سوچتے ہوئے آخر کار نیند کی آغوش میں پہنچی ہی گیا۔ صبح اس کی آنکھ کھلی تو نوبت رہے تھے۔ وہ کچھ دیر بستر پر ہی پڑا اٹھتا رہا پھر اٹھ کر کمرے سے باہر آگیا۔ بکن کی طرف سے برتنوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا بکن کی طرف آگیا لیکن پھر دروازے ہی میں رک گیا۔ وہ سینما کی نوکرانی بی بی تھی۔

”سینما کہاں ہے؟“ بشارت نے پوچھا۔

”وہ تو سوہی ہے۔ تمہارے لئے چائے بناؤں بیٹا؟“ بی بی نے پوچھا۔

”ہاں بنا دو۔“ بشارت کہتے ہوئے ہال کمرے کی طرف آگیا اور سینئر نیپل پر رکھا ہوا اخبار اٹھا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس نے پیسے ہی اخبار کھولا، اچھل پڑا۔ پہلے ہی صفحے پر رنگ محل والے واقعے کی خبر نمایاں سرخی سے شائع ہوئی تھی اور اس کے ساتھ تصویریں بھی تھیں۔

بشارت وہ خبر پڑھتا چلا گیا۔ رپورٹر کی اطلاع کے مطابق رنگ محل میں سوہی پر قہر سے دینے والے چوہدری عمر سہاوی کار کا سینئر شہاب الدین بینک کے چار لاکھ ساٹھ ہزار کی رقم نکلا کر واپس آ رہا تھا اس کے ساتھ دو محافظ بھی تھے۔ شہاب الدین اپنے دفتر سے ابھی کچھ دور ہی تھا کہ دو راہزنوں نے اس پر حملہ کر دیا اور اس کے ہاتھ سے نوٹوں سے بھرا ہوا چرمی بریف کیس چھین کر بھاگنے کی کوشش کی۔ شہاب الدین کے محافظوں کی مداخلت سے

صورت حال عجیب ہو گئی۔ فائرنگ کے تبادلے میں دونوں محافظ موقع پر ہی ہلاک ہو گئے۔ ایک راہزن بھی گولیاں لگنے سے شدید زخمی ہوا جسے اسپتال پہنچا دیا گیا۔ اسے چار گولیاں لگی ہیں۔ اس کی زندگی بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ابھی تک زخمی راہزن کی شناخت نہیں ہو سکی تاہم اس کا دوسرا ساتھی رقم سے بھرا ہوا چرمی بیگ چھین کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ پولیس اس کی تلاش میں چھاپے مار رہی ہے لیکن ابھی تک اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

خبر پڑنے کے بعد بشارت تصویریں دیکھنے لگا۔ دونوں گن میمنوں اور شرکے کی تصویر کے علاوہ اس شخص کی تصویر بھی تھی جس سے رقم سے بھرا ہوا بیگ چھینا گیا تھا۔ وہ چوہدری عمر کا سینئر شہاب الدین تھا۔

بشارت اس اتفاق پر دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا کہ شہاب الدین سے نجیبی جانے والی رقم دراصل چوہدری عمر کی تھی۔ چوہدری عمر جس نے اس کے باپ کا مکان بچ دیا تھا اور جیل سے رہا ہونے کے بعد جب بشارت نے اس سے رقم کا مطالبہ کیا تھا تو چوہدری عمر نے اسے دھکے دے کر اپنے دفتر سے نکلا دیا تھا اور اب اتفاق سے ساڑھے چار لاکھ روپے کی رقم اس کے ہاتھ میں آگئی تھی۔

آخری صفحے پر ایک اور خبر دیکھ کر وہ ایک بار پھر اچھل پڑا۔ یہ خبر نسبت روڈ پر استاد گنگو کے اڈے پر رونما ہونے والے واقعے کے بارے میں تھی اور ذیلی سرخی میں اس کا نام بھی تھا۔

یہ خبر پولیس کے ذرائع سے شائع کی گئی تھی جس کے مطابق بدنام جیب تراش بشارت پولیس کو ایک اور عجیب جرم میں مطلوب تھا۔ گزشتہ رات نسبت روڈ پر استاد گنگو کے اڈے پر بشارت کی حوچوگی کی اطلاع پر اس کی گرفتاری کے لئے پولیس نے چھاپے مارا تو وہ فائرنگ کرتا ہوا فرار ہو گیا۔ فراہ ہوتے ہوئے اس نے ڈنوں پر موجود اپنے ایک ساتھی کو بھی گولی مار کر ہلاک کر دیا جس کے بارے میں اسے شبہ تھا کہ پولیس کو اس نے اطلاع دی تھی۔ پولیس نے پورے علاقے کی ناکہ بند کر لی لیکن بشارت فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

یہ خبر پڑھ کر بشارت کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اس کے دماغ میں دھماکے سے

”تمہارا وہ ساتھی ابھی زندہ ہے اور.....“

”ہم بعد میں بات کریں گے۔“ بشارت کہتے ہوئے ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔ ”تم تیار

ہو کر باہر آ جاؤ۔ میں ہال میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“

سینٹ کو اس کے اس طرح اچانک اٹھ جانے پر بڑی حیرت ہوئی۔ بشارت نے باہر جاتے ہوئے بھی مڑ کر اس کی طرف دیکھا تھا اور پھر ساری بات سینٹ کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے نظریں جھکا کر اپنے آپ کو دیکھا اور اٹھ کر ہاتھ روم میں چلی گئی۔

تقریباً بیس منٹ بعد وہ لباس تبدیل کر کے ہال میں آئی تو بشارت صوفے پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ سینٹ سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ اندر سے اخبار اٹھا لائی تھی۔ بی بی نے اس کے سامنے بھی گرم گرم چائے کا کپ رکھ دیا اور کچن میں چلی گئی۔

”تم نے دونوں خبریں.....“

”چائے پیو۔“ سینٹ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”ہم کمرے میں چل کر بات کریں گے۔“ اس نے گردن گھما کر کچن کی طرف بھی دیکھا تھا۔

”کیا یہ عورت قاتل احمقہ نہیں؟“ بشارت نے دم دم لے کر اس کے سامنے ہونے لگی۔

”قتل احمقہ ہے لیکن تمہارے بارے میں ابھی وہ کچھ نہیں جانتی۔“ سینٹ نے جواب دیا۔ ”لیکن ہرجا، ہمیں احتیاط کا دامن تو ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔“

وہ دونوں اٹھ کر سینٹ والے کمرے میں آ گئے۔ سینٹ خود تو بیڈ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی اور بشارت سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

”تو تمہیں اندازہ ہو گیا کہ ہمارے ہاں کی پولیس کس طرح کام کرتی ہے۔“ سینٹ نے چائے کی چٹکی لیتے ہوئے کہا۔

”اس کا تجربہ تو مجھے اس دن ہو گیا تھا جب غلّے بھرے گاڑا میں میری بہن کو اٹھا کر لے جا رہے تھے اور پولیس نے مجھے جب ترائی کے الزام میں سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا تھا۔“ بشارت نے جواب دیا۔ ”میں نے تو جیل میں رہتے ہوئے بھی بڑی شرافت کا ثبوت دیا تھا لیکن قدم قدم پر مجھے گندگی میں گھیننے کی کوشش کی جاتی رہی اور جیل سے

ہونے لگے۔ جانو چاہا پولیس کی گولی سے ہلاک ہوا تھا اور اس کا قتل بشارت کے کھاتے میں ڈال دیا گیا تھا۔ اخبار اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا سینٹ کے کمرے کے سامنے پہنچ گیا۔ دروازہ بھڑا ہوا تھا اس نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا لیکن یہاں قدم اٹھاتے ہی ٹھٹک کر گر گیا۔

سینٹ بیڈ پر آڑی ترچھی پڑی سو رہی تھی۔ اس نے شب خرابی کا باریک لباس پہن رکھا تھا جو ٹانگوں پر سے اوپر تک سمٹا ہوا تھا۔ وہ واپس مڑنا چاہتا تھا کہ سینٹ نے کڑوٹ بدلی اور ساتھ ہی آنکھیں کھول دیں۔ بشارت کو دیکھ کر وہ اٹھ گئی۔ اس نے ٹانگیں سمیٹ کر لمبی قسم کا شب خرابی کا لباس پہنے کھینچ لیا۔

”کیا بات ہے، اتنا بدحواس کیوں ہو رہے ہو؟“ سینٹ نے ٹکڑے ہوئے بالوں کو درست کرتے ہوئے کہا۔ ”بیٹھ جاؤ۔ کھڑے کیوں ہو؟“

”یہ..... یہ خبر پڑھو اسے۔“ بشارت نے اخبار اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ صفحہ اوپر تھا جس پر اس کے حوالے سے خبر چھپی تھی۔

وہ خبر پڑھ کر سینٹ پر ہنسنوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

”میں نے تم سے کیا کہا تھا۔“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”قانون کے لحاظ سے کسی کو قتل بھی کر دیں تو ان پر کوئی گرفت نہیں ہوتی۔ انہیں اپنے پکڑے جانے کا کوئی خوف نہیں ہوگا۔ وہ تو قانون کی بلاستی قائم رکھنے کے لئے گولی چلاتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں کوئی بے گناہ بھی مارا جائے تو اس کا الزام کسی اور بے گناہ کے سر قحوظ دینا ان کے لئے ذرا بھی مشکل نہیں ہوگا۔ یہی بات میں نے کل رات بھی کسی تھی اور اس خبر سے ثابت بھی ہو گیا ہے کہ میں نے جو کہا تھا وہ غلط نہیں تھا۔“

”اور..... اور یہ دوسری خبر بھی پڑھو۔“ بشارت نے اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا

اخبار پلٹ دیا۔

سینٹ اخبار دیکھ رہی تھی اور بشارت سینٹ کو۔ اس کا لباس بہت باریک تھا جس سے اس کا جسم جھٹک رہا تھا۔ بشارت نے کسی عورت کو ایسے لباس میں دیکھنے سے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی اور تنہا سے رہا ہوئے لگے۔ سینٹ نے خبر پڑھنے کے بعد اخبار ایک طرف رکھ دیا۔

کے چھاپے کے دوران میں اپنے ایک ساتھی کو گولی مار کر فرار ہو گئے تھے۔  
 ”لیکن جانو چاچا کو میں نے گولی نہیں ماری تھی۔“ بشارت جلدی سے بولا۔  
 ”میں کب کہتی ہوں کہ جانو چاچا کو تم نے ہی قتل کیا تھا مگر پولیس نے وہ جرم تمہارے کھاتے میں تو ڈال دیا ہے نہ۔“ سنیتا نے کہہ۔  
 ”میرا تو دماغ گھوم رہا ہے۔ کچھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ یہ سب کیا ہے۔“ بشارت نے کہہ۔ اس کے لہجے میں بے بسی تھی۔

”اس سے پہلے کہ وقت گزر جائے تمہیں ایسی باتوں کو سمجھ لینا چاہئے۔“ سنیتا نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہہ۔ ”ابھی تو کھیل شروع ہوا ہے اور ایسے کھیل جلدی ختم نہیں ہوا کرتے۔ بڑی لمبی بازیاں چلتی ہیں اور جیت اس کی ہوتی ہے جو کھیل کو سمجھتا ہو۔ چال چٹا جاتا ہو۔ تمہیں اہل کھیل کو سمجھنا ہو گا۔ چالیس سیکنڈ ہوں گی۔ اگر تم ذہانت کا مظاہرہ نہیں کرو گے تو پہلی ہی بازی میں مات کھا جاؤ گے اور پھر یا تو تم زندگی بھر جیل میں سڑتے رہو گے یا تمہاری زندگی کے سفر کا اختتام چھائی کے تختے پر ہو گا۔“  
 ”میں..... میں پاگل ہو جاؤں گا۔“ بشارت نے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔  
 ”میں نے تو سچا بھی نہیں تھا کہ صورت حال اس قدر سنگین ہو جائے گی۔“

اور ویسے یہ حقیقت تھی۔ وہ لڑائی بھڑائی سے پیشہ دور رہا تھا۔ بچپن میں بھی پیشہ گلی کے لڑکوں سے پٹ کر آتا تھا اس نے کبھی کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ گورنمنٹ اسکول میں داخلہ لیا تھا تو وہیں بھی لڑکوں سے بچتا رہتا تھا۔ جیل میں بھی وہ قیدی لڑکوں کی سرگرمیوں سے دور ہی رہتا تھا اس نے کبھی چوٹی تک نہیں ماری تھی اور کل رنگ محل میں اپنے دوست شرے کو بچانے گیا تھا تو اس کے ہاتھوں دو آدمی مارے گئے تھے، لیکن اب سے ایک گھنٹہ پہلے تک اسے بالکل ادراک نہیں ہو سکا تھا کہ وہ کیا کر چکا ہے۔ اخبار کی خبروں اور سنیتا کی باتوں نے اسے مجبوراً ذکر رکھ دیا تھا۔ اس نے جانو چاچا کو نہیں مارا تھا لیکن پولیس نے یہ تیسرا قتل بھی اس کے کھاتے میں ڈال دیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بے گناہ ثابت نہیں کر سکتا تھا۔ اب اس کے سامنے دو ہی راستے تھے کہ اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دے یا اپنے آپ کو بچانے کے لئے زندگی بھر بھاگتا رہے۔ اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کرنے کا مطلب یہ ہوتا کہ اس میں اب حوصلہ نہیں رہا تھا۔ ہار مان لی

باہر نکلنے کے بعد بھی پولیس ہی مجھے گھیرنے کی کوشش کرتی رہی۔ مجھے جرائم کی راہ پر دھکیلنے میں پولیس کا بھی بہت ہاتھ ہے لیکن بہرحال، کل کے واقعہ سے پہلے میں جب تراش تھا۔ جیب تراش۔ کبھی کبھار پولیس مجھے کسی اور چھوٹی موٹی واردات میں بچانے کی کوشش کرتی تھی۔ ان کا مقصد کچھ نذرانہ وصول کرنا ہوتا تھا۔ مٹی گرم ہو جانے کے بعد وہ وقتی طور پر مجھے بھول جاتے تھے لیکن یہ..... یہ مجھ پر قتل کا الزام..... یہ سراسر جھوٹ ہے۔ ظلم ہے.....“

”پولیس والے کسی بھی جھوٹ کو ج ثابت کر دکھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔“ سنیتا نے کہہ۔ ”اگر تم پولیس کے ہاتھ لگ جاؤ تو وہ تم سے نہ صرف جانو چاچا کے قتل بلکہ اور بھی بہت سے سنگین جرائم کا اعتراف کرالیں گے اور عدالت میں تمہارے خلاف چار چرے جھوٹے گواہ بھی پیش کر دیں گے۔“

”لیکن میں نے ایسا کوئی سنگین جرم نہیں کیا۔“ بشارت نے کہہ۔  
 ”نہیں کیا ہو گا۔“ سنیتا بولی۔ ”رنگ محل میں جو کچھ ہوا تھا وہ سب میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہیں تین قتل ہوئے تھے۔ تمہارا دوست ایک محافظ کے ہاتھوں مارا گیا تھا اور دونوں محافظ تمہارے ہاتھوں جنم واصل ہوئے تھے۔ وہ شاید سنگین جرم نہیں تھا۔“

”وہ..... وہ تو میں نے اپنے دفاع میں گولی چلائی تھی۔ اگر ایسا نہ کرتا تو وہ مجھے مار دیتے۔“ بشارت نے کہہ۔

”بہت بھولے ہو۔“ سنیتا مسکرا دی۔ ”تمہارے ساتھ اتنا کچھ ہو چکا ہے اور یہ بات ابھی تک تمہاری سمجھ میں نہیں آ سکی کہ یہاں اپنا دفاع کرنا بھی سنگین جرم ہے۔ کل رنگ محل والے واقعے میں دو آدمی تمہارے ہاتھوں مارے گئے تھے اور قتل آخر قتل ہی ہوتا ہے۔ اور پھر دہرا قتل۔ جس کی سزا موت سے کم نہیں ہو سکتی اور اب تو تیسرا قتل بھی تمہارے کھاتے میں ڈال دیا گیا ہے۔ بارہ گھنٹوں کے اندر اندر تین قتل۔ ایسے آدمی کو تو کسی صورت بھی معاف نہیں کیا جاسکتا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ”رنگ محل والے واقعے میں تم ابھی تک پولیس کے لئے مظلوم ہو لیکن وہ بہت جلد پتا چلا لیں گے کہ تم وہی بشارت ہو جو رات کو نسبت رڈ پر پولیس

تھی۔ گرفتاری دینے کی صورت میں پولیس اس کا جو حشر کرتی اس کا تصور کر کے وہ کانپ اٹھ پولیس نہ جانے اس سے مزید ایسے کتنے جرائم کا اعتراف کرائے گی جن کے بارے میں وہ کچھ جانتا بھی نہیں ہو گا۔ وہ عدالت میں بھی اپنے آپ کو بے گناہ ثابت نہیں کر سکے گا۔

اس نے کسی اخبار یا رسالے میں پڑھا تھا کہ جب انسان دولت کو دے تو کچھ نہیں کوٹ۔ اگر حوصلہ کو دے تو بہت کچھ کوٹتا ہے۔ آبرو چلی جائے تو قریب قریب سب کچھ کوٹتا ہے لیکن روح مر جائے تو سب کچھ مٹ جاتا ہے۔

یہ الفاظ بشارت کے ذہن میں گونج ہی پیدا کرنے لگے۔ اس کی آبرو اس کی بہن تھی جسے غصے اٹھا کر لے گئے تھے۔ وہ ترپ کر رہ گیا۔ اس کی روح کو اب تک کھلا جاتا رہا تھا۔ روح زخموں سے پُور پُور تھی لیکن مری نہیں تھی۔ اس نے حوصلہ نہیں ہارا تھا۔ سب کچھ کو دینے کے بعد بھی اس نے اپنے آپ کو اپنے ہیروں پر کھڑا رکھا تھا اور اب حوصلہ ہار جانے کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ سب کچھ ہار جائے گا۔ اپنی زندگی بھی ہار جائے گا۔

”نہیں..... ایسا نہیں ہو گا۔“ وہ سر جھٹکنے لگا۔ اس نے سنیا کی طرف دیکھا جو ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”کیا ہوا؟“ اس نے پوچھا۔

”کُلک..... کچھ نہیں۔“ بشارت نے جواب دیا۔ ”میں اب بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ کل رات میرے بارے میں پولیس کو اطلاع کس نے دی تھی۔“

”تم نے شاید وہ خبر پوری توجہ سے نہیں پڑھی۔“ سنیا نے کُلک ”اس رپورٹ کے مطابق بشارت پولیس کو ایک سنگین جرم میں مطلوب تھا۔ استاد گنگو کے اڈے پر اس کی موجودگی کی اطلاع پاکر پولیس نے چھاپہ مارا تھا مگر وہ اپنے ایک ساتھی کو قتل کر کے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔“

”تمہارے ذہن میں کوئی خاص بات ہے؟“ بشارت نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”کسی سنگین جرم میں تمہارا مطلوب ہونا۔“ سنیا نے جواب دیا۔ ”تم کہتے ہو کہ تم نے جیب تراشی کے علاوہ اور کبھی کوئی ایسا سنگین جرم نہیں کیا لیکن کل دوپہر سے پہلے

تمہارے ہاتھوں دو ہندسے بارے گئے تھے۔“

”میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔“ بشارت نے جواب دیا۔ ”میں پولیس کے آنے سے پہلے ہی وہاں سے بھاگ نکلا تھا۔ فائرنگ شروع ہوئی لوگ ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ ایک دم سنا جھپٹا گیا تھا۔ یہ سب کچھ آنا تھا ہوا تھا۔ کسی راہ گیر نے میری شکل دیکھی بھی ہو گی تو وہ یہ نہیں جانتا ہو گا کہ میں کون ہوں۔ شرکے کے بارے میں اس وقت کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن اخبار کی اطلاع کے مطابق وہ کل رات تنگ ہوش میں نہیں آسکا تھا۔ اس لئے یہ بات بھی نہیں سوچی جاسکتی کہ پولیس کو اس نے میرے بارے میں بتایا ہو گا۔ دیے شرکے کو میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ وہ ہوش میں ہوتا بھی تو زبان نہ کھولتا۔“

”یہی بات میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں۔“ سنیا نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کُلک ”تم پولیس کے طریقہ کار سے واقف نہیں ہو۔ ہو سکتا ہے کہ شرما ہوش میں آگیا ہو اور پریس سے یہ بات چھپائی گئی ہو۔ جب کوئی زندگی اور موت کے دروازے پر کھڑا ہو تو وہ زندگی کی طرف جانے والا راستہ اپناتا چاہے گا۔“

”کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ میرے بارے میں پولیس کو شرکے نے بتایا ہو گا۔“ بشارت اسے گھورنے لگا۔

”زندگی ہر ایک کو پیاری ہوتی ہے۔“ سنیا بولی۔ ”شرکے کو چار گولیاں ملی تھیں۔ ڈاکٹر اسے پچھلے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے۔ ہو سکتا ہے وہ ہوش میں آگیا ہو اور پولیس نے اسے ترغیب دی ہو کہ اگر وہ اپنے ساتھی کے بارے میں بتا دے تو اسے بچایا جائے گا اور زندگی کی امید پر اس نے تمہارا نام بتا دیا ہو۔“

”نہیں۔“ بشارت نے کُلک ”میں کئی سال سے شرکے کے ساتھ ہوں۔ اسے اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ مجھے اگرچہ جرائم کی دنیا میں لانے والا وہی تھا لیکن ہمارے درمیان دوستی کا ایک ایسا رشتہ قائم ہو گیا تھا کہ ہم ایک دوسرے کے لئے اپنی جان بھی دے سکتے تھے۔ نہیں سنیا۔ شرما ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ مرنا قبول کر لے گا مگر میرا نام اس کی زبان پر نہیں آئے گا۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ میں صرف اور صرف اسے بچانے کے لئے اس معاملے میں کودا تھا وہ..... وہ.....“

”ٹھیک ہے۔“ سنیا نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”اگر تمہیں شرکے پر شبہ نہیں ہے

تو پھر یہ معلوم کرنا پڑے گا کہ پولیس کو اطلاع دینے والا کون تھا لیکن.....

”لیکن کیا؟“ بشارت نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر

”چند روز تو تم گھر سے باہر نہیں نکلو گے۔“ سنیتا نے کہا۔ ”ابھی محلہ گرم ہے۔“

پولیس تمہاری تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہو گی۔ کل تم نے باہر جا کر بہت سنگین غلطی کی تھی۔ قسمت ابھی تھی کہ بچ نکلے۔ اب تم ایسی کوئی غلطی نہیں کرو گے۔“

بشارت کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دنگ ہوئی۔ سنیتا نے کمرے میں آتے ہوئے دروازہ میسر دیا تھا تاکہ ملازمہ ان کی باتیں نہ سن سکے۔

”آ جاؤ بی بی۔ دروازہ کھلا ہے۔“ سنیتا نے کہا۔

دروازہ کھل گیا۔ بی بی نے وہیں کمرے کمرے کیا۔ ”بائیں لگاؤں سنیتا بی بی۔“

”ہاں بی بی۔ تم ناشتہ لگاؤ۔ ہم آ رہے ہیں۔“ سنیتا نے جواب دیا۔ اور بی بی واپس چلی گئی۔

”تمہیں شکر ہے پر اتنا ہی بخور ہے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ میرے ذہن میں ایک اور تجویز تھی۔“ سنیتا نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

”کیا؟“ بشارت نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر

”ہو سکتا ہے کہ شکر ابھی تک واقعی ہوش میں نہ آیا ہو اور پولیس نے کبھی اور چکر میں تمہارے نسبت روڈ والے اڈے پر چھاپے مارا ہو۔“ سنیتا نے ایک پر اٹھا اپنی پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”شکر! جب بھی ہوش میں آئے گا پولیس اس سے تمہارے بارے میں ضرور پوچھے گی۔ کچھ نفیاتی حربے بھی استعمال کئے جائیں گے۔ شکر! ذہنی طور پر بھی اس پوزیشن میں نہیں ہو گا کہ اپنا دفاع کر سکے۔ اس لئے میرے خیال میں اس کی زبان کھولنے سے پہلے ہی.....“

”کیا..... کیا کہنا چاہتی ہو؟“ بشارت نے اسے گھورا۔

”اسے پیش کے لئے خاموش کر دیا جائے۔“ سنیتا نے کہا۔

نوالہ بشارت کے ہاتھ سے چھوٹ کر پلیٹ میں گر گیا۔ وہ عجیب سی نظروں سے سنیتا کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ سنیتا نے یہ بات کی تھی۔

”نہیں سنیتا۔“ وہ مگر اسانس لیتے ہوئے بولا۔ ”میں ایسا نہیں کر سکتا وہ میرا دوست

ہے اور میں اسے.....“

”دیکھو بشارت۔“ سنیتا نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”زندگی اور موت کا کھیل بڑا دلچسپ اور سنسنی خیز ہوتا ہے۔ ہر شخص زندہ رہنا چاہتا ہے۔ کسی دوست کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دی جا سکتی ہے لیکن جان کی قربانی کوئی نہیں دیتا۔ اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لئے بعض اوقات دوسرے کی زندگی جھینپی پڑتی ہے۔ اس سے پہلے کہ شکر تمہاری زندگی کا سودا کرے، تم اسے.....“

”یہ نہیں ہو سکتا۔“ بشارت نے اس کی بات قطع کر دی۔ ”اگر تم اس بات سے خوفزدہ ہو کہ شکر اپنی بات کو پولیس کو میرے بارے میں بتا دے گا اور پولیس مجھے تلاش کرتی ہوئی یہاں بھی پہنچ جائے گی تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ میرے جانے کے بعد تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔“

”مجھے کوئی خوف نہیں ہے۔“ سنیتا نے جواب دیا۔ ”اگر ڈر خوف ہوتا تو تمہیں پولیس کے گھیرے سے نکال کر یہاں نہ لاتی۔“

”تو پھر..... تم مجھے میرے دوست کو قتل کرنے پر کیوں اکسار رہی ہو؟“ بشارت نے اسے گھورا۔

”میں تمہیں کسی کے قتل پر نہیں اکسار رہی۔“ سنیتا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں تو صرف یہ دیکھ رہی تھی کہ تم قتل داری میں کس حد تک جا سکتے ہو۔ تم نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر دوست کو بچانے کی کوشش کی تھی اور اب کسی ممکنہ خطرے کے باوجود تمہیں اپنے دوست کی زندگی خود سے زیادہ عزیز ہے۔ وقایعہ کے لئے تم کسی حد کے پابند نہیں ہو سکتے۔“

بشارت کے منہ سے بے اختیار مگر اسانس نکل گیا۔ وہ کچھ کہنے کی بجائے خاموشی سے اسے گھورتا رہا۔

”مجھے خوشی ہے کہ تم جیسا دوست مل گیا۔“ سنیتا نے کہا۔ ”ناشتہ کرو۔ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“

بشارت سر جھکا کر ناشتہ کرنے لگا۔ ناشتہ کے بعد سنیتا نے اپنے ہاتھ سے چائے بنائی اور وہ دونوں باہر آ کر برآمدے میں بھیجی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

”آج کا سارا دن میں نے معلومات حاصل کرنے کے لئے بھاگ دوڑ میں گزارا ہے۔ بہت تھک گئی ہوں۔“ سینا کہتے ہوئے برآمدے میں ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر واقعی تھکن کے آثار نمایاں تھے۔ ”تمہارا دن کیسے گزرا؟“

”میں تو تمہارے جانے کے بعد سو گیا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹہ پہلے لی بی نے جگایا تھا۔“

بشارت نے جواب دیا۔ ”میں ابھی بچن میں جانے والا تھا چائے بنانے کے لئے“ پھر سوچا تمہارا انتظار کیا جائے۔“

”میں نے بھی ابھی چائے نہیں پی۔ تم بیٹھو۔ میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔ پھر طہینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔“ سینا کہتے ہوئے اٹھ کر اندر چلی گئی۔

بشارت وہیں بیٹھنا صورت حال کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا۔ سینا تقریباً آدھے گھنٹے بعد چائے بنا کر لائی تھی۔ اس نے دونوں کپ سانے چھوٹی میز پر رکھ دیئے۔

”میں شکرے کے بارے میں جاننے کے لئے بے چین ہو رہا ہوں۔“ بشارت نے اپنا چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے سینا کی طرف دیکھا۔

”میں آج صبح سب سے پہلے ہسپتال ہی گئی تھی۔“ سینا نے بھی اپنا کپ اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔ ”شکرا ابھی آپریشن صغیر ہی میں ہے۔ اس کے جسم سے تین گولیاں نکالی جا چکی ہیں۔ ایک ٹانگ سے اور دو پشت سے۔ ایک گولی ریڑھ کی ہڈی کے قریب لگی ہے۔ ابھی اس کے لئے آپریشن ہونا پاقی ہے۔ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے ڈاکٹر بھی خاصے محتاط ہیں۔ شکر ہوش میں آتا ہے اور پھر کمر میں چلا جاتا ہے۔ آخری گولی نکالنے کے لئے آج رات آپریشن ہو گا۔ شکرے کی حالت دیکھ کر ڈاکٹر خاصے پُر امید ہیں۔ اسے بچایا جائے گا۔“

”اور کیا تمہارے خیال میں جب اسے ہوش آیا تھا تو اس نے پولیس کو میرا نام بتا دیا ہو گا۔“ بشارت نے کہا۔

”نہیں۔ اسے آہر رویشن میں رکھا ہوا ہے۔ کسی کو اس کے قریب جانے کی اجازت نہیں۔ پولیس کو بھی اس سے دور ہی رکھا گیا ہے۔ اگر آج رات اس کا آخری آپریشن کامیاب ہو بھی گیا تو کم از کم ایک ہفتے تک پولیس کو اس کا بیان لینے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔“ سینا نے بتایا۔

”اب یہ طے ہے کہ چند روز تک میرے لئے گھر سے باہر نکلتا خطرے سے خالی نہیں۔“ بشارت نے کہا۔ ”لیکن یہ جانتا بھی ضروری ہے کہ پولیس کی سرگرمیاں کیا ہیں اور شکر کس حال میں ہے۔“

”تم طہینان رکھو۔ میں یہ سب معلوم کر لوں گی۔“ سینا نے جواب دیا۔

لی بی بازار سے سودا لے کر آگئی تھی۔ اس نے نوکری اندر میز پر رکھ دی اور ناشتے کے جھوٹے برتن دھونے کے بعد گھر کی صفائی وغیرہ کرنے لگی۔

ایک گھنٹے بعد سینا تیار ہو کر چلی گئی۔ بشارت اس کے کمرے میں آگیا۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل کے فچلے خانے میں خواتین کے کچھ پرانے ڈائجسٹ اور جاسوسی ناول پڑے ہوئے تھے۔ جرائم پیشہ گروہ میں ہونے کے باوجود وہ کچھ نہ کچھ ڈھتا رہتا تھا۔ اسٹوکنگو کے اڈے پر تو اس نے انٹر کے کورس کی کتابیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ وہ کسی امتحان میں شریک نہیں ہو سکتا تھا لیکن اس نے اپنے طور پر تعلیم جاری رکھی تھی اور دوسری کتب وغیرہ کا مطالعہ بھی کرتا رہتا تھا۔

وہ جاسوسی ناول خاصا دلچسپ تھا وہ اسے ایک ہی نشست میں پڑھ لینا چاہتا تھا لیکن نیند کے بوجھ سے اس کی پلکیں جھپکے پلکیں اٹھ رہی تھیں اور وہ پڑھتے پڑھتے سو گیا۔

☆=====☆

”تمہارے لئے ایک دلچسپ اطلاع ہے۔“ سینا نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ اس وقت شام کے سات بج رہے تھے۔ آج لی بی تقریباً چھ بجے کے قریب گئی تھی۔ سینا اس وقت تک نہیں آئی تھی اور لی بی نے جانے سے پہلے بشارت کو جگا دیا تھا اور اب سینا کے آنے پر دروازہ بشارت ہی نے کھولا تھا۔ سینا نے کار برآمدے کے سامنے روکی تھی اور جب بشارت باہر کا گیٹ بند کر کے آیا تو سینا کار سے اتر رہی تھی۔

”وہ اطلاع یقیناً دلچسپ ہو گی اور مستثنیٰ خیر بھی۔“ بشارت نے جواب دیا۔ ”اس لئے کہ فی الوقت صورت حال ہی ایسی ہے کہ کوئی خبر دلچسپی سے خالی نہیں ہو سکتی۔ تو وہ دلچسپ اطلاع کیا ہے؟“

”تمہارا دوست شکر زندہ ہے۔“ سینا نے جواب دیا۔

”کیا واقعی؟“ بشارت اچھل پڑا۔

چاہتا تھا۔ اس نے سائے آٹھ بجے کے قریب وہاں چھاپہ مارا تھا۔ مقامی تھانے کو اس کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ تم اس وقت شکرے کے اڈے پر موجود نہیں تھے وہ دو اور لڑکوں کو پکڑ کر لے گیا اور مارپیٹ کر تمہارے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ تم نوپچے کے قریب آتے ہو۔

”اس اے ایس آئی نے لڑکوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیا اور اپنے آدمیوں کے ساتھ تمہارا انتظار کرتا رہا۔ وہ تمہیں پچھاتا تو نہیں تھا لیکن جب تم اڈے میں داخل ہوئے تو نوپچے کے لگ بھگ کا وقت تھا۔ اس نے اڈے پر چڑھائی کر دی اور پھر وہاں جو کچھ ہوا تمہارے ساتھ ہوا لیکن ایک بات جو تمہیں معلوم نہیں وہ یہ ہے کہ آج سہ پہر اس اے ایس آئی اور اچھی چھاپہ مار ٹیم میں شامل تمام اہلکاروں کو معطل کر کے حراست میں لے لیا گیا ہے۔“

”کیا.....؟“ بشارت اچھل پڑا۔

”کل رات پولیس کو جو خبر جاری کی گئی تھی اس میں یہی بتایا گیا تھا کہ تم اپنے ایک ساتھی کو قتل کر کے فرار ہو گئے تھے۔“ سنیتا نے کلمہ ”لیکن آج صبح جو کچھ بھی ہوا وہ بالکل خلاف توقع تھا۔ ساری بات مقامی پولیس اسٹیشن کے انتہارج پر آ رہی تھی۔ قتل اس کے علاقے میں ہوا تھا۔ اس نے چھاپہ مار پارٹی کے ایک بندے کو اسٹاک میں لے کر اور کچھ لالچ دے کر پوچھا تو اس نے اصل بات بتادی کہ جانو چاہا اسے ایس آئی کے ہاتھوں مارا گیا تھا اور پھر لالاش کے پوسٹ مارٹم سے بھی یہ بات ثابت ہو گئی۔ جسم سے برآمد ہونے والی گولی اسے ایس آئی کے ہتھوڑے سے چلائی گئی تھی۔ انسپکٹر نے رپورٹ اپنے سینئر کو دے دی۔ بات ڈی آئی جی تک پہنچ گئی اور ڈی آئی جی کے حکم پر آج سہ پہر اسے ایس آئی اور اس کے ساتھیوں کو معطل کر کے حراست میں لے لیا گیا۔ مزید تحقیقات ہو گی اور اس اے ایس آئی پر قتل کا مقدمہ چلے گا۔“

”اوہ۔“ بشارت کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ ”لیکن میرا نام..... وہ تو بہر حال پولیس تک پہنچ گیا ہے۔“

”پولیس افسران کی مشینک میں یہ بات بھی زیر غور آئی تھی۔“ سنیتا نے جواب دیا۔ ”شکرے نے نیم بد ہوشی کی کیفیت میں بیڑا نہ والے انداز میں تمہارا نام لیا تھا۔ وہ اس

”تو پھر میرے بارے میں.....“

”شکرے ہی نے بتایا تھا۔“ سنیتا نے سہماتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔

”میں سمجھا نہیں۔“ بشارت کی آنکھوں میں الجھن تیر گئی۔

”یہ سب کچھ معلوم کرنے کے لئے مجھے بڑے پاز پیلے پڑے تھے۔“ سنیتا۔

جواب دیا۔ ”مختلف ذرائع سے معلومات حاصل کرتے ہوئے میں نے ان نرسوں میں سے ایک نرس کو تلاش کر لیا جو اس وقت آپریشن ٹیم میں تھی جب شکرے کو وہاں لایا گیا تھا۔“ سنیتا چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ”ان نرس کے کہنے کے مطابق آپریشن ٹیم میں لائے جانے کے بعد شکرہ چند منٹ کے ہوش میں آیا تھا مگر اس کے حواس قابو میں نہیں تھے۔ وہ زیر لب بیز رہا تھا۔ غور سے سننے پر پتہ چلا کہ وہ نیم بے ہوشی میں تمہارا نام لے رہا تھا۔ ایک ڈاکٹر سے غلطی یہ ہو کہ اس نے آپریشن ٹیم کے باہر موجود پولیس آفیسر کو بتا دیا اور کہا کہ بشارت اگر مرلیہ کا بھائی یا قریبی عزیز ہے تو اسے تلاش کر کے لایا جائے۔ اس کی موجودگی مریض کے مفید ثابت ہو سکتی ہے لیکن گھاگ پولیس آفیسر نے اس کا کچھ اور نتیجہ اخذ کیا کہ بشارت اس کا وہ ساتھی تھا جو چلے داردار سے فرار ہو گیا تھا۔“

”مہوں۔ تو اس طرح پولیس تک میرا نام پہنچ گیا۔“ بشارت بولا۔

”تمہیں ایک اور دلچسپی کی بات بتاؤں۔“ سنیتا سہماتی۔ ”وہ پولیس آفیسر ایک ایس آئی تھا۔ اس نے دن بھر کی بھاگ دوڑ کے بعد یہ معلوم کر لیا کہ شکرہ جب تڑا ہے اس نے شکرے کے اڈے کا پتہ چلا لیا اور یہ بھی معلوم کر لیا کہ بشارت یعنی تم ہی وہیں رہتے ہو۔ اس پولیس آفیسر کا خیال تھا کہ اگر وہ تمہیں گرفتار کر لے تو اسے تو سب انسپکٹر کے عہدے پر ترقی مل جائے گی۔“

”واردات رنگ محل کے علاقے میں ہوئی تھی۔ اس اے ایس آئی کا تعلق بھی ا تھانے سے تھا جبکہ شکرے کا اڈہ نسبت روڈ پر واقع ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ایک علاقے پولیس جب کسی دوسرے علاقے میں چھاپہ مارتی ہے تو پہلے اس علاقے کے تھانے کو مد کیا جاتا ہے اور کارروائی کے لئے وہاں کی نفری بھی ساتھ لی جاتی ہے لیکن اس اے ایس آئی کے ذہن میں کچھ اور تھا۔ وہ تمہیں اپنے طور پر گرفتار کر کے پردوشن حاصل



تیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ نام شکرے کے بھائی یا کسی قریبی عزیز یا دوست کا  
نے وہ جاگتی کی کیفیت میں یاد کر رہا تھا۔ کوئی حقیقی نتیجہ اس وقت اخذ کیا جائے گا جب  
پوری طرح ہوش میں آنے کے بعد بیان دے گا لیکن کم از کم ایک ہفتے تک ڈاکٹر پول  
کو اس کے قریب نہیں بٹکنے دیں گے۔

”اس کا مطلب ہے کہ ایک ہفتے تک مجھے کوئی غلو نہیں ہے۔“ بشارت نے کہا  
”اب ایسی بھی اندھی نہیں لگ رہی۔“ سینا نے کہا۔ ”پولیس۔ تمہیں بالکل عو  
نظر انداز نہیں کرے گی۔ ہو سکتا ہے غیہ طور پر تمہارے بارے میں معلومات حاصل  
کرنے کی کوشش کی جا رہی ہو۔ اس لئے چند روز تک تم گھر سے باہر نہیں نکلو گے۔“  
”ایک اور بات پر مجھے حیرت ہے۔“ بشارت نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا  
”تم نے اتنی معلومات کیسے حاصل کر لیں۔ اپنا سب سے بھی اور پولیس سے بھی۔“  
”مچے میں بڑی طاقت ہے۔“ سینا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”اور ایسا  
کرنے والی مجھ جیسی ہو تو کافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

بشارت اسے گھور کر رہ گیا۔

”کیا تمہارے خیال میں ہوش میں آنے کے بعد شکرہ تمہارے خلاف بیان دے  
دے گا؟“ سینا نے چائے کی چمکی لیتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔  
”وہ ایسا نہیں کرے گا۔“ بشارت کے لیے میں بھرپور اعتماد تھا۔ ”شکرہ دوستی  
سمجھتا ہے اور اس مقدس رشتے پر حرف نہیں آنے دے گا۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ سینا بولی۔

اس وقت اندھرا چھا گیا تھا۔ برآمدے کی عقی نہیں چلائی تھی۔ مچن میں پودوں  
مکان کے پچھلی طرف کتاب کی وجہ سے چھجڑی کی بسات تھی اور چھبڑی بید روی  
ان دونوں کا خون چوس رہے تھے۔ وہ اٹھ کر اندر آ گئے۔ بشارت تو بال میں صوفے پر  
گیا اور سینا اپنے کمرے میں چلی گئی۔

وہ پلن کھتے بعد باہر آئی تھی۔ وہ نماز کا تازہ دم بھی ہو گئی تھی اور کپڑے بھی  
لئے تھے۔ وہ مسکراتی ہوئی نگاہوں سے بشارت کی طرف دیکھتے ہوئے کچن میں چلی گئی۔  
ساڑھے نو بجے کے قریب وہ دونوں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔

”تمہارا یہ ٹیلی فون۔“ بشارت نے دائیں طرف صوفے کے قریب اسٹینڈ پر رکھے  
ہوئے ٹیلی فون کی طرف اشارہ کیا۔ ”کل سے خاموش ہے۔ ایک مرتبہ ابھی اس کی گھنٹی  
نہیں بجی اور تم نے بھی شاید اس کے استیصال کی ضرورت نہیں سمجھی۔“

”ٹیلی فون عدم ادائیگی کی وجہ سے بند پڑا ہے۔“ سینا نے جواب دیا۔ ”مجھے دیکھے  
اس کی زیادہ ضرورت نہیں پڑتی۔ اس مرتبہ مل جمع کرانے کا بھی خیال نہیں رہا لیکن میں  
سمجھتی ہوں کہ اب ہمیں ٹیلی فون کی ضرورت پڑے گی۔ کل صبح سب سے پہلے مل جمع  
کراؤں گی اور شام تک فون کھل جائے گا۔“

کھانے کے بعد وہ سینا والے کمرے میں آ گئے اور دیر تک بیٹھے باتیں کرتے  
رہے۔ سینا جہاں لینے لگی تو بشارت اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اسے نیند نہیں آ رہی  
تھی۔ وہ پہلے تو اس صورت حال کے بارے میں سوچتا رہا پھر وہ جاسوسی ٹول اٹھا کر  
پڑھنے لگا جو دوپہر کو احوال دیا تھا لیکن اس کا ذہن بہت گیا تھا۔ پڑھنے پر بھی توجہ نہیں رہی  
تھی۔ وہ اب سینا کے بارے میں سوچنے لگا۔ سینا نے اپنے بارے میں بڑی سچائی سے سب  
کچھ بتا دیا تھا۔ اس نے یہ بھی تسلیم کر لیا تھا کہ اسے ایک ایسے ساتھی کی ضرورت تھی جو  
خبریں اور اس کے فیوض سے اسے تحفظ فراہم کر سکے اور اسے بشارت کی صورت میں اپنا  
آئیڈیل مل گیا تھا۔ اس نے بشارت پر بھروسہ کر لیا تھا اور بشارت سوچ رہا تھا کہ کیا وہ  
اس کی امیدوں پر پورا اتر سکے گا یا نہیں۔

بشارت کو ایسی باتوں کا تجربہ نہیں تھا لیکن یہ بات تو وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ختم  
جیسی عورتیں آسانی سے اپنی شکست تسلیم نہیں کرتیں۔ جوان اور حسین لڑکیاں ان کے  
لئے سونے کی کان ہوتی ہیں اور انہیں قبضے میں رکھنے کے لئے تو وہ اپنی جان کی بازی تک  
لگا دیتی ہیں۔

سینا کسی نہ کسی طرح ختم کے خفیے سے نکل آئی تھی اور وہ اپنے شوہر کی وجہ سے  
محفوظ رہی تھی لیکن ختم کو جب یہ پتہ چلا کہ اس کا شوہر ریٹائر امریکہ کی جیل میں لمبی سزا  
بگت رہا ہے تو اس نے ایک بار پھر سینا کو پھانسنے کے لئے جال پھیلائے شروع کر دیئے  
تھے۔ پہلے اسے شاندار زندگی اور دولت کی چمک سے رام کرنے کی کوشش کی لیکن جب  
وہ نہیں مانی تو دھمکیوں پر اتر آئی اور سینا اس سے چٹا چٹا تھی۔ وہ دوبارہ گندگی کی اس

دلدل میں نہیں جانا چاہتی تھی جس سے بڑی مشکل سے نکل تھی۔ شبنم بھی عورت سے بچنے کے لئے اس نے بشارت کا انتخاب کیا تھا۔ وہ بشارت کی دلیری سے بے حد متاثر ہوئی تھی جس نے اپنے دوست کو بچانے کے لئے اپنی جان کی بازی لگادی تھی اور پلک جھپکنے کی دیر میں دو آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ سنیا کو اپنی حفاظت کے لئے یقیناً ایسے ہی آدمی کی ضرورت تھی اور بشارت سوچ رہا تھا کہ کیا وہ اس کی امیدوں پر پورا اتر سکے گا جبکہ وہ خود پولیس کو مطلوب تھا۔ پولیس ابھی غصے کا شکار تھی لیکن جب تصدیق ہو جائے گی کہ ان دو آدمیوں کا قاتل وہی ہے تو بڑی سرگرمی سے اس کی تلاش شروع ہو جائے گی اور اسے کہیں نکلے نہیں دیا جائے گا۔ اسے تو اپنے آپ کو بچانے کی فکر ہو گی۔ کسی اور کی وہ کیا مدد کر سکے گا۔

سنیا جوان تھی اور بے حد حسین تھی۔ آج صبح سویرے بشارت نے اسے جس حالت میں دیکھا تھا اس کا تصور کرتے ہوئے اسے مہر بھری سی آگئی۔ دماغ میں سنناہٹ سی ہونے لگی۔ اس نے سر جھٹکتے ہوئے ایک بار پھر بول اٹھایا اور سنیا کا خیال ذہن سے نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ آخری مرتبہ اس نے گھڑی دیکھی تو تین بج رہے تھے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

وہ شاید خواب دیکھ رہا تھا۔ سنیا اس پر جھکی ہوئے پیار سے اس کے بالوں میں اٹھلیاں پھیر رہی تھی۔ اور پھر ایک مدھری آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ ”دس بج رہے ہیں۔ اب اٹھ جاؤ۔“

بشارت نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ اس کا خواب نہیں تھا۔ سنیا پلنگ کی پٹی پر بیٹھی اس کی طرف جھکی اس کے بالوں میں اٹھلیاں پھیر رہی تھی۔ اس نے وہی باریک شب خوابی کا لباس پہن رکھا تھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

غزوئی اور مرمریں اٹھلیوں کے لمس نے بشارت کے جسم میں بجلی سی دوڑادی۔ ایک عجیب سا احساس دل کی گہرائیوں سے اٹھا اور پورے بدن میں سنسنی سی پیدا کرتا ہوا دماغ پر چلا گیا۔ اسے اختیار اس نے سنیا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ دل میں پیدا ہونے والے احساس کی لطافت بڑھ گئی۔ سینے میں عجیب سے جذبات لہریں لینے لگے۔

اس کا ہاضی دکھوں اور غلوں کے کلاؤں میں الجھا ہوا گڑا تھا۔ اپنی زندگی میں کبھی

اسے کسی نازک ہستی کا قرب حاصل نہیں ہوا تھا۔ کبھی اس کے دل میں یہ خیال تک نہیں ابھرا تھا کہ زندگی میں آہوں اور سسکیوں کے علاوہ بھی کچھ ہے لیکن آج ایک نرم و ملائم اور شگفتہ ہستی کے قرب اور اس کے ہاتھ کے لمس نے اسے بہت کچھ سونپنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کے دل میں لطیف جذبات سر ابھارنے لگے۔ ایسے جذبات جن کا مفہوم وہ خود بھی نہیں سمجھتا تھا۔

”چائے تھنڈی ہو رہی ہے۔“ سنیا اپنے دوسرے ہاتھ سے اس کا ہاتھ چھتپاتا ہوتے ہوئے۔

بشارت کے تصورات کی حسین عمارت ریت کے گھروندے کی طرح ڈھیر ہو گئی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور نظریں عداوت سے جھک گئیں۔ سنیا نے بڑی آہستہ سے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ بشارت اٹھ کر بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھا ہوا چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے دم دم سے لمبے میں بولا۔ ”بی بی ابھی تک نہیں آئی کیا؟“

”آج بی بی کی چھٹی ہے۔“ سنیا کہتے ہوئے بیڈ سے اٹھ کر کرسی پر بیٹھ گئی اور اپنا کپ اٹھا لیا۔ ”جس دن بی بی کی چھٹی ہوتی ہے سارا کام مجھے ہی کرنا پڑتا ہے۔“ سنیا شوق نظروں سے بشارت کی طرف دیکھ رہی تھی اور بشارت عداوت اور شرم کے مارے نظریں جھکائے ہوئے تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔

دونوں کی چائے ختم ہو چکی تھی۔ سنیا غلط کپ اٹھا کر چلی گئی۔ بشارت اپنی جگہ پر بیٹھا رہا اور پھر اٹھ کر ہاتھ روم میں چلا گیا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ تیار ہو کر باہر نکلا تو سنیا کچن میں ناشتہ تیار کر رہی تھی۔ اس وقت اس نے صحنک کا لباس پہن رکھا تھا۔ بشارت نے ہال میں صوفے پر بیٹھے ہوئے اخبار اٹھا لیا۔ آخری صفحے پر پولیس کی چھاپہ مار ٹیم کی معطلی اور اسے ایس آئی کو حراست میں لے جانے کی خبر تھی۔ اس صفحے پر ایک اور خبر بھی تھی۔ زیر حراست زخمی ملزم شرکے کے جسم سے آپریشن کر کے آخری گولی بھی نکال دی گئی تھی جس سے اس کی حالت بگڑ گئی تھی اور ڈاکٹروں کے مطابق اگلے اڑتالیس گھنٹے بہت اہم تھے۔ اگر اس نے اڑتالیس گھنٹے نکال لئے تو اس کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔ اس خبر میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ پولیس بڑی سرگرمی سے اس کے دوسرے ساتھی کو

تلاش کر رہی تھی لیکن اس سلسلے میں ابھی تک کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔  
 ناشے کے بعد سینہ بازار چلی گئی اور اس کی واپسی تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد ہوئی تھی۔  
 "فون کا بل جمع کروا دیا ہے۔ شام تک لائن کھل جائے گی۔ اور یہ تمہارے لئے  
 لے کر آئی ہوں۔" اس نے شاپنگ بیگ میں سے ایک پیکٹ نکال کر بشارت کی طرف  
 بڑھادیا۔

"یہ کیا ہے؟" بشارت نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔  
 "کھول کر دیکھ لو۔" سینہ نے جواب دیا۔ "ویسے میرا خیال ہے تمہیں اس چیز کی  
 ضرورت ہے۔"  
 بشارت خوبصورت کافہ میں لیپے ہوئے پیکٹ کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ پھر بڑے  
 سلیقے سے کافہ اندر دیا۔ وہ ایک خوبصورت چرمی شیوگ بکس تھاجس میں اس حوالے  
 سے ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔  
 "اس تجھے کا شکریہ۔" اس نے بکس میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن تم نے بلاوجہ  
 زحمت کی۔"

"تم نے تو تین دن سے شیو نہیں بنایا۔ میں نے سوچا تمہیں اس کی ضرورت ہو  
 گی۔" سینہ نے کہا۔  
 "لیکن فی الحال اسے استعمال کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔" بشارت نے جواب  
 دیا۔

"کیوں..... مولوی بننے کا ارادہ ہے کیا؟" سینہ مسکرائی۔  
 "میں ساری زندگی اس چار دیواری میں قید ہو کر تو نہیں رہ سکتا۔" بشارت نے  
 جواب دیا۔ "باہر نکلنے کے لئے مجھے حلیہ بدلنا ہو گا اور اگر میں داڑھی رکھ لوں تو میرے  
 چہرے میں خاصی تبدیلی آجائے گی۔"

"اوہ۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔" سینہ کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔  
 "داڑھی بڑھا کر تمہارے چہرے پر واقعی بڑی تبدیلی آجائے گی۔ ویسے تم داڑھی رکھ کر  
 بھی اسٹارٹ لگو گے۔ تم نے ملنے کی بات کی ہے تو میرے ذہن میں کچھ اور باتیں بھی آ  
 رہی ہیں۔ مثلاً....." وہ ایک لمحے کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

"مثلاً ہالوں کا اسٹائل تبدیل ہو جائے اور آنکھوں میں لئس لگ جائیں تو بشارت کی  
 حیثیت سے تمہیں کوئی پہچان ہی نہیں سکے گا۔"  
 بشارت کی آنکھوں میں بھی چمک سی ابر آئی۔ لئس کے بارے میں تو اس نے سوچا  
 ہی نہیں تھا۔

تین چار روز اور گزر گئے۔ اس دوران میں بشارت نے گھر سے باہر بھاٹکا تک  
 نہیں تھا۔ اس کی داڑھی کے بال اچھے خاصے بڑھ گئے تھے جسے اس نے سلیقے سے سیٹ کر  
 لیا۔ ہلکی مونچھیں اور گول داڑھی اس کے چہرے پر واقعی خوب بیچ رہی تھی۔  
 سینہ باہر کی صورت حال پر نگاہ رکھے ہوئے تھی لیکن کوئی خاص بات سامنے نہیں  
 آئی تھی۔ سوائے اس کے کہ پولیس کی سرگرمیاں اب بتدریج سرد پڑ رہی تھیں۔  
 شکرے کی حالت بھی اب خطرے سے باہر تھی اور اسے کئی روز امیر جمنی میں رکھنے کے  
 بعد دارڈ میں منتقل کر دیا گیا تھا اور دو مسخ کا نشیلا اس کی گھرانی کے لئے تعینات کر دیئے  
 گئے تھے۔ سینہ نے دارڈ میں ڈیوٹی دینے والی ایک نرس کو بھاری رقم دے کر اس بات پر  
 آمادہ کر لیا تھا کہ وہ شکرے کی حالت سے اسے باخبر رکھے گی۔ اس نرس کی ڈیوٹی شام  
 سات بجے ختم ہوتی تھی۔ سینہ چھ بجے اسپتال پہنچ جاتی۔ اس وقت اسپتال میں مریضوں  
 کے عزیز و اقارب کی آمدورفت بھی جاری رہتی تھی۔ اس لئے سینہ کو اس نرس سے ملنے  
 اور رپورٹ حاصل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی تھی اور کسی کو شبہ بھی نہیں  
 ہوتا تھا۔ نرس کی رپورٹ کے مطابق ڈاکٹروں نے ابھی تک پولیس کو شکرے کا بیان لینے  
 کی اجازت نہیں دی تھی۔

اس روز بشارت کئی روز بعد پہلی مرتبہ گھر سے باہر نکلا تھا۔ اس کا دل تیزی سے  
 دھڑک رہا تھا۔ اگر اسے پہچان لیا گیا تو.....؟ وہ اس سے آگے کچھ نہیں سوچنا چاہتا  
 تھا۔ سینہ اسے سمن آباد میں واقع ایک آہنگس کی دکان پر لے گئی۔

آہنگس کھتے بعد جب وہ اس دکان سے باہر نکلا تو اس کی ہیئت ہی بدلی ہوئی تھی۔  
 نیلی آنکھوں نے اس کے چہرے کو بالکل ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔ سینہ بھی اس کی طرف دیکھ  
 کر مسکرا دی تھی۔

اس وقت رات کے نو بج رہے تھے۔ واپسی پر چوہدری سے ذرا آگے نکل کر سینہ نے

اشارت کیا اور کار کو وہیں سے گھما کر چربی چوک کی طرف لے آئی اور وہیں سے کار کو بلالپور روڈ پر موڑ دیا۔

”اس طرف کہاں جا رہی ہو؟“ بشارت نے پوچھا۔

”شیل روڈ پر ذرا کام ہے۔ زیادہ دیر نہیں لگے گی۔“ سنیٹا نے جواب دیا۔

اس سڑک کے دونوں طرف وسیع و عریض قبرستان تھے۔ شہر کے مشرقی حصے کو ملتان روڈ سے ملانے والی اس سڑک پر دن میں اور رات آٹھ نو بجے تک اچھا خاصا ٹریفک رہتا تھا لیکن اس وقت رات کے گیارہ بجتے والے تھے اور اکا دکا گاڑیوں ہی کی آمد و رفت تھی۔

بشارت نے اس جیپ کو دیکھ لیا تھا جو وہاں سے روانہ ہوتے ہی ان کے پیچھے لگ گئی تھی اور اس نے ان دونوں آدمیوں کو اس جیپ میں بیٹھے دیکھ لیا تھا جو کھانا کھانے کے دوران میں انہیں گھورتے رہے تھے۔

”سنیٹا“ بشارت نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کلمہ ”ایک جیپ ہمارے پیچھے آ رہی ہے اور وہ دونوں مجھے کوئی شریف آدمی نہیں لگتے۔“

سنیٹا نے سامنے لگے ہوئے یقینی منظر پیش کرنے والے آئینے کی طرف دیکھ لیا وہ جیپ تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر تھی۔ اس جیپ کے پیچھے کوئی گاڑی نہیں تھی اور اتفاق سے سامنے بھی سڑک دور تک خالی تھی۔

اچانک جیپ کی رفتار تیز ہو گئی اور وہ کار کو اور ٹک کرتی ہوئی ایک دم سامنے آ گئی۔ بریکوں کی تیز چرچاہٹ کی آواز فضا میں پھیل گئی۔ سنیٹا نے بڑی تیزی سے اسٹینرنگ بائیں طرف گھما دیا۔ اس جگہ قبرستان میں داخلے کا راستہ تھا جہاں کلونی کے تنجوں کا معمولی سا گیت لگا ہوا تھا۔ کار گیت توڑتی ہوئی اندر داخل ہو کر ایک قبر سے گھرا گئی۔ اگر سنیٹا پوری قوت سے بریک نہ لگا دیتی تو کار قبر پر چڑھ کر الٹ جاتی۔

بشارت کا سر ڈیڑھ پورے گھرا گیا لیکن اس نے اپنے آپ کو فوراً ہی سنبھال لیا اور سنیٹا کی طرف دیکھنے لگا۔ خوف و ہست سے اس کے چہرے کے اثرات بگڑ گئے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے سنبھالنے کی کوشش کرنا دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر اچھل پڑا۔

ایک طرف گاڑی روک لی اور انجن بند کر دیا۔

بائیں طرف خان صاحب کی نئے کباب کی دکان تھی۔ لوگ دور دور سے کباب کھانے کے لئے یہاں آتے تھے۔ اگرچہ بہت بڑا اینٹرٹینمنٹ ہال بھی تھا لیکن دکان کے سامنے کھلی جگہ پر دور دور تک میزیں، کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ کوئی میز خلل نظر نہیں آ رہی تھی۔ درختوں کا ریش بھی کھڑی تھیں اور بہت سے لوگ اپنی گاڑیوں میں بیٹھے لذت کام و دہن میں مشغول تھے۔

سنیٹا کے کار روکنے کے فوراً ہی بعد ایک نوجوان ہاتھ میں خلی ٹرے پکڑے ان کے قریب آیا اور چیزوں کے نام گنوا لے لگا۔ سنیٹا نے اسے چکھن گئے اور روغنی نان کا آرڈر دے دیا اور دروازہ کھول کر نیچے اتر آئی۔ بشارت بھی کار سے باہر آیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ سامنے چربی مارکیٹ میں نئے کباب کی دو عین دکانیں تھیں اور وہاں بھی ایسا ہی رش نظر آ رہا تھا۔ انگریزی کے حرف دانے کی شکل بنائی ہوئی دو سڑکوں کے بیچ میں بہت بڑا پارک تھا اور خان صاحب کی دکان کے بائیں سامنے پارک کے گوشے میں بی آئی اے کا پلانٹوریم تھا جہاں لوگوں کی تفریح کے لئے پرواز کی صلاحیتوں سے محروم ہو جانے والا ایک جہاز بھی کھڑا کر دیا گیا تھا جو لوگ ہوائی سفر کی استطاعت نہیں رکھتے تھے وہ اس جہاز میں بیٹھ کر اپنا شوق پورا کر لیا کرتے تھے۔

پندرہ منٹ بعد لڑکان کی مطلوب چیزیں لے آئی۔ سنیٹا نے پٹیلیں کار کے پونٹ پر ہی رکھوا لیں اور دونوں وہیں کھڑے کھڑے کھانا کھانے لگے۔ بشارت ادھر ادھر بھی دیکھ رہا تھا۔ میزوں پر اگرچہ کئی خواتین بھی بیٹھی ہوئی تھیں لیکن بشارت نے محسوس کیا تھا کہ اکثر لوگ ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

ایک موقع پر بائیں طرف دیکھتے ہوئے بشارت چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ دو آدمی تھے جو بڑی گہری نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شکل و صورت سے وہ دونوں جیسے ہوئے بد معاش ہی لگتے تھے اور ان میں سے ایک کا چہرہ اسے جھکا جا سا لگ رہا تھا لیکن اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس شخص کو کب اور کہاں دیکھا تھا۔ وہ دونوں ان کی طرف دیکھتے ہوئے آپس میں مڑکڑاہٹیں بھی کر رہے تھے۔

کھانے کے بعد سنیٹا نے بلی ادا کیا اور وہ دونوں کار میں بیٹھ گئے۔ سنیٹا نے انجن

وہ دونوں آدمی جیپ سے اتر کر اسی طرف دوڑے آ رہے تھے۔ بشارت جلدی سے دروازہ کھول کر کار سے اتر آیا۔ ان میں سے ایک آدمی آگے پہنچ گیا اور کار کا دروازہ کھول کر سینا کو باہر کھینچ لگ۔ سینا چیخ اٹھی۔ بشارت جلدی سے آگے بڑھل۔

”اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا مولوی۔“ دوسرا آدمی چیخا۔

اس کے ہاتھ میں چاقو دیکھ کر بشارت رک گیا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے چاقو کی پروا کئے بغیر اس شخص پر حملہ کر دیا۔ اس کے پیر کی ٹھوک اس شخص کے چاقو والے ہاتھ پر لگی اور چاقو ہوا میں اڑتا ہوا قبروں میں جاگرا۔ اس غنڈے کو شاید اس رد عمل کی توقع نہیں تھی۔ وہ ایک لمحے کو تو بھونچکا سا رہ گیا پھر اس نے اچانک ہی بشارت پر حملہ کر دیا۔ بشارت نے نیچے کی کوشش کی مگر گونہ اس کے کندھے پر لگا۔

بشارت کو یوں لگا جیسے وہ نیچے ہتھوڑے سے ضرب لگائی گئی ہو۔ وہ لڑکھڑا کر رہ گیا۔ اس کے سینے سے پہلے ہی حریف نے اسے گھونسوں کی باڑ پر رکھ لیا۔ وہ لڑکھڑا کر نیچے گرا اور اس پر ٹھوکوں کی بارش ہونے لگی۔

بشارت نے حریف کا پیر پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ وہ ایک پیر پر تلج کر رہ گیا اور پھر پشت کے بل گرا۔ بشارت ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے حریف نے بھی سینے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ اس نے ایک بار پھر بشارت پر تابو توڑ حملے شروع کر دیے۔ بشارت ابھی تک اسے ایک ہاتھ بھی نہیں مارا تھا۔

ایک گونہ بشارت کے منہ پر لگ۔ ہونٹوں سے خون بہہ نکلا اور منہ میں اپنے خون کا ذائقہ محسوس کر کے بشارت کا دل بھجنا اٹھل۔ اسے یوں لگا جیسے اس کی رگوں میں خون لادنے کی طرح کھول اٹھا ہو۔ حریف نے دوسرا گونہ مارنا چاہا تو بشارت نے اس کا وار پائیں ہاتھ پر روکا اور دائیں ہاتھ سے اس کی بغل میں زوردار گونہ رسید کر دیا۔ وہ شخص گیند کی طرح اچھلا۔ بشارت نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور اس کے منہ پر گھونسوں کی بارش کر دی۔

وہ لڑائی کا ماہر نہیں تھا لیکن جب اپنی جان پر ہی ہو تو ہر کوئی ہاتھ چیر چلانا سیکھ لیتا ہے۔ اس کا ایک گونہ حریف کی ناک پر لگ۔ وہ ذبح ہوتے ہوئے بکمرے کی طرح ہلچلا اٹھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا پیچھے ہٹ رہا تھا۔ بشارت اسے گھونسے اور ٹھوکریں مارتا ہوا قبروں

میں دھکیل لے گیا۔ اس کا آخری گونہ حریف کے سر پر لگا۔ وہ چیخا ہوا پشت کے بل ایک قبر پر گر۔

اسی لمحے بشارت کو سینا کی چیخ سنائی دی۔ بشارت اس طرف پلٹ گیا۔ سینا نے اپنا ایک بازو اسٹیرنگ وھیل میں پھنسا رکھا تھا اور وہ شخص اسے ہاتھ سے پکڑ کر باہر کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے وہ سینا کے کندھے پر گھونسے بھی مار رہا تھا۔

اسی وقت سڑک پر سے کوئی گاڑی بھی گزری تھی۔ گاڑی تیزی سے ٹکل گئی تھی۔ کسی نے سینا کی چیخ نہیں سنی ہوگی۔ سنی بھی ہوگی تو جان بوجھ کر نہیں رکا ہوگا۔ رات کے وقت تو کسی قبرستان کے قریب سے گزرتے ہوئے ویسے ہی خوف محسوس ہوتا ہے اور جب قبرستان میں کسی عورت کے چہرے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی ہوں تو وہاں رکنے کی حماقت کون کرے گا۔

بشارت نے اس شخص کو ہاتھ سے پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی پیلوں پر دو تین گھونسے جڑ دیے۔ اس شخص نے سینا کے بال چھوڑ دیے۔

”دیکھ اوبانڈ۔“ وہ غنڈہ اپنے آپ کو منہا لے کر کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ”ساڈا تمہارا کوئی بھڑا نہیں ہے۔ تو چپ کر کے بیٹ جاہل سے۔ ساڈا تل پنگانہ نہ تو۔“ ”پنگا تو اب میں سے ہی پکا ہوں۔“ بشارت نے جواب دیا۔ ”اور اب میں تمہیں بتاؤں گا کہ کسی عورت پر ہاتھ ڈالنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔“

بشارت نے گونہ مارنے کی کوشش کی مگر حریف نے جھٹکی دے کر اپنے آپ کو بچا لیا اور اس کے ساتھ ہی ٹانگ چلا دی تھی۔ اس کے پیر کی ٹھوک بشارت کی پٹلی پر لگی۔ وہ ہلچلا کر اٹھا اور لڑکھڑا کر نیچے گرا۔ حریف نے سینے کا موقع دیکر بغیر اسے چھاپ لیا۔ وہ بشارت کے سینے پر سوار تھا اور دونوں ہاتھوں سے اس کا گلہا دبا رہا تھا۔ بشارت کے زخموں پر اس کے انگوٹھوں کا دباؤ بڑھ رہا تھا۔ بشارت کا سانس رکنے لگا۔ آنکھیں حلقوں سے اٹل آئیں۔ اس نے دونوں ہاتھ حریف کی کلائیوں پر بھرا رکھے تھے اور گرفت چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن لگتا تھا جیسے اس کی قوت مدافعت جواب دے رہی ہو۔

بشارت آہستہ آہستہ اپنی ایک ٹانگ سینے لگا اور آخر کار اس پوزیشن میں آ گیا کہ حریف کے خلاف ٹانگ استعمال کر سکے۔ اس نے گھٹنے سے حریف کی ٹانگ کے نازک حصے

ٹیک لگائے کھڑی دہشت زدہ سی نظروں سے اس لاش کو دیکھ رہی تھی۔  
”تنت... تھک... تھک ہوا...!“ وہ بشارت کی طرف دیکھ کر ہلکائی۔

”ہاں میں ٹھیک ہوں۔ اپنے آپ کو سمجھاؤ اور نکلے یہاں سے۔“ بشارت نے آستین سے اپنے ہونٹوں کا خون پونچھتے ہوئے کلمہ ”گاڑی چلا سکو گی نہیں؟“  
”ہاں ہاں۔ میں چلاؤں گی۔“ سینا نے جواب دیا۔

بشارت نے اسے پکڑ کر ڈرائیو تک سیٹ پر بٹھا دیا اور خود اوپر سے محکمہ کر پانچرز سیٹ پر بیٹھ گیا۔ سینا انجین اشارت کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ گاڑی کا گیٹ توڑنے اور قبر سے نکلنے سے گاڑی کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا تھا۔ انجین آسانی سے اشارت ہو گیا۔

”اپنے حواس کو قابو میں رکھو اور گاڑی کو احتیاط سے ریورس میں لو۔“ بشارت نے کلمہ ”ہیڈ لیمپس روشن کرنے کی ضرورت نہیں۔“

سینا نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور کار کو ریورس میں لینے لگی۔ پیچھے مڑ کر پر تاریکی تھی جس کا مطلب تھا کہ کسی طرف سے کوئی گاڑی نہیں آ رہی تھی۔ گاڑی کا گیٹ نوٹ کر جھول گیا تھا۔ کار اس سے عکراتی ہوئی باہر آئی۔ وہ سڑک کے کنارے کچی جگہ پر گاڑی کو کئی کڑ دور لے چلی گئی۔ پھر گیسٹر بدل کر اسے آگے کی طرف دوڑا دیا۔ اس کے ساتھ ہی ہیڈ لیمپس روشن کر دیئے تھے۔ وہ جیپ چند گز آگے کھڑی تھی۔ سینا کار کو اس کے قریب سے نکل لے گئی۔ اسٹیرنگ پر اس کے ہاتھ ابھی تک کانپ رہے تھے۔ کار کبھی سڑک کے کنارے پر آجاتی اور کبھی سچ میں۔

تقریباً ڈیڑھ سو گز کا فاصلہ طے ہوا تھا کہ سامنے سے کوئی گاڑی آتی ہوئی نظر آئی۔ اس کے ہیڈ لیمپس کی روشنی آنکھیں میں چکا چوند سی پیدا کر رہی تھی۔ سینا نے اپنی کار کی رفتار کم کر کے اسے بائیں کنارے پر لے لیا۔

وہ پولیس کی دو ہیڈ لیمپس دین تھی جو تیزی سے گزر گئی۔ سینا کے ہاتھ ایک بار پھر اسٹیرنگ پر کانپ گئے۔

”گاڑی سمجھاؤ۔“ بشارت جلدی سے بول اٹھا۔  
کار سڑک سے اتر کر قبرستان کی دیوار کی طرف جا رہی تھی۔ سینا نے جلدی سے

پر ضرب لگائی۔ ضرب اگرچہ زیادہ زوردار نہیں تھی لیکن اثر دکھائی دیا۔ حریف ذرا سا اچھلا۔ بشارت کو موقع مل گیا۔ اس مرتبہ اس نے گھٹنے سے اسی جگہ زوردار ضرب لگائی۔

حریف ہلکا اٹھا۔ بشارت کے گلے پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ بشارت نے اسے ایک طرف دھکیل دیا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ چند لمحوں میں اٹھ گیا۔ سلاٹا رہا پھر حریف کی طرف متوجہ ہو گیا جو دونوں ہاتھ رانوں میں بدلے دہرا دھا جا رہا تھا۔

بشارت نے اس کے پہلو پر زور وار ٹھوکر کر سید کر دی۔ وہ چیخا ہوا الٹ گیا اور بشارت کی بل میں بن سے اپنے رشتے جوڑنے لگا۔ بشارت اس پر ٹھوکریں پر سارے رہا۔

اس دوران میں دوسرا غلہ بھی سمیٹ چکا تھا۔ اس نے پیچھے سے بشارت پر حملہ کر دیا۔ بشارت اس کے دھانسنے کی آواز سن کر بڑی پھرتی سے پیچھے جھک گیا اور وہ شخص اس کے اوپر سے ہوتا ہوا آگے جا کر۔

بشارت نے اب دونوں کو ٹھوکروں پر رکھ لیا تھا۔ اس کی زوردار ٹھوکر ایک کے سر پر لگی۔ وہ چیخ اٹھا اور سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر زمین پر لوٹنے لگا۔ دوسرا آدمی بشارت سے قطع کرکٹا ہوا گیا۔

وہ دونوں قبروں میں ایک دوسرے کو رگیدے رہے۔ بشارت اس کے سینے پر سوار اس کے منہ پر گھونٹے برسا رہا تھا۔ ”بشارت بچو۔“

سینا کے پیچھے کی آواز سن کر بشارت نے ایک سیٹھ کے ہزارویں حصے میں ایک طرف جھپٹائی لگا دی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تھا۔

دوسرا آدمی دونوں ہاتھوں میں بہت بڑا پتھر اٹھائے حملہ آور ہو رہا تھا۔ بشارت تو ایک طرف ہٹ گیا تھا۔ اس شخص کے ہاتھوں میں پتھر ہوا پتھر بڑی تیزی سے پیچھے آیا اور اس کے ساتھ ہی پیچھے پڑے ہوئے شخص کی ہمایک جھج قبرستان کے سائے میں گونج اٹھی۔ مگر اس جھج نے اچانک ہی دم توڑ دیا تھا۔ دہشت زدہ بشارت نے اس کا سر پکڑ لیا تھا۔

حملہ آور چند لمحوں دہشت زدہ سی نظروں سے اپنے ساتھی کو دیکھتا رہا اور پھر پھرتا ہوا قبروں میں ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

بشارت نے پیچھے کھڑے ہوئے شخص کو دیکھا جس کا چہرہ بری طرح کھلا گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دہشت سی ابھری آئی۔ وہ اٹھ کر سینا کی طرف پلکا پلکا جا کر کے بوٹ سے

اسے سنبھال لیا اور دوبارہ سڑک پر لے آئی۔ ”اگر وہ ہمیں روک لیتے تو ہمارے حملے دبا کر منکھوک ہو جاتے۔“ سنیتا نے کہل۔  
 ”جیپ کو وہاں کھڑے دیکھ کر شاید پولیس کی گاڑی وہاں رک جائے۔“ بشارت۔  
 کہل ”اس لئے رفتار ذرا بڑھا دو۔“  
 سنیتا نے عقبی منظر پیش کرنے والے آئینے پر نگاہ ڈالی اور کار کی رفتار بڑھادی اگلے چوراہے پر ٹریفک سگنل کی زرد جلیق جل رہی تھی۔ لیٹن روڈ شاہراہ جلال الدین روڈی اور قاضی جناح روڈ پر ہلکے ٹریفک کی آمدورفت جاری تھی۔  
 ”پولیس کی وہ گاڑی جیپ کے پاس رک گئی ہے۔“ بشارت نے پیچھے مڑ کر دیکھا ہوئے کہل۔

سنیتا کاپ اٹھی۔ اس نے اسٹیریٹک پر ہاتھ مضبوطی سے جمائے اور دائیں بائیں دیکھتے ہوئے گاڑی کو چوراہے سے سیدھا قاضی جناح روڈ پر لے گئی اور تھوڑا ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد اسے شمال روڈ پر موڑ دیا۔  
 بیسٹر دکائیں بند ہو چکی تھیں لیکن تھوڑے تھوڑے فاصلے پر جہاں ریٹورنٹ کھلے پینے کی دکانیں تھیں خاصی رونق تھی۔ اس سڑک پر دوسری گاڑیوں کی آمدورفت بھی تھی۔ سنیتا قحط انداز میں ڈرائیونگ کرتی رہی۔

ریبل چوک سے تقریباً سو گز پہلے اس نے کار بائیں طرف ایک گلی میں موٹو روک لی اور انجن بند کر کے شیشے چڑھانے لگی۔ بشارت نے بھی اپنی طرف کا شیشہ چڑھا اور وہ دونوں نیچے اتر آئے سنیتا اپنا ٹولڈریک اٹھاتا نہیں بھولی تھی۔

سنیتا اسی گلی کی پہلی بلڈنگ کے دروازے میں داخل ہو گئی۔ یہ کشادہ ڈیوڑھی جس میں آخری سرے پر دم روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ ڈیوڑھی کے اختتام پر صحنہ اور دروازے کے ساتھ ہی اوپر جانے کے لئے تنگ سی سیڑھیاں۔ سنیتا سیڑھوں پر چڑھی۔ بشارت بھی اس کے پیچھے ہی تھا۔

دوسری منزل پر سنیتا ایک کمرے کے سامنے رک گئی۔ اس نے ٹولڈریک میں چابیوں کا گچھا نکالا اور دروازے کا کالا کھولنے لگی۔  
 اندر داخل ہونے کے بعد سنیتا نے پہلے دروازہ بند کیا اور پھر دیوار ٹٹول کر

جلادی۔

یہ ایک کشادہ کمرہ تھا جس میں ایک طرف چھوٹی آفس ٹیبل اور کرسی رکھی ہوئی تھی۔ دوسری طرف لاتعداد کارٹن نیچے اوپر رکے ہوئے تھے۔ ایک دیوار کے ساتھ لمبے چوڑے شیشے کے دروازے والی الماریاں بنی ہوئی تھیں جس میں کاسیٹس کا سلیمان اور الیکٹرانک کی کچھ چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔

آگے ایک اور دروازہ تھا جو منتقل نہیں تھا۔ سنیتا وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی اور جی جلادی۔ یہ کمرہ بھی پہلے کمرے کی طرح کشادہ تھا۔ فرش پر نئے رنگ کی موٹی دری بچھی ہوئی تھی۔ یہاں بھی ایک طرف آفس ٹیبل تھی اور اس کے پیچھے ریو الونگ بیچر سامنے والی دو دیواروں کے ساتھ بیچے سے اوپر تک شیشے کی الماریاں بنی ہوئی تھیں اور ان میں بھی انوار و اقسام کا مال بچا ہوا تھا۔

اس کمرے کی ایک کمری گلی کی طرف اور دوسری سڑک کی طرف کھلتی تھی۔ سنیتا نے اندر داخل ہو کر دونوں کمریوں کھول دیں اور میز کے پہلو میں ایک دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ اس نے دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ وہ ہاتھ روم تھا جس میں سامنے ہی دیوار کے ساتھ ایک آئینہ لگا ہوا تھا۔

بشارت کمرے میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ ایک طرف صوف سیٹ بھی رکھا ہوا تھا۔ وہ صوفے پر بیٹھ گیا اور انگلی سے ہونٹوں کو ٹٹولنے لگا۔ اسی وقت سنیتا ہاتھ روم سے باہر نکلی اور ایک الماری کھول کر کچھ تلاش کرنے لگی۔ پھر اس نے اسٹین پیپک لوشن کی ایک بوتل اٹھالی۔

بشارت بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے پہلی مرتبہ سنیتا کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے اور گلے پر خراشیں تھیں۔ قیاس ایک کدے سے پہلی ہوئی تھی اور کدے پر بھی خراشیں نظر آ رہی تھیں۔ اس نے ہاتھ روم میں داخل ہو کر دروازے کو پیر سے پیچھے کی طرف دھکیل دیا اور قیاس اتار کر چہرے اور جسم کی خراشوں پر لوشن لگانے لگی۔

بشارت صوفے پر نیم دراز تھا۔ اس کی نظریں اچانک ہی ہاتھ روم کی طرف اٹھ گئیں اور پھر اسے سینے میں سانس رکنا ہوا محسوس ہونے لگا۔ ہاتھ روم کا دروازہ پوری طرح بند نہیں ہوا تھا۔ چند انچ کے قریب کھلا رہ گیا تھا اور اس خلا سے سنیتا کو دیکھ کر اس

کے جسم پر چوڑی ٹیبل سی ریگنے لگیں۔ وہ اٹھ کر کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ تازہ ہوا کے جھونکوں سے اس کے حواس بحال ہونے لگے۔ وہ گردن کھڑکی سے نکالے گھرے گھرے سانس لیتا رہا اور پھر سینہ کی آواز سن کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ اپنے جامے میں آگے تھی۔

”تمہارا ہونٹ شاید کٹ گیا ہے۔ یہ لوشن لگا لو۔ اور دیکھو تمہارا حلیہ کیا ہو رہا ہے۔“ سینہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
بشارت نے پہلی مرتبہ اپنا جائزہ لیا۔ اس کا حلیہ واقعی بہت خستہ ہو رہا تھا۔ کپڑے مٹی میں اٹے ہوئے تھے۔ شرٹ کا اوپر کا ایک ٹخن بھی ٹوٹا تھا اور خون کے چند دھبے نظر آرہے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر راستے میں انہیں واقعی کہیں روک لیا جاتا تو ان شبہ ہونا لازمی بات تھی۔

وہ لوشن کی بوتل اٹھا کر ہاتھ روم میں کھس گیا۔ پہلے اس نے سوچا کہ منہ ہاتھ د کر ہونٹوں کے کٹ پر لوشن لگالے لیکن آئینے میں اپنا جائزہ لینے کے بعد وہ دروازہ بند کے کپڑے اتارنے لگا۔ اس کے بال بھی مٹی میں اٹے ہوئے تھے۔

نہانے کے بعد اس نے پینٹ اور بنیان پین لی اور قیص ہاتھ میں اٹھائے باہر آگیا۔ ”یہ قیص پین کر تو میں باہر نہیں جاسکتا۔“ وہ سینہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”خون کے دھبے لگے ہوئے ہیں۔ راستے میں کسی جگہ روک لیا گیا تو مشکل ہو جائے گی۔“ ”ہم کہیں جا بھی نہیں رہے۔“ سینہ نے جواب دیا۔ ”ایک بیچے والا ہے۔“ ”راخ میں کہیں نہ کہیں پولیس ضرور روکے گی اور میری ذہنی کیفیت ایسی نہیں کہ پولیس۔“ سوالوں کا جواب دے سکوں۔“

”میں!..... یہ کون سی جگہ ہے؟“ بشارت نے پوچھا۔

”میرا بزنس آفس۔“ سینہ نے جواب دیا۔ ”ہم رات یہیں رہیں گے۔“

ابھی وہ باتیں کر رہے تھے کہ دروازے پر زوردار دنگ ابھری۔ وہ دو لو اچھل پڑے۔ سینہ کا چہرہ تو ایک دم دھواں ہو گیا تھا لیکن پھر فوراً ہی اس نے اپنی کیفیت قابو پایا۔

”کون ہے؟“ اس نے بیرونی دروازے کے قریب آکر پوچھا۔

”چوکیدار۔ اندر کون ہے۔“ باہر سے پوچھا گیا۔

سینہ کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ اس نے بوٹ ہٹا کر دروازہ ذرا سا کھول دیا۔

”میں ہوں چوکیدار۔ کیا بات ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”آپ ہیں بیگم صاحب۔“ چوکیدار بولا۔ ”جی جلتے دیکھی تو میں سمجھا پتہ نہیں کون ہے۔“ خیر تو ہے نا بیگم صاحب۔“

”دفتر کا مینے بھر کا حساب کرنا تھا۔“ سینہ نے جواب دیا۔ ”جب میں آئی تھی تو اس وقت تم کہاں تھے؟“

”دیکل صاحب کے لئے ہوٹل سے روٹی لینے گیا ہوا تھا۔“ چوکیدار نے جواب دیا۔ ”آج وہ بھی ابھی تک بیٹھے ہوئے ہیں جی۔“ ”مج پکری میں کوئی مقدمہ لڑا ہے۔“

”جھاڑا کرو،“ تم جس ہوٹل سے دیکل صاحب کے لئے روٹی لے کر آئے ہو وہاں سے مجھے بھی چائے لا دو۔“ مجھے یاد نہیں رہا ورنہ میں تمہارا بھر کے لے آتی۔ تمہیں ذرا تکلیف تو ہوگی۔ میں.....“

”کوئی گل ای نہیں بیگم صاحب۔“ چوکیدار نے کہا۔

سینہ نے اسے میں روپے لا کر دے دیئے اور یہ بھی کہا کہ وہ خود بھی چائے پی آئے اور دو آدمیوں کی چائے اس کے لئے لے آئے۔

چوکیدار کے جانے کے بعد سینہ نے دروازہ بند کر دیا اور بشارت کو بتانے لگی کہ اس دو منزلہ عمارت میں زیادہ تر کھلیوں کے دفاتر ہیں جو عام طور پر رات آٹھ تو بجے تک بند ہو جاتے ہیں۔ البتہ کبھی کبھار کوئی کس کی کس کی اسٹری کے لئے رات بھر اپنے دفتر میں بیٹھا رہتا ہے۔

آدھے گھنٹے بعد چوکیدار چائے کی چٹیک اور دو پیالیاں لے آیا۔ سینہ نے اسے بتا دیا کہ چٹیک وہ صبح واپس لے جائے۔ وہ دروازہ بند کر کے اندرونی کمرے میں آگئی۔ وہ دونوں اس وقت واقعی بڑی شدت سے چائے کی طلب محسوس کر رہے تھے۔

”کس بیدروی سے اس کا حقویرا کچلا گیا تھا۔ میرا دل تو ابھی تک کانپ رہا ہے۔“ سینہ نے چائے کی چٹکی لیتے ہوئے کہا۔

”کون تھے وہ لوگ؟“ بشارت نے سوالیہ نگاہوں سے اس کے طرف دیکھا۔



”یہی سوال میں تم سے پوچھنے والی تھی۔“ سنیا بولی۔ ”وہ جو کوئی بھی ہوں لیکن مجھے خوشی ہے کہ میرا انتخاب غلط نہیں تھا۔ میں نے اسی روز تمہارے اندر چھپے ہوئے آدمی کو پہچان لیا تھا جب اپنے دوست کو پہچانے کے لئے تم نے جان کی بازی لگا دی تھی۔“

”آدمی کو یا میرے اندر کے چھپے ہوئے حیوان کو پہچان لیا تھا۔“ بشارت نے جیستی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”اگر اس شخص کی جگہ میرا خوبصورت چمکا جاتا تو تم میرے انتخاب کو زندگی کی سنگین ترین غلطی قرار دیتیں۔ بہر حال۔“ وہ ایک لمبے کو خاموش ہوا پھر بولا۔ ”ان دونوں کو میں نے اس وقت دیکھا تھا جب ہم خان صاحب کے ہاں نئے کباب کھا رہے تھے۔ یہ دونوں بھی وہیں بیٹھے ہوئے تھے اور بار بار تمہاری طرف دیکھ رہے تھے۔ مجھے اسی وقت ان پر شبہ ہوا تھا اور جب انہوں نے جیب پر ہمارا تعاقب شروع کر دیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ کوئی گریز ضرور ہے۔ کیا یہ جہنم کے غنڈے نہیں ہو سکتے۔ تم نے بتایا تھا کہ اس نے تمہیں اٹھوانے کی دھمکی دی تھی؟“

”اگر یہ جہنم ہی کے گرگے تھے تو اب تک اسے پتہ چل گیا ہو گا کہ اب میری طرف میلی آنکھ سے دیکھنا بھی خطرناک ہو گا۔“ سنیا نے جواب دیا۔

”کیونکہ اب تمہیں ایک ایسا حیوان مل گیا ہے جو کسی کو موت کے گھاٹ اتارنے میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتا۔“ بشارت نے کہا۔

”کیسی باتیں کرتے ہو؟“ سنیا نے اسے گھورا۔

”میرا باپ مجھے کیا بتانا چاہتا تھا اور میں کیا بن گیا۔“ بشارت نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”تم نہیں سمجھ سکتیں کہ میں کن حالات سے گزر رہا ہوں۔ وقت کے دھارے نے میری شخصی حیات کو طوفانی موجوں میں دھکیل دیا ہے۔ پتوڑ میرے ہاتھ سے چھوٹ چکے ہیں۔ اتنی قوت نہیں کہ اپنی ذلتی ہوئی ناک کو بچا سکوں۔ پہلے میں جیب تراش تھا“ مصل جب کھرا لیکن اب قاتل بن چکا ہوں۔ دو آدمی میرے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں اور شاید اب تیرے ناکھوں بھی میرے کھاتے میں ڈال دیا جائے۔“

”بشارت۔“ سنیا کرسی سے اٹھ کر اس کے قریب صوفے پر بیٹھ گئی۔ ”یہ جو کچھ بھی ہوا اس میں تمہاری مرضی کو تو دخل نہیں تھا۔ تم نے ایک شریف اور دباندار انسان کی زندگی برباد کرنے کی بھرپور کوشش کی لیکن قدم قدم پر تمہاری راہ میں کانٹے بچھائے

مجھے۔ تمہیں مجبور کر دیا گیا کہ تم مجھ پر زندگی کو اپناؤ اور زندگی بھر دوسروں کے آلہ کار بنے رہو۔ میری کہانی بھی تم سے مختلف تو نہیں۔ ہم دونوں ایک ہی مٹی کے سوار ہیں۔ میں نے تمہیں اپنے ساتھ لاکر غلطی نہیں کی تھی۔“

”تمہیں میرا اتنا خیال کیوں ہے؟“ بشارت نے اسے گھورا۔

”بس۔ میں تمہیں پریشان نہیں دیکھ سکتی۔ میں چاہتی ہوں کہ تم ہمیشہ خوشیوں میں کھیلتے رہو۔ مسکراتے رہو۔ تمہاری یہ اداسیاں مجھ سے دیکھی نہیں جائیں۔“ سنیا نے کہا۔

”خوشیاں اور مسکرائیں۔“ بشارت کے ہونٹوں پر زخمی سی مسکراہٹ آگئی۔ ”سرسبز اور مسکرائیں تو میرے لئے ایک خواب ہیں سنیا۔ جن کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ خوشیاں کب ہوتی ہیں۔ مجھے علم نہیں کہ مسکرایا کیسے جانا ہے۔ میرے ہونٹ تو سدا سے آہوں اور سسکیوں ہی سے آشتارہے ہیں۔ مسکرائیں تو ان کے حصے میں آتی ہیں جو۔۔۔۔۔۔“

”تمہارے ہونٹوں پر بھی مسکرائیں ابھر سکتی ہیں بشرطیکہ۔۔۔۔۔۔“ سنیا نے اس کی ہات کٹ دی اور اپنا جملہ ادا حورا چھوڑ دیا۔

”بشرطیکہ۔۔۔۔۔۔؟“ بشارت نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”بشرطیکہ تم اپنے ماضی کو فراموش کر دو۔ ان یادوں کو دفن کر دو جو تمہاری زندگی کو گھن کی طرح چلت رہی ہیں۔“ سنیا نے کہا۔

”اس کے باوجود کہ میرے ہاتھوں دو آدمی مارے گئے ہیں۔ قانون کو میری تلاش ہے اور آج جو کچھ ہوا ہے۔ وہ جو کوئی بھی سہی کیا اپنے ایک آدمی کی ہلاکت پر وہ خاموش بیٹھے رہیں گے۔ وہ حکام کی کتوں کی طرح پورے شہر میں میری بو سونگھتے پھریں گے۔ اس کے باوجود۔۔۔۔۔۔“

”ہاں۔ اس کے باوجود۔“ سنیا نے کہا۔ ”تم نے اب تک علم سے ہیں۔ ہمیشہ دوسروں کے زیر دست رہے ہو لیکن اب تم وہ نہیں رہے۔ تمہارے اندر ایک نیا انسان اگلائی ہے پکا ہے۔ اپنے اندر کے اس آدمی کو جگاؤ اور پھر دیکھو نہایت کیسے تمہاری ٹھوکروں میں آتا ہے۔ بھول جاؤ کہ تم نے بے بسی اور کسہری کی زندگی گزار دی تھی۔“

”ناسی کو درگزر کیا جاسکتا ہے۔ حال کے متعلق تم کچھ نہیں جانتیں اور مستقبل میں کیا ہو گا؟ یہ شاید کوئی بھی نہیں جانتا۔“ بشارت نے کلمہ۔

”مستقبل ہمیں خود بتاتا ہے۔ ہم بتائیں گے اپنا مستقبل۔“ سینا نے جواب دیا۔

”تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔“ بشارت بولا۔ ”ایک قائل اپنا مستقبل کیسے بنا سکتا ہے؟“

”شاید میں تمہیں اپنی بات سمجھا نہیں پا رہی۔“ سینا نے کلمہ۔ ”اس وقت میرا ذہن بھی بری طرح الجھا ہوا ہے۔ سوچاؤ۔ صبح بتا کر رہیں گے۔“

بشارت کا ذہن بھی بری طرح الجھا ہوا تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ نہ وہ سینا کی کوئی بات سمجھ پارہا تھا نہ ہی اپنی کوئی بات اسے سمجھا پا رہا تھا۔ اس نے سینا کی طرف دیکھا اور صوفے سے اتر کر دربی پر لیٹ گیا۔ دوسرے صوفے کا ایک کٹن اس نے نکلنے کے طور پر سر کے نیچے رکھ لیا تھا۔

اس کے باوجود کہ آج کے واقعے نے سینا کو بری طرح خوفزدہ کر دیا تھا وہ صوفے پر لیٹے ہی سو گئی۔ بشارت البتہ دیر تک جاگتا رہا اور پھر اس کی بھی آنکھ لگ گئی۔

وہ رات کا پچھلا پر تھا۔ سائزن کی آواز میں سن کر بشارت کی آنکھ کھل گئی۔ وہ پولیس سائزن کی آواز تھی۔ لگتا تھا جیسے پولیس کی گاڑی اس عمارت کے سامنے رک گئی ہو۔ اس سے پہلے کہ صورت حال کا کچھ اندازہ لگتا، سینا بھی مگر بڑا کر اٹھ گئی۔ سائزن کی آواز بدستور گونج رہی تھی۔ سینا نے دہشت زدہ سی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور صوفے سے اچھل کر بشارت کے اوپر آ کر گری اور اس سے لپٹ گئی۔

سائزن کی آواز بند ہو گئی۔ سڑک پر دوڑتے ہوئے ہماری قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور پھر ہماری قدموں کی یہ آوازیں عمارت کی سیڑھیوں پر سنائی دینے لگیں۔ وہ غالباً کئی پولیس والے تھے جو دوڑتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔

بشارت کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اس نے پولیس کی دین کو قبرستان کے باہر کھڑی ہوئی جیپ کے قریب رکے ہوئے دیکھا تھا اور اب وہ سوچ رہا تھا کہ کیا پولیس نے ان کا سراغ لگالیا ہے۔

ہماری قدموں کی آوازیں اس کے دماغ میں دھماکے سے پیدا کر رہی تھیں۔ اس

نے سینا کے دہشت زدہ چہرے کی طرف دیکھا اور پھر باہر والے دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ مختصر رہا کسی بھی لمحے دروازہ توڑا جاسکتا تھا۔

☆=====☆=====☆

مسلم ٹاؤن کی عالیخان کوٹھی میں رہنے والا حافظ عبدالرشید دنیا کی نظروں میں نہایت شریف اور باعزت انسان تھا۔ وہ پانچوں وقت کی نماز مسجد میں جاکر پڑھتا۔ روزے، زکوٰۃ کی سختی سے پابندی کرتا۔ مذہبی تقویات اور جہلوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا۔ رفتی اداروں اور انجمنوں کو دل کھول کر چندے دیتا۔ آج تک کوئی سوالی اس کے دروازے سے غلط ہاتھ نہیں لوٹا تھا۔ وہ جب بھی گھر سے باہر نکلتا اس کے ہاتھ میں تسبیح ضرور ہوتی۔ وہ جس راہ سے بھی گزرنا توگ اے جھک جھک کر سلام کرتے۔ وہ تین مرتبہ حج کی سعادت حاصل کر چکا تھا اور متعدد افراد کو بھی اپنے خرچ پر حج کر دیا تھا۔ وہ بہت متقی اور پرہیزگار شخص سمجھا جاتا تھا۔

لیکن حافظ عبدالرشید کی اصلیت کیا تھی؟ وہ تو شاید اس کی رفیقہ حیات بھی نہیں جانتی تھی۔ بظاہر متقی اور پرہیزگار، باعزت اور شریف انسانوں کی طرح زندگی بسر کرنے والا حافظ عبدالرشید انسانیت کا سب سے بڑا دشمن اور وہ کبڑا تھا جو معاشرے کو اندر ہی اندر دیکھ کر طرح چاٹ رہا تھا۔ وہ اسی درخت کی جڑیں کو کھلی کر رہا تھا جس پر اس کا بھی آشیانہ تھا۔

حافظ عبدالرشید ہیروئن کا بیوپاری تھا۔ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ پینتیس سال پہلے جب وہ دس گیارہ سال کا تھا تو پشتاور کے مخفی قسم کے قجر غاٹوں میں واپس کر کے لوگوں کا دل بھلایا کرتا تھا۔ وہ بہت حسین لڑکا تھا۔ صحت مند اور گول منہ۔ جب اسے لڑکیوں کے کپڑے پہنا دیئے جاتے تو اسے دیکھ کر کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا تھا کہ وہ لڑکی ہے یا لڑکا۔ پتہ نہیں وہ اس گروہ کے بہتے کیسے چڑھ گیا تھا جس نے اسے قجر غاٹوں میں چھپنا شروع کر دیا اور خوب روپیہ کمایا تھا لیکن اسے دو وقت کی روٹی کے سوا کچھ نہیں ملتا تھا۔ اسی دوران میں وہ پشتاور کے ایک بدنام زمانہ منشیات فروش کے ہاتھ لگ گیا اور وہ اسی کے لئے کام کرنے لگا۔ وہ کئی سال تک چرس بیچتا رہا پھر پشتاور سے بھاگ کر لاہور آ گیا۔ یہاں وہ ہیرا منڈی میں چارخ پھلون کے ہاتھ لگ گیا۔ چارخ دین کسی زمانے میں پہلوانی کیا کرتا

تھا لیکن اب اس کے سارے دم غم نکل چکے تھے۔ عورتوں کی دلی کے علاوہ اس نے منشیات کا دھندہ شروع کر دیا۔ ان دنوں ہیروئن بی بی خنی خٹاف ہوئی تھی۔ افغانستان پر روس تسلط جانے کی کوشش کر رہا تھا لڑائی پورے ملک میں پھیلی جا رہی تھی۔ افغان شہری اپنا ملک چھوڑ کر پناہ کی تلاش میں پاکستان کا رخ کر رہے تھے اور پاکستانیوں کے لئے اپنے تپاہ ہوتے ہوئے ملک سے ہیروئن کا ختم بھی یہ لوگ لے کر آئے تھے۔ افغان باشندے سرحدوں پر ہمارے کیپڑوں سے نکل کر کینسر کی طرح پورے پاکستان میں پھیلنے لگے اور ان کے ساتھ آئی ہوئی ہیروئن بھی پاکستانی نوجوانوں کے خون میں ڈھبھولنے لگی۔

چراغ بھلوان نے بھی ہیروئن کا دھندہ شروع کر دیا۔ ہیروئن چرس کے مقابلے میں اگرچہ منگنی تھی لیکن پڑا ہند تھا اس میں۔ بڑا سرور تھا لوگ بڑی تیزی سے اس سے نشے کو اپنانے لگے۔ اگرچہ بہت جلد اس کی چاہ کالیاں سامنے آنے لگی تھیں لیکن ہیروئن استعمال کرنے والوں کی تعداد میں حیرت انگیز طور پر اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ہیروئن بیچنے والے دونوں ہاتھوں سے دولت سیٹھ لگے۔ وہ راتوں رات لکھ پتی اور کروڑ پتی بنتے چلے گئے۔

ایک سال کے اندر اندر چراغ بھلوان بنے سمن آباد میں کوٹھی بنوائی۔ عبدالرشید اسی کے پاس کمیشن پر کلام کر رہا تھا لیکن اس نے ٹھنڈی یہ کہہ کر چراغ بھلوان کا ساتھ چھوڑ کر اس نے اپنے طور پر یہ دھندہ شروع کر دیا۔ وہ اس بزنس کے اسرار و رموز سے واقف ہو چکا تھا۔ ویسے بھی چالاک آدمی تھا۔ بہت جلد آگے نکلا چلا گیا۔

کسی بھی بزنس میں ذہانت اور چلائی کو غیاد کی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور عبدالرشید کی ذہانت اور چلائی میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ منشیات کا دھندہ کرنے والوں کی پکڑوٹھڑ ہوتی رہتی تھی لیکن عبدالرشید نے اپنے آپ کو بیشہ بچار کر رکھا تھا اور پھر اس نے اپنے آپ کو منظر عام سے بھی ہٹا لیا۔ اس نے دن پورہ میں ایک مکان کرائے پر لے لیا اور ایک شریف انسان کی طرح وہاں رہنے لگا جبکہ اس کے کارندے مصری شاہ، ہیرا منڈی، لکشی چوک اور ایسے ہی علاقوں میں پھیلے اس کے بزنس کو ترقی دے رہے تھے۔ اس کا کوئی کارندہ کبھی دن پورے والے مکان پر نہیں آیا تھا۔ وہ علاقے کے رفق و اولاد سبھی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگا اور پھر اس نے مسجد میں جا کر نماز بھی پڑھنا شروع کر دی تھی۔

عبدالرشید چار سال دن پورے والے اس مکان میں رہا پھر اس نے ساندہ میں ایک مکان خرید لیا۔ وہ دو سال اس مکان میں رہا یہاں بھی اس نے اپنی شرافت کی دھاک بٹھالی۔ یہیں پر رہتے ہو اس نے پہلا جیو کیا تھا۔ اس کا پڑوسی چاچا مال دین بہت غریب آدمی تھا۔ ان کا گزر پیٹنے کی تنخواہ پر ہوتا تھا جو کسی سرکاری جگہ میں کلرک تھا چاچا جمال بڑا متقی اور پرہیزگار آدمی تھا۔ تنگ دستی کے باوجود اس کی زبان پر کبھی شکوہ نہیں آیا تھا۔ اس کی صرف ایک ہی خواہش تھی کہ اسے حج کی سعادت نصیب ہو جائے۔ وہ اکثر اس خواہش کا اظہار بھی کیا کرتا تھا اور پھر اسی سال عبدالرشید، چاچا جمال دین اور اس کی بیوی کو لے کر حج پر چلا گیا۔ چاچا جمال دین اور اس کی بیوی نے اسے جو دعائیں دیں سو دیں، سچے والے بھی اس کا خیر پر عبدالرشید کو دعائیں دے رہے تھے۔

حج کے دوران میں عبدالرشید نے سوچا تھا کہ اب وہ منشیات کا یہ گھناؤنا بزنس چھوڑ دے گا۔ اس کے پاس بہت پیسہ تھا۔ وہ کوئی جائز بزنس کر لے گا۔ دکان کھولے گا۔ لیکن حج سے واپس آنے کے بعد اس کی نیت پھر ڈالواں ڈول ہو گئی۔ دولت کے سترے چال نے اسے پوری طرح بکڑ رکھا تھا۔ اس چال میں چھپنے کے بعد کوئی بھی اس سے نہایت حاصل کرنا نہیں پاتا۔

عبدالرشید نے ساندہ کا وہ مکان چھوڑ کر علامہ اقبال ٹاؤن میں پلاٹ خرید کر کوٹھی بنوائی۔ ان دنوں علامہ اقبال ٹاؤن نیا نیا آباد ہوا تھا۔ عبدالرشید کو سستا پلاٹ مل گیا تھا۔ لیکن کچھ ہی عرصے بعد اس نے یہ کوٹھی بیچ دی اور مسلم ٹاؤن میں ایک بڑی کوٹھی خرید لی جس میں اس نے اپنی مرضی سے کچھ تبدیلیاں بھی کروائی تھیں۔

یہاں رہتے ہوئے اسے کئی سال ہو گئے تھے۔ وہ دو مرتبہ اور حج کر آیا تھا۔ پورے مسلم ٹاؤن میں اس کی شرافت اور دین داری کی دھاک بٹھی ہوئی تھی۔ لوگ اسے حافظ جی کہہ کر پکارتے تھے۔

حافظ عبدالرشید نہ صرف سلمیٰ اور فلاحی کلاں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا، ایسے اداروں کو بڑے بڑے چندے دیتا بلکہ اس نے خواتین کی فلاح و بہبود کے لئے ایک ادارہ بھی کھول رکھا تھا جس کے تمام اخراجات وہ اپنی جیب سے برداشت کرتا۔

خواتین کی فلاح و بہبود کا یہ ادارہ وحدت روز کی ایک کوٹھی میں قائم تھا۔ یہ کوٹھی



وہ تقریباً آدھے گھنٹے تک باتیں کرتے رہے اور پھر حافظ عبدالرشید نے آواز دے کر ملازم لڑکے کو بلا لیا۔ ”اوئے لڑکے۔ چائے کے لئے تو کہہ دو۔۔۔۔ اور سنو۔۔۔۔۔ شیانہ سے کہنا چائے وہ لے کر آئے۔“

لڑکا عجیب سی نظروں سے ان کی طرف دیکھتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

شیانہ اپنے کمرے میں پیگ پر بیٹھ رہی تھی۔ ملازم لڑکے نے حافظ جی کا حکم سنایا تو شیانہ کو زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ حافظ جی اکثر اس کے ہاتھ کی چائے پیا کرتے تھے اور آج تو گھر کے دوسرے لوگ بھی کسی دعوت میں گئے ہوئے تھے۔ شیانہ طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے گھر ہی میں رہ گئی تھی۔ وہ یکن میں آکر چائے پیتے تھی۔ ملازمہ اپنے کاموں میں لگی رہی۔ چائے پینے کے بعد شیانہ نے برتن ڈال کی ترے میں سجائے اور ڈرائی دھیلیکی ہوئی ڈرائنگ روم آگئی۔

ولادور کو اس نے اکثر حافظ جی کے پاس آتے دیکھا تھا لیکن اس عرب شیخ کو دیکھ کر وہ ٹھک ٹھکی تھی۔ وہ نظریں جھکائے آگے بڑھتی رہی پھر ڈرائی سے برتن اٹھا کر شیشے کے ٹاپ والی سینٹر ٹیبل پر رکھ کر چیمے ہی واپس جانے کے لئے مڑی، حافظ جی کی آواز سن کر رک گئی۔

”شیانہ بیٹی۔ شیخ راشد ہمارے بہت ہی خاص مہمان ہیں۔ عمان سے آئے ہیں۔ اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر دو۔“

حافظ جی کا یہ حکم شیانہ کے لئے بڑی حیرت کا باعث بنا کیونکہ اس گھر میں پردے کی سختی سے پابندی کی جاتی تھی لیکن آج حافظ جی نے اسے نہ صرف مہمانوں کے سامنے بلا لیا تھا بلکہ اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر مہمانوں کو پیش کرنے کا حکم بھی دے دیا تھا۔ چائے پیتے ہوئے شیانہ نے محسوس کیا کہ طوطے کی طرح خفیدہ ناک والا عرب شیخ بڑی گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شیانہ نے ایک کپ حافظ جی کے سامنے رکھا، ایک ولادور کے سامنے اور تیسرا کپ عرب شیخ کی طرف بڑھاتے ہوئے شیانوں کا دوپٹہ اس کے سینے سے سرک گیا۔ شیخ کی نظریں اسے کانٹوں کی طرح اپنے سینے پر جھپتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ وہ دوپٹہ درست کرتے ہوئے ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ واپس جاتے ہوئے بھی اس نے عرب شیخ کی نظروں کو اپنے بدن پر چپٹے ہوئے

محسوس کیا تھا۔

اس نے ڈرائنگ روم سے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ ٹھٹک کر رک گئی۔ وہ ولادور کی آواز تھی جو اس کی ساعت سے ٹکرائی تھی۔ ”مال تو واقعی زوردار ہے حافظ جی۔ قیامت ہے قیامت۔۔۔۔۔“

شیانہ کا دل یکبارگی دھڑک اٹھا۔ وہ وہیں پردے کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔ ”اپنے شیخ سے پوچھو کہ لونڈیا اسے بھی پسند آتی یا نہیں۔“ یہ حافظ عبدالرشید کی آواز تھی۔

”ام کو بوت پسند آیا۔“ عرب شیخ کی آواز ابھری۔ ”بولو۔۔۔۔۔ کیا مانگتا ہے۔ ام بوت رقم لایا۔۔۔۔۔“

”بیچیس لاکھ۔“ حافظ عبدالرشید نے جواب دیا۔

”نہیں لاکھ۔“ عرب شیخ نے کلمہ ”رقم لو اور لڑکی کو ابھی ہمارے ساتھ۔۔۔۔۔“ اس وقت نہیں۔ وہ مشکوک ہو جائے گی۔ صبح سات بجے آجائے میں اسے کسی بھانے تمہارے ساتھ بیچ دوں گا پھر سنبھالنا تمہارا کام ہو گا۔“ حافظ جی نے کلمہ ”ام سنبھال لے گا۔“ عرب شیخ نے جواب دیا۔

شیانہ کے دماغ پر ہتھوڑے سے برس رہے تھے۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے پگھلا ہوا سیرس اس کے کانوں میں اڑنا چاہا ہو۔ حافظ عبدالرشید اسے بتی کہہ کر بلا لیا کرتا ہے۔ کیا کوئی باپ اس طرح بتی کا سودا کر سکتا ہے۔ نہیں۔ نہیں۔۔۔۔۔ میرا وہم ہے۔ جو کچھ بھی میں نے سنا میری ساعت کا قریب ہے۔ میرا داہمہ ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ شیانہ کا دماغ ماؤف ہوا جا رہا تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے تاریکی سی پھیلنے لگی اور قریب تھا کہ وہ اپنے حواس کو یقینی اندر سے ولادور کی آواز سنائی دی۔

”اچھا تو حافظ جی۔ ہم چلتے ہیں۔ صبح سات بجے پہنچ جائیں گے۔ لونڈیا کو تیار رکھئے۔“

شیانہ کے روٹنے کھڑے ہو گئے۔ ”تو کیا واقعی ایک باپ نے میں لاکھ میں اپنی بیٹی کا سودا کر دیا؟“ اس کے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ وہ اپنے آپ کو کھینچتی ہوئی کمرے میں آکر بیٹھ پر گر گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ آنکھیں بند کر کے

ایک سائیکل سوار چوکیدار سہیلی بجاتا ہوا دائیں طرف کے موڑ سے گلی میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ فوراً اندر آگئی وہ دروازہ آہستگی سے بھیڑ دیا۔

چوکیدار سامنے سے گزر گیا۔ سہیلی کی آواز دور ہوتی چلی گئی۔ وہ منٹ بعد اس نے ایک بار پھر دروازہ کھولا اور گردن نکال کر باہر جھانکے گئی۔ چوکیدار کی سائیکل اگلے موڑ پر ایک طرف گھومتی ہوئی نظر آئی۔

شبانہ کا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔ باہر اگر اس نے دروازہ آہستگی سے بھیڑ دیا اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ایک طرف چلے گئی۔ اس کی رفتار میں بتدریج تیزی آ رہی تھی اور پھر وہ دوڑنے لگی۔

دوڑتے دوڑتے اس کا سانس پھول گیا لیکن اس نے اپنی رفتار میں سستی نہیں آنے دی۔ وہ جلد سے جلد یہاں سے اتنی دور چلی جانا چاہتی تھی کہ حافظ عبدالرشید کے ہاتھ اس تک نہ پہنچ سکیں۔ نہ جانے وہ کب تک دوڑتی رہی۔ اسے تو یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ وہ کس طرف جا رہی ہے۔ وہ تو بس دوڑتے جا رہی تھی۔

وہ حافظ عبدالرشید کی کوٹھی سے بہت دور آچکی تھی۔ ایک بڑی سڑک پار کر کے وہ ایک اور کشادہ گلی میں داخل ہو گئی۔ یہاں بھی دونوں طرف بڑی بڑی کوٹھیاں تھیں۔ وہ ایک کوٹھی کے قریب رک گئی اور دیوار سے ٹک لگا کر اپنے اٹھتے ہوئے اور بے ربط شخص پر غور پانے کے کوشش کرنے لگی۔

پانچ منٹ گزر گئے۔ وہ اب تک بے تحاشہ دوڑتی رہی تھی۔ اس کی انگلیں شل ہو گئی تھیں اور پاؤں دھکنے لگے تھے۔ وہ گھر سے نکلے پاؤں نکلی تھی اور اندر داخل ہو کر دوڑتے ہوئے پیر ڈھکی ہو گئے تھے۔ وہ دیوار سے ٹک لگا کر بیٹھ گئی اور زخمی سر ہلانے لگی۔ اسی وقت دور کہیں کسی چوکیدار کی سہیلی کی آواز سنائی دی جو کہ یہ گھر قریب آئی تھی۔

شبانہ نے متحوش نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ کر دائیں طرف کے موڑ سے ایک سایہ ہاتھ میں پکڑی ہوئی لاٹھی سڑک پر بجاتا ہوا گلی میں داخل ہوا۔ شبانہ نے ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھ چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ ہمیں بھی رہتی چوکیدار کی نظروں میں آسکتی تھی البتہ وہ دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی جس سے وہ ٹک لگنے بیٹھی تھی۔ وہ احتیاط سے لاٹھی اور دیوار پر چڑھ کر بڑی آہستگی سے دوسری طرف بھاگتی۔

لبے لمبے سانس لینے لگی اور پھر اس کے ذہن کے عمیق ترین گوشے سے اس کے باطن کی دھندلی سی تصویر ابھرے گئی۔ جو کہ یہ گھر صاف ہوتی چلی گئی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے میلے کا وہ منظر گھوم گیا جب وہ اپنے بھائی کے ساتھ میلے میں ایک دکان پر مشغول لینے کے لئے رکی تھی اور اس وقت کسی ناگہانی آفت نے اسے اپنے فکریے میں پکڑ لیا تھا اور وہ کئی لوگوں کے پاس ہوتی ہوئی آخر کار تین سال پہلے حافظ عبدالرشید کے پاس پہنچی تھی۔ حافظ عبدالرشید نیک اور پرہیزگار آدمی تھا۔ شبانہ نے زندگی میں پہلی مرتبہ سمجھ کہ اس کا سانس لیا تھا۔ وہ جہاں بھی گئی اسے کھانا سمجھ کر اس سے کھانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اپنے آپ کو ان انسان نما بھیڑیوں سے بچاتی رہی۔ حافظ عبدالرشید کے گھر میں رہتے ہوئے اسے کسی لمحے بھی ایسا کوئی خلوص محسوس نہیں ہوا تھا۔ حافظ جی نے اسے لاوارث کہہ کر اپنی بیٹی بتایا تھا اور اسے بیٹی ہی کی طرح رکھا تھا لیکن آج اس کی اصلیت کھل گئی تھی۔ وہ بظاہر جتنا نیک اور پرہیزگار نظر آتا تھا اندر سے وہ کہیں زیادہ کمرہ اور گھمٹاؤ ثابت ہوا تھا۔

”حافظ میرا سودا کر چکا ہے۔۔۔ صرف اور صرف آج کی رات۔۔۔“ اس نے سوچا اور پھر زیر لب بڑبڑائی۔ ”میں“ نہیں میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ اسے اپنے گھمٹاؤ مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔“

ابھی صرف ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ مگر کہ افراد اگرچہ موجود نہیں تھے لیکن توکم چاکر جاگ رہے تھے۔ وہ وقت گزرنے کا انتظار کرتی رہی۔ لمبے صدیاں بن کر بیت رہے۔ بارہ بجے کے قریب گھر والے دعوت سے واپس آئے۔ کوٹھی میں چل پل سی رہی تھی لیکن وہ اپنے کمرے سے نہیں نکلی اور پھر ساری آوازیں بتدریج محسوس ہوتی چلا گئیں۔

تین بج گئے۔ وہ آہستگی سے بیگ سے اتری۔ احتیاط سے دروازہ کھولا اور ادھر ادھر جھانکے ہوئے آہٹ لینے کی کوشش کرنے لگی۔ گھیر خاموشی اور سناٹا تھا۔ وہ کمرے سے نکل کر دیے دھواں چلتی ہوئی پچھلے لان میں آگئی اور عقبی دیوار کی طرف چلے گئی۔ ۲۱ طرف بھی پچھلی گلی میں کھلنے والا ایک چھوٹا دروازہ تھا جسے اندر سے کھڑا لگا رہتا تھا۔ ۲۱ نے بڑی احتیاط سے کھڑا بتا دیا اور پھر قدامتاً باہر کھائی تھا کہ اس کا دل اچھل کر معلق رہا۔

وہ جس جگہ کودی تھی وہاں سے کچھ فاصلے پر پودوں کی باز نظر آئی۔ وہ باز کے دوسری طرف نکل کر گھاس پر بیٹھ گئی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی نرم گھاس زخمی پیروں سے مس ہوئی تو اسے بڑا سکون ملا۔

رات بھر جاگنے اور اس بھاگ دوڑے سے وہ بری طرح تھک گئی تھی۔ ٹانگوں میں درد اور آنکھوں میں شدید جلن ہو رہی تھی۔ وہ اس خیال سے دیوار کے اندر کودی تھی کہ چوکیدار آگے چلا جائے گا تو وہ یہاں سے نکل جائے گی لیکن سمجھنے نے اسے بے فائدہ کر دیا۔ قند ٹھنڈی اور نرم گھاس پر گرے ہی اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ چوکیدار کی سٹیج کی آواز بھی یوں لگ رہی تھی جیسے بہت دور سے آرہی ہو۔ وہ اپنے خصل ہوتے ہوئے حواس پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس کے اعضا ڈھیلے پڑتے گئے اور کچھ ہی دیر بعد وہ نیند کی آغوش میں بیچ بچک تھی۔

گلی سے گزرتی ہوئی کسی کار کے بارن سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ دھوپ براہ راست اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں چند لمحوں میں کھلیں اور پھر آہٹ پا کر اس نے دوبارہ آنکھیں کھول کر دیکھ لیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کا دل اچھل کر طوق میں آگیا۔ کوئی اس کے قریب کھڑا قند کالے پچکتے ہوئے جوتے، بان کے اوپر خاکی پتلون کے پائینچے، اس کی نظریں آہستہ آہستہ اوپر اٹھتی گئیں۔ اس کا جسم پیٹے میں تر ہونے لگا اور دل کی دھڑکن خطرناک حد تک تیز ہو گئی۔



بھاری قدموں کی آوازیں دروازے کے سامنے رک گئیں۔ ایک لمبے کو خاموشی رہی۔ بشارت کا خیال تھا کہ کسی بھی لمبے دروازہ زور زور سے دھڑھڑھڑا جائے گا۔ آخر سے لپٹی ہوئی سنیا بھی کسی ایسے ہی قوسے کی شہر تھی کہ ابھی دروازہ ٹوٹے گا اور پولیس والے راتھلیں کھینچ کر اندر گھس آئیں گے لیکن۔

چند سیکنڈ بعد ہی بھاری قدموں کی وہ آوازیں آگے بڑھ گئیں۔ البتہ دروازے کے سامنے بیڑیوں پر کسی کے بولنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ دونوں دم سارے بیٹھ رہے اور پھر چند لمحوں بعد ہی اسی منزل پر آگے کسی جگہ شور کی آواز سنائی دی۔ بھاگ دوڑ کی آوازیں اور پھر ایک سنگل فائر۔ اس کے بعد یوں لگا جیسے تین چار آدمی مل کر کر

آدمی کو پھینکی لگا رہے ہوں۔ اس آدمی کی پچیس سنائی دے رہی تھیں۔

سنیا اور بشارت نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ لیں۔ سنیا نے در نہیں گئی کہ پولیس انہیں پکارتے نہیں آئی تھی بلکہ معاملہ کچھ اور قند بشارت نے سنیا کو اپنے سے الگ ہٹایا اور اٹھ کر دبے قدموں چلا ہوا دوسرے کمرے میں آگیا۔ اس کمرے کی جی بھی ہوئی تھی۔ وہ باہر والے دروازے کے قریب رک گیا اور جھک کر کی ہول سے باہر جھانکنے لگا۔

بیڑیوں کی چلی لینڈنگ پر بلب جل رہا تھا جس کی روشنی اوپر بھی آرہی تھی۔ یہ بلب بعد میں کسی وقت جلا یا گیا تھا کیونکہ جب وہ لوگ آئے تھے تو اس وقت اندر ابرا قند کی ہول سے صرف سامنے کا منظر نظر آرہا تھا۔ بیڑیوں پر دو پولیس والے راتھلیں سمٹائے کمرے تھے۔ چند سیکنڈ بعد ہی ایک اور پولیس والا راہداری کی طرف بے آکر تیزی سے بیڑیاں اترتا چلا گیا۔

اپنے کندھے پر ہلکا سا دیو محسوس کر کے بشارت سیدھا کھڑا ہو گیا۔ سنیا اس کے قریب کھڑی تھی۔ بشارت نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ سنیا نے بھی کی ہول سے آنکھ لگا کر دیکھا اور پھر ایک جھٹکے سے سیدھی ہو گئی۔

دونوں دبے قدموں چلتے ہوئے اسی کمرے میں آگئے۔ سنیا کے چہرے پر اب بھی خوف کے تاثرات تھے۔

”میں تو جیسے بہت ہلوار سمجھتا تھا۔“ بشارت نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔ ”لیکن تم تو پولیس کا سائزن بن کر ہی حواس کھو بیٹھی تھیں۔ اگر پولیس اندر آجاتی تو شاید تمہارا ہارٹ ٹپل ہو جاتا۔“

”میں بزدل نہیں ہوں۔“ سنیا نے اسے گھورتے ہوئے جواب دیا۔ اس کی آواز بھی سرگوشی سے زیادہ اونچی نہیں تھی۔ ”میں نیند میں تھی۔ سائزن کی آواز سن کر گزربڑا گئی لیکن یہ پولیس والے ہمارے دروازے کے سامنے کیوں کھڑے ہیں۔“

”اس بلڈنگ میں کن کن لوگوں کے دفتر ہیں۔ میرا مطلب ہے وہ کیوں کے علاوہ؟“ بشارت نے پوچھا۔

”زیادہ تر وہ کیوں ہی کے ہیں۔ ہائی کورٹ یہاں سے قریب ہے۔“ سنیا نے جواب

دیا۔ ”دو بے دیا تین دفتر امپورٹ ایکسپورٹ کمپنیوں کے بھی ہیں لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ پولیس نے چھاپہ مکمل مارا ہے۔“

”میرا خیال ہے اس وکیل کے دفتر پر جس کے بارے میں چوکیدار نے بتایا تھا کہ وہ بیٹھا کسی کیس کی اسٹری کر رہا ہے۔ ٹھیک صورت حال کاظم تو صبح ہو گا۔ چوکیدار سے۔“

بشارت نے جواب دیا۔ ”دو بے اگر پولیس میں چھاپہ مارتی تو ہمارے فرار کا کوئی راستہ تھا؟“

”وہ کھڑکی۔“ سنیا نے اشارہ کیا۔ ”پولیس کی گولیوں سے بچنے کے لئے اس کھڑکی سے ہی چھلانگ لگا کر زندگی سے فرار حاصل کیا جاسکتا ہے۔“

بشارت اسے گھور کر رہ گیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ایک بار پھر ہماری قدموں کی آواز سنائی دی۔ بشارت، سنیا کو وہیں بیٹھے رہنے کا اشارہ کر کے بیرونی دروازے کے قریب پہنچ گیا اور جھک کر کی ہول سے جھانکنے لگا۔ پہلے تین پولیس والے دروازے سے گزر کر سیڑھیاں اترنے لگے۔ ان کے پیچھے لمبے قد کا ایک ہماری بھرم آدی تھا جس نے سفید دھوئی اور کرتا پہن رکھا تھا۔ اس کی بائیں ٹانگ پر سے دھوئی خون آلود تھی اور وہ لنگڑا چل رہا تھا۔ دائیں بائیں دو پولیس والوں نے اسے پکڑ رکھا تھا۔ ایک پولیس والے نے پیچھے سے راتھل کی ٹال اس کی پشت سے لگا رکھی تھی۔ آخر میں ایک ایکسکیز، وکیل اور عمارت کا چوکیدار تھا۔ وکیل کو بشارت نے اس کے سیاہ کوٹ سے پچھانا تھا۔ بشارت وہیں سے ہٹ کر سنیا کے پاس آ گیا۔

”میرا اندازہ درست نکلا۔“ بشارت نے سرگوشی میں سنیا کو بتایا۔ ”چھاپہ وکیل کے دفتر پر ہی پڑا تھا۔ وہیں ایک اور آدی بھی موجود تھا جسے پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔ وہ زخمی تھا۔ اس نے شاید بھاگنے کی کوشش کی ہو گی۔ اس کی ٹانگ میں گولی لگی ہے۔“

”کون ہو سکتا ہے؟“ سنیا پوچھ رہی تھی۔

”یہ تو صبح ہی پتہ چلے گا۔“ بشارت نے کہا۔

پچھے سڑک پر کم از کم دو گاڑیاں اشارت ہونے کی آواز سنائی دی۔ چند سیکنڈ بعد گاڑیاں روانہ ہو گئیں۔ سنیا اٹھ کر کھڑکی کے سامنے آگئی اور جھک کر پیچھے دیکھنے لگی۔

سڑک اب مستان پڑی تھی۔

دوبارہ نیند آنے کا اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ دونوں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ بشارت نے آفس ٹیبل کے سامنے بیٹھے کی الماریوں کے اوپر دیوار پر لگے ہوئے کلاک کی طرف دیکھ کر پانچ بجتے والے تھے۔

پہلے نمودار ہونے لگا تھا۔ وہ دونوں ایک بار پھر اپنی غنڈوں کے بارے میں باتیں کرنے لگے جنہوں نے ان کا تعاقب کیا تھا اور ایک اپنے ہی ساتھی کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ ”میں نے پہلی مرتبہ جب انہیں دیکھا تھا تو مجھے اسی وقت شبہ ہوا تھا۔“ بشارت کہہ رہا تھا۔ ”ان میں سے ایک کو دیکھ کر تو مجھے یوں لگا تھا جیسے میں نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہو لیکن ابھی تک کچھ یاد نہیں آ رہا۔“

”کون سا..... جو مارا گیا یا جو بھاگ گیا؟“ سنیا نے پوچھا۔

”اب بھی یاد نہیں کہ ان میں مارا کون گیا ہے اور بھاگا کون تھا۔“ بشارت نے جواب دیا۔ ”لیکن اگر زندہ بچ جائے والا وہی ہے جس کا چہرہ مجھے جانا پہچانا لگا تھا تو مجھے یقین ہے کہ بہت جلد اس سے دوبارہ ملاقات ہو گی۔“

”مجھے ایک اور خیال آ رہا ہے۔“ سنیا نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے وہ شمیم کے آدی نہ ہوں۔ وہ کوئی اور ہوں اور مجھے..... میرا مطلب ہے ہمیں دیکھ کر ان کی نیت میں فتنہ آ گیا ہو۔ آج کل یہی سب کچھ ہو رہا ہے۔ انہوں نے سوچا ہو گا کہ جیسے کس مار پیٹ کر ڈال دیں گے اور مجھے ساتھ لے جائیں گے۔“

”ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو۔“ بشارت نے جواب دیا۔

دن کی روشنی ٹیبل بجلی تھی۔ توڑی دیر بعد دھوپ نکلنے والی تھی۔ سڑک پر ٹریفک کی آمد و رفت شروع ہو چکی تھی۔ سنیا نے اٹھ کر ایک بار پھر کھڑکی سے باہر جھانک کر سامنے والی عمارتوں کے نیچے اکا دکا دائیں کھانا شروع ہو گئی تھیں۔ سنیا کھڑکی سے ہٹ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی اور باہر کا دروازہ کھول کر چوکیدار کو آوازیں دینے لگی۔ چوکیدار اس وقت عمارت کی پہلی منزل پر تھا۔ آواز سن کر دروازہ کھول کر آگیا۔

”چوکیدار۔ دیکھو قریب ہی کوئی ہوٹل کھل گیا ہو تو ہمیں چائے لا دو اور کچھ کھانے کو بھی لے آنا۔ جو بھی مل جائے۔“ سنیا نے کہا۔

”جی جیکم صاحب۔ میں ابھی لے کر آتا ہوں۔ یہ وہ رات والی چیک۔“ چوکیدار



بولے۔

سینا نے اندر آکر اپنے پرس میں سے چھاس کاغذ نکالا اور چیک اور پالیاں بھی اٹھا کر چوکیدار کو دے دیں۔ چوکیدار جانے لگا تو سینا بولی۔ ”اور ہاں..... رات کو یہاں کیا ہوا تھا؟“

”وہ جی وکیل صاحب ہیں بلکہ رات کو ان کے پاس ایک بندہ بھی بیٹھا ہوا تھا۔ قصور کا زہن دار ہے۔ اس کے ہاتھوں کوئی بندہ مارا گیا تھا جی وہ گرفتاری سے پہلے ضمانت کرانا چاہتا تھا ہائی کورٹ سے۔ وکیل صاحب رات کو اس کا کام کر رہے تھے۔ پولیس کو کسی طرح پتہ چل گیا۔“

”اس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی؟“ سینا نے پوچھا۔

”آہو جی۔“ چوکیدار نے جواب دیا۔ ”وہ پولیس کے سائرن کی آواز سن کر چھت پر چڑھ گیا تھا۔ تھانے دار نے اسے دیکھ کر کوئی چلا دی۔ اگر اسے کوئی نگلتی تو وہ چھت کے دوسری طرف چھٹا لگ دیتا اور نیچے گر کر ہڈیاں پھیلے تروا بیٹھتا۔“

”جان بڑی پیاری ہوتی ہے چوکیدار۔ وہ اپنی جان بچانے کے لئے ہی بھاگا ہو گا۔ خیر..... تم جاؤ۔ چائے لے کر آؤ۔“ سینا نے کہتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔

بشارت اس دوران میں اپنی جگہ پر بیٹھا ان کی باتیں سنتا رہا۔ اس کے اندازے کہ تصدیق ہو گئی تھی۔

آدھے گھنٹے بعد چوکیدار چائے اور دو پیٹے بن کر لے آیا۔ بشارت نے صرف چائے پر ہی اکتفا کیا تھا جبکہ سینا دونوں بن کھا گئی۔ اسے واقعی بہت بھوک لگ رہی تھی۔ ساڑھے سات بجے کے بعد اس عمارت میں واقع دفتر کھانا شروع ہو گئے اور آٹھ بجے تو اچھی خاصی چل پھل ہو گئی۔ لوگوں کی آمد و رفت اور باتوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

سینا نے دوسرے کمرے میں جا کر دو کارٹن کھولے اور ان میں سے ریٹنگر کی ایک جینز کی پینٹ اور نیلے چیک کی شرٹ نکال لائی۔

”یہ کپڑے کہاں سے آئے؟“ بشارت نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرا

دیکھا۔

”باہر کا مال ہے۔ کارٹن بھرے پڑے ہیں اور میرا خیال ہے یہ تھمارے جسم پر فٹ آئیں گے۔ ظاہر ہے تم وہ خون آلود فیض پھن کر تو باہر نہیں نکل سکتے اور تھماری اس پینٹ پر بھی کچھ چھیننے نظر آرہے ہیں۔“

بشارت کپڑے لے کر ہاتھ روم میں گھس گیا۔ رات کے واقعات اور پھر جاننے کی وجہ سے اس کا دماغ سنگ رہا تھا۔ غصے نے پانی کے غسل سے اس کی کسکدی سی حد تک دور ہو گئی۔ وہ کپڑے بدل کر باہر نکلا تو اسے دیکھ کر سینا کے ہونٹوں پر خفیف مسکراہٹ آئی۔ یہ کپڑے بشارت کے جسم پر بالکل فٹ آئے تھے۔

سینا بھی تیار ہو گئی۔ اس نے خراشوں پر ایک بار پھر لوٹن لگا لیا تھا۔ اس کی فیض ایک کندھے سے چھٹی ہوئی تھی جہاں اس نے میز کی دراز سے ایک چھوٹا بکلی نکال کر لگا لیا۔

دفتر سے نکل کر شاہراہ قائد اعظم پارک کے ہال روڈ اور میو اسپتال کے سامنے اسپتال روڈ سے ہوتے ہوئے لہری کے سامنے نکل آئے اور پھر بھائی میٹ اور داتا دربار کے سامنے سے گزرتے ہوئے کھلی گیٹ کی طرف آ گئے۔

یہ لوگ فوج کے قریب دفتر سے نکلے تھے اور اس وقت پونے وس کا وقت ہو رہا تھا۔ بی بی گھر میں موجود تھی۔

”بی بی ناشتہ بنادو بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔“ سینا کہتے ہوئے اپنے کمرے میں گھس گئی۔

بشارت ہال میں صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔ آدھے گھنٹے بعد سینا تیار ہو کر نکل تو بی بی بھی ناشتہ تیار کر چکی تھی۔ میز پر بیٹھے سے پہلے سینا نے بی بی فون کا رسیور اٹھا کر دیکھا۔ فون آ رہی تھی۔

”بی بی کسی کا فون تو نہیں آیا تھا؟“ اس نے رسیور رکھتے ہوئے پوچھا۔

”اے ہاں..... میں تو بتانا بھول گئی تھی۔“ بی بی نے پلٹیں میز پر لگاتے ہوئے جواب دیا۔ ”کوئی عورت تھی۔ اس نے اپنا تال تو نہیں بتایا۔ کبھی تھی پھر فون کر لے گی۔“

”عورت؟“ سینا بڑبڑائی۔ اس کے جاننے والوں میں ظاہر ہے خواتین بھی تھیں

لیکن اس وقت صرف ایک نام اس کے ذہن میں آسکا تھا۔ خبثتم..... سنیتا کا شبہ اب یقین میں بدلتا جا رہا تھا کہ رات کو اسی کے آدمیوں نے اسے گھیرنے کی کوشش کی تھی اور پھر آئے گئے بعد اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔  
ناشتے کے بعد وہ بشارت کے سامنے بیٹھی چائے پی رہی تھی کہ فون کی کھنٹی بجی۔  
اس نے کپ میز پر رکھ دیا اور اٹھ کر ریسپور اٹھا لیا۔

”سنیتا۔“ اس کی پہلو کے جواب میں نسوانی آواز سنائی دی۔ وہ خبثتم ہی تھی۔ ”سنا ہے تم نے ایک کتا پال رکھا ہے اور تمہارے پر پڑے نکل آئے ہیں۔“ وہ کہہ رہی تھی۔ ”گزشتہ رات تم لوگوں نے اچھا نہیں کیا۔ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔“  
”تو کیا تمہارے خیال میں میں اپنے آپ کو تمہارے کتے کے حوالے کر دیتی۔“  
سنیتا نے جواب دیا۔ ”میں نے تمہیں کئی مرتبہ کہا ہے مجھے بھول جاؤ خبثتم لیکن اب اندازہ ہوا کہ تم جیسی بے غیرت عورتیں آسانی سے کوئی بات نہیں مانیں، اور اب تم یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ آئندہ اگر ایسی حرکت کی تو انجام اس سے بھی برا ہو گا۔“  
”مجھے دھمکی دے رہی ہو۔“ خبثتم کی غراتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”میرا ایک بندہ مار دیا اور مجھے کستی ہو میں خاموش بیٹھی رہوں۔ سنو سنیتا۔ اگر میں چاہتی تو رات ہی کو تمہارے دفتر پر چھاپے لگو کر تم دونوں کو اندر کر دیتی لیکن..... یہ میرا معاملہ ہے اور اس کا حساب بھی تم سے میں ہی لوں گی۔“

سنیتا اچھل پڑی۔ خبثتم کو کیسے پتہ چلا کہ وہ دونوں رات کو دفتر میں تھے۔  
”تمہارے بندے کو ہم نے نہیں مارا خبثتم۔“ اس نے کہا۔ ”وہ اپنے ہی ساتھی کے ہاتھوں مرا ہے۔ اور رہی حساب کی بات تو اب میں تم سے ضرور حساب کروں گی۔“ اس نے دوسری طرف سے جواب سنے بغیر فون بند کر دیا۔  
”یہ خبثتم تھی۔ کیا کہہ رہی تھی؟“ بشارت نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ویسے سنیتا کی باتوں سے وہ سمجھ گیا تھا کہ دوسری طرف سے کیا کہا ہو گا۔

”پہلی چوٹ لگی ہے۔ زخمی کتیا کی طرح بلہا رہی تھی۔“ سنیتا نے جواب دیا۔ اگر کوئی اور موقع ہوتا تو سنیتا خبثتم سے اس لیے میں بات نہ کرتی لیکن اب بشارت اس کے ساتھ موجود تھا اور گزشتہ رات بشارت کی آواز سننے بھی ہو گئی تھی۔ اب وہ خبثتم سے دبے

کو تیار نہیں تھی۔

”تو کیا کھیل شروع ہو گیا ہے۔“ بشارت نے کہا۔

”اسے یہ بھی پتہ ہے کہ رات کو ہم دفتر میں تھے۔“ سنیتا نے کہا۔

”اوہ۔“ بشارت اس بات پر چونک گیا۔ ”گویا وہ جگہ محفوظ نہیں ہے۔ تمہارا یہ گھر بھی محفوظ نہیں ہے۔ ہمیں کسی اور جگہ جا بھی بندوبست کرنا پڑے گا جہاں ضرورت کے وقت ہم پناہ لے سکیں۔ بلکہ اس کا بندوبست تو آج ہی کرنا ہو گا۔“

وہ دیر تک اسی موضوع پر گفتگو کرتے رہے اور اس کے تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ اکیلا ہی گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ اس نے ایک بڑی رقم بھی جیب میں رکھ لی تھی۔ سنیتا کے ذمے اس نے ایک اور ڈیوٹی لگا دی تھی۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد سنیتا بھی گھر سے نکل گئی تھی۔

بشارت کبھی رکشا اور کبھی ٹیکسیوں پر شر کے مختلف علاقوں میں گھومتا رہا اور آخر کار ایک پراپرٹی ڈیلر کے توسط سے علامہ اقبال ٹاؤن کے چناب بلاک میں ایک کوٹھی کرائے پر لے لی۔ کوٹھی دس مرلے پر تھی اور کرایہ اگرچہ زیادہ تھا لیکن اس کے آس پاس زیادہ کوٹھیاں زیر تعمیر تھیں پالاؤں پر بنیادوں تک کام کر کے چھوڑ دیا گیا تھا۔ قریب ترین آباد مکان بھی پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر تھے۔ بشارت نے یہ کوٹھی اس لئے لی تھی کہ پڑوسیوں کی مداخلت کا اندیشہ نہیں تھا۔

جب وہ وہاں لوٹا تو شام کے سات بج چکے تھے۔ سنیتا اس سے پہلے ہی آچکی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو اپنی کار کو رکھنے کے آگاہ کرنے لگے۔

”پولیس نے آج شکرے کا بیان لے لیا ہے۔“ سنیتا بتا رہی تھی۔ ”اس نے تمہارے بارے میں پولیس کو کچھ نہیں بتایا۔ جب وہ زخمی حالت میں اسپتال لایا گیا تھا تو نیم بے ہوشی میں تھا۔ نام پوچھا رہا تھا جس کے بارے میں اس نے پولیس کو بتایا کہ اس کے بڑے بھائی کا نام ہے جو سیالکوٹ میں کہیں رہائش پذیر ہے۔“

”کیا پولیس اس کے بیان پر یقین کر لے گی۔“ بشارت بولا۔

”اس نے تو اپنے بیان میں یہ بھی کہا ہے۔ کہ وہ اس دوسرے شخص کو بھی نہیں جانتا جس نے مداخلت کی تھی۔ ہو سکتا ہے وہ بھی کوئی رزبن ہو جو چوہدری عمر کے مینجر

”جو کچھ کرنا ہے۔ آج ہی رات کرنا ہے۔“ بشارت نے کہا اور پھر اسے اپنا منصوبہ سمجھانے لگا۔

”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔“ سینا نے اسے گھورا۔ ”دو مسلح پولیس والے چوبیس گھنٹے وہاں موجود رہتے ہیں۔ تم خود بھی مرنا چاہتے ہو کیا؟“

”رسک تو لینا ہی پڑے گلہ میں شکرے کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتا۔“ بشارت نے جواب دیا اور پھر دونوں دیر تک اس موضوع پر بحث کرتے رہے۔

اسی رات گیارہ بجے کے قریب ایک نرس اور ڈاکٹر اسپتال کی اس ریلداری میں داخل ہوئے جس کے دونوں طرف پرائیویٹ رومز تھے۔ نرس بہت خوبصورت تھی۔ اس نے ہاتھ میں کٹنی شپ کی ٹرے اٹھا رکھی تھی جس میں سرنج، انجکشن اور ڈسٹل واٹر کے پیچیدوں اور تھرمایٹر وغیرہ رکھا ہوا تھا۔ ڈاکٹر کے ہاتھ میں کلپ بورڈ تھا جس پر کئی کانڈنگ گئے ہوئے تھے۔ سب سے اوپر وہ کانڈنگ تھاجس پر چھوٹے چھوٹے خانے بنے ہوئے تھے۔ یہ مریض کی فلیڈر شیٹ تھی اور بال چین کی آڑی تھی بالی نائین ٹریج پر ظاہر کر دی تھیں۔

راہداری کے آخر میں دائیں طرف والے کمرے کے سامنے اسٹول پر ایک پولیس کانسٹیبل بیٹھا سرگرت کے کش لگا رہا تھا۔ رائفل اس نے قریب ہی دیوار سے دکھائی تھی۔ نس اور ڈاکٹر کو آتے دیکھ کر وہ اٹھ گیا اور رائفل بھی اٹھائی۔

”کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اسپتال میں سگریٹ پینا منع ہے۔“ ڈاکٹر نے کاشمیل کو گھورتے ہوئے کہا۔

”معاف کرنا ڈاکٹر جی۔ نیند آ رہی تھی۔“ کائیل نے کہتے ہوئے سگریٹ فرش پر پھینک کر پھر سے مل دیا۔ ”پھر اب اس وقت.....“

”مریض کو چیک کرنا ہے۔ نئے صبح نیل وارڈ میں منتقل کیا جائے گا۔ شام تک کی رپورٹ کے مطابق اسے بخار ایک سو درجے سے اوپر تھا۔“ ڈاکٹر نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کلب بورڈ کی طرف اشارہ کیا۔

”یعین شام کو تو دوسرا ڈاکٹر آیا تھا اور سسز بھی دوسری تھی۔“ کاشمیل نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔

کے پیچھے لگا ہوا تھا اور آخر کار رقم کا بیگ بے کربھاگ گیا۔ ”سنیٹا نے بتایا۔

”پولیس اس کے بیان پر کبھی یقین نہیں کرے گی۔“ بشارت نے پھر کہا۔

”شکرے کی حالت بہت تیزی سے بہتر ہو رہی ہے۔ پولیس اس کا ریمانڈ لینا چاہتی ہے لیکن ریمانڈ اس وقت تک نہیں مل سکتا جب تک وہ بالکل تندرست نہ ہو جائے۔ ویسے اسے آج شام وارڈ سے نکال کر ایک کمرے میں منتقل کر دیا گیا ہے جہاں ایک مریض اور بھی ہے۔ وہ بھی قیدی ہے۔ اسپتال کے نیل وارڈ میں جگہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ بندوبست کیا گیا ہے کیونکہ اسے جنرل وارڈ میں نہیں رکھا جاسکتا تھا۔“

”خبر“ بشارت کی انکسیرت چمک اٹھیں۔ اس کے ذہن میں چاکلی ہی ایک خیال ابھرا تھا لیکن فی الحال اس کے بارے میں سنیا کو نہیں بتانا چاہتا تھا۔ وہ اسے اقبال ٹاؤن والی کو بھی کے بارے میں بتائے لگا۔ ”کل دن میں وہاں کچھ ضروری فرنیچر اور ضرورت کی دوسری چیزیں پہنچا دوں گا اور تمہیں کل کا دن گھر سے نکلنے کی ضرورت نہیں۔ میرے ذہن میں ایک خیال آ رہا ہے۔ تفصیل بعد میں کسی وقت بتاؤں گا لیکن میں نہیں چاہتا کہ اس موقع پر شرم کی وجہ سے کوئی الجھن پیدا ہو جائے۔“

اگلے دن بشارت نے تمام ضروری سلمان اقبال ٹاؤن والی کو خفی میں پہنچا دیا۔ اس کے پاس پیسے کی کمی نہیں تھی۔ وہ کھلے دل سے خرچ کر رہا تھا۔  
وہ دن اور گزر گئے۔ اس نے سنیہ کو ابھی تک وہ کو بھی نہیں دکھائی تھی اور اس روز سنیہ نے وہ خبریں کر بشارت چوک گئیں۔

”کل اسپتال کے جیل وارڈ سے ایک قیدی کو جیل بھیج دیا جائے گا۔ اس کا بیٹہ خالی ہو جائے گا اور شکرے کرواں نخل کر دیا جائے گا۔“

”ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔“ بشارت نے کہا۔ ”اگر شکرا جیل وارڈ میں منتقل ہو گیا تو ہم اس کے کوئی بند نہیں کر سکیں گے۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“ سننے نے اسے گھورا۔

”شکرے کو پولیس کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جاسکتا۔“ بشارت نے کہا۔  
 ”نولیس عدالت میں بھی اس کے خلاف دہرے قتل کا الزام ثابت کروے گی۔ اسے باتو

موت کی سزا ہوگی یا وہ زندگی بھر جیل میں سڑتا رہے گا۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔“

”بہت کھپ چاتا ہے جی یہ.....“ کانٹیل نے جواب دیا۔

”شام کو جو سسڑا نہیں دیکھنے آئی تھی اس نے مجھے ایک گولی دے دی تھی کہ رات کو کھپ چائے تو میں گولی اسے کھا دوں۔ آدھا ٹھنڈا پیسلے میں نے گولی اسے کھلا دی تھی۔ سویرے تک سو رہا ہے گا۔“

کانٹیل نے بات کرتے ہوئے رائفل کرسی پر رتہ دی تھی۔ ڈاکٹر نے کن انکھیں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر اچانک ہی اچھل کر اسے دبوچ لیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے کانٹیل کا منہ دبا لیا تھا تاکہ وہ شور نہ مچا سکے۔ کانٹیل بری طرح جھلنے لگا لیکن ڈاکٹر کی گرفت بری مضبوط تھی۔ وہ اسے ہاتھ روم کے دروازے کی طرف تھمیت رہا تھا۔ نرس نے جلدی سے آگے بڑھ کر ہاتھ روم کا دروازہ کھول دیا اور ڈاکٹر کانٹیل کو تھمیتا ہوا ہاتھ روم میں لے گیا۔

شکرے کے چہرے پر ابھرنے کے تاثرات ابھر آئے۔ اس نے تھراپیئر منہ سے نکال دیا وہ کچھ بولنا چاہتا تھا مگر نرس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ دو منٹ بعد ڈاکٹر ہاتھ روم سے باہر آگیا۔ اس نے نرس کو اشارہ کیا۔ نرس دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

”ہلک..... کون ہو تم..... یہ کیا کر رہے ہو؟“ شکرے کے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔ وہ وحشت زدہ سی نظروں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ”تھیراپیئر نہیں شکرے۔“ ڈاکٹر نے سرگوشی کی۔ ”میں بشارت ہوں۔ ہم تمہیں یہاں سے لے جانے کا بندوبست کر رہے ہیں۔“

”بشارت۔“ شکرہ چونک گیا۔ وہ ابھی ہوئی نظروں سے ڈاکٹر کی دائمی اور نیلی آنکھوں کو گھورنے لگا۔

نرس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور ڈاکٹر کا اشارہ پا کر بری آہستگی سے بولٹ ہٹایا پھر دروازہ کھول دیا۔ ڈاکٹر اس دوران میں دروازے کے پیچھے پہنچ چکا تھا۔

”کانٹیل۔ اندر آؤ۔ ذرا جلدی۔“ نرس نے باہر کھڑے ہوئے کانٹیل کو اشارہ کیا۔

کانٹیل جلدی سے دروازے کی طرف بڑھل۔ وہ جیسے ہی اندر داخل ہوا، دروازے

”آج تیس تاریخ ہے۔ مہینے کا آخری دن۔“ ڈاکٹر نے کلمہ ”اور مہینے کی آخری تاریخ کو نرسوں اور ڈاکٹروں کی ڈیوٹی بدل جاتی ہے۔ دروازہ کھولو۔“

کانٹیل نے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ وہ دونوں اندر داخل ہو گئے۔ کانٹیل باہر ہی کھڑا رہ گیا تھا۔ اندر داخل ہو کر نرس نے دروازہ بھیڑ دیا اور ہاتھ پیچھے کر کے بری آہستگی سے بولٹ بھی لگا دیا۔

کمرے کے اندر بھی ایک کانٹیل موجود تھا۔ وہ ایک دیوار کے ساتھ کرسی پر بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ اس نے سگریٹ فرش پر پھینک کر پیر سے مسل دیا اور رائفل اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔

کمرے میں دائیں بائیں دیواروں کے ساتھ دو بیڈ تھے۔ بائیں طرف والے بیڈ پر ایک ادیبز عمر مریض سو رہا تھا۔ دوسرے بیڈ پر شرا تھا۔ وہ جاگ رہا تھا۔

ایک طرف ہاتھ روم کا دروازہ تھا اور اس کے قریب ہی ایک وہیل چیئر بڑی ہوئی تھی۔ کمرے کے عقبی سمت میں کھڑکی تھی جس میں لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔

ڈاکٹر شکرے کے بیڈ کے قریب کھڑا ہو گیا۔ کلب بورڈ اس نے بیڈ پر رکھ دیا اور کندھے پر لٹکا ہوا اسٹیتھو سکوپ اتار کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔

”کیسے ہو اب؟“ وہ شکرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”ٹھیک ہوں۔“ شکرے نے جواب دیا۔ اس کے لیے میں تھی تھی۔ ”تھیراپیئر اپتال ہے یا فائدہ خانہ۔ مریضوں کو آرام بھی نہیں کرنے دیا جاتا۔ جس ویلے دیکھو نرس یا ڈاکٹر منہ اٹھائے چلے آتے ہیں۔“

”مریضوں کے آرام کی خاطر ہمیں بھی راتوں کو جاگنا پڑتا ہے۔“ ڈاکٹر نے کہا اور نرس کو اشارہ کیا۔

نرس نے آگے بڑھ کر تھراپیئر شکرے کے منہ میں ٹھونس دیا اور کھائی پکڑ کر انگلیاں نبض پر رکھ دیں۔ ڈاکٹر کانٹیل سے باتیں کرنے لگا۔

”یہ دوسرا مریض بہت گہری نیند سو رہا ہے۔“ اس نے دوسرے مریض کی طرف اشارہ کیا۔

کے پیچھے کھڑے ہوئے ڈاکٹر کا گھونٹہ اس کی کھوپڑی پر۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ لڑکھڑائی گئی۔ ہاتھ میں پکڑی ہوئی رائفل بھی نیچے گر گئی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر اسے چھاپ لیا۔ وہ اسے فرش پر گرا کر دونوں ہاتھوں سے اس کی کپٹیاں ملنے لگا۔ ایک منٹ کے اندر اندر کانٹینیل ڈھیر ہو گیا۔ ڈاکٹر نے اسے بھی تھکیت کر ہاتھ روم میں ڈال دیا اور دروازہ بند کر کے باہر سے کنڈا لگا دیا۔ نرس کمرے کا دروازہ بند کر کے بولٹ لگا چکی تھی۔

”وہیل چیز لے کر آؤ سنیتا۔“ ڈاکٹر نے نرس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور جلدی سے شکرے کے بیڈ کے قریب پہنچ گیا جو اب بھی ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ”تم وہیل چیز پر تو بیٹھ سکتے ہو نا؟“ ڈاکٹر نے کہا اور شکرے کو سہارا دے کر اٹھانے لگا۔

اور پھر ٹھیک اسی لمحے آہٹ سن کر ڈاکٹر نے مڑ کر دیکھا۔ دروازے کا پینڈل گھوما تھا۔ اندر سے بولٹ لگا ہوا ہونے کی وجہ سے دروازہ نہیں کھل سکتا تھا۔ پینڈل کو زور زور سے حرکت ہونے لگی۔

بشارت کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس نے سنیتا کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بھی دھواں ہو رہا تھا۔ بشارت نے ادھر ادھر دیکھا۔ وہ چوہے دان میں پھنس گئے تھے۔

باہر سے دروازہ اب دھڑ دھڑایا جانے لگا تھا۔

☆=====☆

سنیتا اپنی جگہ پر بے حس و حرکت ہو کر رہ گئی۔ اس کے ہاتھ وہیل چیز پر اس طرح جم گئے جیسے چپک کر رہ گئے ہوں۔

بشارت کی آنکھوں میں وحشت سی بھر گئی تھی۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ اس نے شکرے کو دوبارہ لٹایا۔ کرسی پر پڑی ہوئی کانٹینیل کی رائفل اور بڑی تیزی سے حرکت کرتا ہوا دروازے کے قریب دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے رائفل کی ٹال اوپر کی طرف کر کے دونوں ہاتھوں میں اس طرح پکڑ لیا کہ کسی بھی لمحے اسے استعمال کر سکتا تھا۔ اسی لمحے دروازہ ایک مرتبہ پھر دھڑ دھڑایا گیا اور اس کے ساتھ ہی ایک بھاری آواز سنائی دی۔

”اندر کون ہے؟ دروازہ کھولو۔“

بشارت نے بیکر کی حرکت سے سنیتا کو اشارہ کیا۔ سنیتا کی آنکھوں میں وحشت تھی اور چہرے پر زردی کھڑی تھی۔ وہ اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھی اور بشارت کی طرف دیکھتے ہوئے بولٹ ہٹا دیا۔ اس کے ساتھ ہی دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا۔ آگروہ اچھل کر پیچھے نہ بٹ جاتی تو دروازہ اس کے منہ پر لگتا۔

وہ ایک ہیڈ کانٹینیل تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی وہ ٹھک کر رک گیا۔ اس نے پہلے ہیڈ پر بڑے ہوئے شکرے کی طرف دیکھا پھر اس کی نظریں سنیتا کے چہرے پر جم گئیں۔

”دروازہ کیوں بند کر رکھا تھا سسٹر اور وہ دونوں کانٹینیل کہاں گئے؟“ ہیڈ کانٹینیل نے کہا۔

”وہ..... وہ میں اکیلی تھی نا“ اس لئے میں نے دروازہ اندر سے بولٹ کر دیا تھا۔“ سنیتا نے اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”اور وہ دونوں سنتری اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر کہاں دفع ہو گئے ہیں۔“ ہیڈ کانٹینیل بولا۔

”وہ دونوں چائے پینے باہر ہو ئل چلے گئے ہیں۔“ سنیتا نے جواب دیا۔ ”میں مریض کا

”مگر تمہارے منہ سے آواز نکلی تو اس رات نقل کے میگزین میں بھری ہوئی ساری گولیاں تمہارے سینے میں اناہر دوں گے۔ دیواری کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ اور ہاتھ پیچھے رکھو۔“

”کیوں اپنی جان کے دیری ہو رہے ہو تم لوگ۔“ ہیڈ کانسٹیبل نے کہہ ”تم لوگ اپنے ارادے میں کامیاب نہیں ہو سکو گے۔“

”یہ ہمارا دوسرا سہرا ہے کہ ہم اپنے ارادے میں کامیاب ہوتے ہیں یا نہیں۔“ بشارت نے کہہ ”میں نے جو کہا ہے وہ کرو نہ۔“ اس نے رات نقل کو حرکت دی۔

ہیڈ کانسٹیبل دیواری کی طرف رخ کر کے کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھ پشت پر رکھ لئے۔ وہ اوجیز عمر آدمی تھا۔ ہو سکتا ہے جوانی میں کبھی بملاری کے کوئی کارنامے انجام دیئے ہوں لیکن اس وقت رات نقل کی ٹال اپنی طرف اٹھی ہوئی دیکھ کر وہ ایسی کوئی حماقت نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے قبل از وقت زندگی سے ریڑھ ہوتا پڑے۔ دیکھے اس ڈاکٹر کے ہاتھ میں اپنے ایک ساتھی کی رات نقل دیکھ کر وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ دونوں سنتری کہاں گئے ہوں گے۔

بشارت نے سنیتا کو اشارہ کیا۔ سنیتا نے کمرے میں داخلہ اور دھڑکھٹا دوسرے مریض کے بیڈ پر سرہانے کی طرف ہٹا چمک دار پڑا ہوا رومال اٹھا اور اس نے لپک کر وہ رومال اٹھا لیا اور حوالدار کے ہاتھ پشت پر بڑی سختی سے باندھ دیئے۔ بشارت کے بیڈ کے قریب چھوٹی سی میز پر ڈوری کے علاوہ کالٹن کا ایک رومال بھی پڑا ہوا تھا اس نے وہ بھی اٹھا لیا۔

”اب جھوم کر کھڑے ہو جاؤ۔“ بشارت نے حوالدار کو حکم دیا۔

”تم لوگ بہت برا کر رہے ہو۔“ ہیڈ کانسٹیبل نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا اور سنیتا نے وہ حرکت کی جس کی توقع نہ بشارت کو تھی اور نہ ہی ہیڈ کانسٹیبل کو۔ اس نے آگے بڑھ کر ہیڈ کانسٹیبل کے گل پر ہونٹ جمادیئے اور اس کے ساتھ ہی کالٹن کے رول میں سے مٹھی بھر روٹی توڑ کر اس کے منہ میں ٹھونس دی اور ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گئی۔ حوالدار کے گل پر سرفی سے اس کے ہونٹوں کا نشان بن گیا تھا۔

”محرمت کسان میں سے تمہارا ٹیپر نہیں پڑا دیکھا تھا۔“ سنیتا نے کہہ ”تمہارا ٹیپر بچہ ڈاکٹر کو چکا ہے۔ تم جھٹکے دے ہو چکے ہو۔“

بیڈ پر پڑے ہوئے شکرے کے ہونٹوں پر بھی خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ بشارت ہیڈ کانسٹیبل کو دھکیلا ہوا ہاتھ روم کی طرف لے گیا۔ اس نے جبکہ کر دروازہ کھولا اور ہیڈ

ٹیپر بچہ لینے آئی تھی۔ انہوں نے کہا میں تھوڑی دیر کے لئے یہاں رک جاؤں۔ وہ چائے پی کر آئے ہیں۔“

”کیا بات ہے سسر۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ نرس جی۔“ ہیڈ کانسٹیبل کے ہونٹوں پر کمرہ سی مسکراہٹ آگئی۔ ”وہ چائے پینے گئے ہیں یا تم نے انہیں رشوت دے کر تھوڑی دیر کے لئے یہاں سے ہٹا دیا ہے۔“ ہیڈ کانسٹیبل اس کتے کے پلے میں کیا سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں کہ جو بھی نرس آتی ہے اس پر بیجھ جاتی ہے۔“ اس نے بستر پر پڑے ہوئے شکرے کی طرف دیکھا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”میں جیل وارڈ کا اچھارج ہوں اور ان دونوں سنتریوں کو پتہ ہے کہ اس وقت ان کے لئے چائے لے کر آتا ہوں۔ بڑے بے وقوف تھے وہ جو اس خرابکام قیدی کو اکیلے چھوڑ کر چلے گئے۔ لگتا ہے تم نے انہیں کوئی ایسی ہی رشوت دی ہوگی یا کوئی وعدہ کیا ہو گا۔ ویسے یہ قیدی زخمی ہے، بھاگ تو نہیں سکتا۔“

”تم غلط سمجھ رہے ہو حوالدار۔“ سنیتا جلدی سے بولی۔ ”میں۔۔۔۔۔ میں تو اس کا ٹیپر بچہ لینے آئی تھی اور کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے ایک قیدی سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔“

”آدمی رات کو قیدی کا ٹیپر بچہ۔ او سوہنیو! ہمارا ٹیپر بچہ بھی تو لے کر دیکھو نہ قیدی میں نہ سسی، مجھ میں دلچسپی لے کر دیکھو۔۔۔۔۔ ٹھہرو میں دروازہ بند کر دوں کہیں وہ کھوتے ڈاکٹر آکر رنگ میں جھٹک نہ ڈال دیں۔“

ہیڈ کانسٹیبل جھوم گیا لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔ دروازہ بند تھا اور دیوار کے ساتھ کھڑے ہوئے بشارت کی رات نقل اس کی طرف تھی ہوئی تھی۔

”کیا بات ہے سوہنیو!“ بشارت نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے استہزائے لیے میں کہہ۔ ”یہ نرس اصل میں نی نی آئی تھی۔ اسے پولیس والوں سے کبھی واسطہ نہیں پڑا۔ تمہارا ٹیپر بچہ تو تین لوں کا۔“

”جھٹک۔۔۔۔۔ کون ہو تم لوگ؟“ ہیڈ کانسٹیبل کے چہرے پر دہشت سی ابھر آئی۔ ”مجھ گیلہ ساری بات سمجھ لی۔ تم ڈاکٹر نہیں ہو اور نہ ہی یہ نرس ہے۔ تم لوگ اس قید

۔۔۔۔۔“

روکتھ مگر ایک نرس اور ڈاکٹر کو روکنے کی اس نے کوشش نہیں کی تھی۔

وہ کرسی کو دھکیلتے ہوئے اسپتال کے بیرونی گیٹ کی طرف آگئے۔ بڑا گیٹ بند تھا البتہ ذیلی دروازہ کھلا ہوا تھا اور یہاں بھی اسٹول پر ایک چوکیدار بیٹھا تھا۔ اس نے بھی ابھی ہوئی نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

”مریضوں کو تو حویڑی ہی تفریح کر دیتا بھی ان کی صحت کے لئے مفید ہوتا ہے۔“  
بشارت نے چوکیدار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اور یہ تو ویسے بھی اہار اہنا بندہ ہے۔ اسے ایک کپ چائے پلائیں گے۔ تو حویڑی دیر باہر کی رونق دیکھے گا تو اس کی طبیعت بدل جائے گی۔ دروازہ کھولو۔“ چوکیدار نے دروازہ کھول دیا۔ اگر کوئی ڈاکٹر کسی مریض کو اسپتال سے باہر لے جانا چاہتا تھا تو اسے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

میو اسپتال کے اس مرکزی گیٹ کے سامنے اس وقت بھی رونق تھی۔ سامنے کئی میڈیکل اسٹور تھے۔ چھوٹی چھوٹی لائسنس یافتہ دیکھیل لیبارٹریز تھیں۔ ایک دو ریٹورنٹ اور بہت سی ایسی دکانیں تھیں جو رات بھر کھل کر رہتی تھیں۔ بالکل سامنے دکانوں کے بیچ میں سے ہوتی ہوئی نسبت روڑ تھی۔ گیٹ کے سامنے والی سڑک دائیں طرف ہل روڈ کملاتی تھی اور بائیں طرف اسپتال روڈ۔ اس کے ساتھ ہی بانسوں والا بازار تھا۔

سینٹا نے وہیل چیئر دائیں طرف موڑ دی۔ اس طرف اسپتال کے جنگل کے ساتھ ساتھ پرائیویٹ ایمریٹنس اور کچھ اور گاڑیاں کھڑی تھیں۔ سینٹا اور بشارت بظاہر مطمئن نظر آ رہے تھے لیکن ان کے دل کاپ رہے تھے۔ شکرے کی کیفیت بھی ان سے کچھ مختلف نہیں تھی۔ کسی بھی لمحے کچھ ہو سکتا تھا۔

چھ سات گاڑیاں چھوڑ کر سرخ رنگ والی شیراز کے قریب سینٹا نے وہیل چیئر روک لی اور اُدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

”گاڑی کا دروازہ کھولو۔ جلدی کرو۔“ بشارت نے سینٹا کی طرف دیکھے بغیر کہا اور دُھر اُدھر دیکھنے لگا۔ سامنے ایک چھوٹے سے ریٹورنٹ کے سامنے کرسیوں پر کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے اور کچھ لوگوں کی آمد و رفت بھی تھی لیکن ان کی طرف کوئی بھی متوجہ نہیں تھا۔ سینٹا گھوم کر ڈرائیونگ سائیڈ کی طرف آگئی۔ اس نے شرٹ کی جیب سے کی رنگ نکال کر پہلے ڈرائیونگ سائیڈ کا دروازہ کھول کر اندر گھس گئی اور دوسری طرف کا دروازہ

کافیسیل کو اندر دھکا دے دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے کندھے پر راکفل کا ہٹ بھی رسید کر رہا تھا۔ بیڑ کا کافیسیل ہاتھ روم کے فرش پر بے ہوش پڑے ہوئے سنتریوں پر مگر۔ بشارت نے جلدی سے دروازہ بند کر کے یونٹ کھینچ دیا۔

”سینٹا وہیل چیئر لاؤ“ جلدی کرو۔ ”وہ بیڑ کی طرف ہلکا۔“ اس سے پہلے کہ کوئی اور مصیبت نازل ہو جائے، ”میں یہاں سے نکل جانا چاہتا ہوں۔“

اس نے راکفل بیڑ پر رکھ دی اور بشارت کو سہارا دے کر اٹھانے لگا۔ سینٹا وہیل چیئر دھکیلتی بیڑ کے قریب لے آئی۔ ان دونوں نے شکرے کو سہارا دے کر وہیل چیئر پر اس طرح بٹھایا کہ اس کی زنجی پشتی وہیل چیئر کی پشت سے نہ لگے۔ بشارت نے بیڑ پر پڑی ہوئی راکفل اور دروازے کے پیچھے پڑی ہوئی دوسرے کافیسیل کی راکفل بھی اٹھا کر شکرے کی ٹانگوں کے ساتھ پائیدان پر کھڑی کر دیں اور چادر اٹھا کر شکرے کے اوپر اس طرح ڈال دی کہ نہ صرف دونوں راکفل بلکہ اس کا پورا جسم بھی چھپ گیا۔ بشارت نے اس لاچرہ چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

بشارت نے دروازہ کھول کر باہر جھانک کر اہار اری سلسلن پڑی تھی۔ اس نے سینٹا کو اشارہ کر دیا۔ وہ وہیل چیئر کو دھکیلتی ہوئی باہر لے آئی۔ باہر دروازے کے قریب ہی کھڑی کے اسٹول پر جانے کی کیتھی اور پلاسٹک کے گم رکھے ہوئے تھے۔ یہ جانے جیل وارڈ کا انچارج بیڑ کا کافیسیل ان سنتریوں کے لئے لے کر آیا تھا جو اب اس کے ساتھ حسل خانے میں بے ہوش پڑے تھے۔

اس وقت بارہ بج رہے تھے۔ اسپتال کی تمام اہار اریاں سلسلن پڑی تھیں۔ ڈاکٹر ز اور نرسیں بھی اپنے اپنے ڈیوٹی رومز میں سو رہے ہوں گے۔

رہ سول کے جوتوں کی وجہ سے ان کے قدموں کی ہلکی سی آواز بھی نہیں ابھر رہی تھی۔ وہ کسی دُھواڑی کے بغیر اہار اریوں سے نکل کر کشادہ برآمدے میں آگئے۔ برآمدے کا بیڑیوں کے ساتھ ہی رہیپ بھی بنا ہوا تھا۔ اس رہیپ پر بیچ کر بشارت نے بھی ایک باج سے وہیل چیئر سنبھال لی تاکہ وہ دُھلاں پر لڑکھ نہ جائے۔ برآمدے میں ایک طرف کرسی بیٹھے ہوئے ہٹ ڈیوٹی والے چوکیدار نے ابھی ہوئی نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ اگر کوئی عام آدمی کسی مریض کو آدھی رات کے وقت باہر لے جانے کی کوشش کرتا تو وہ اسے ضرور

کمرانے کی آواز تو سنی ہی ہوگی اور دیے بھی عورت کی ہمدردی میں لوگ بھاگے چلے آتے ہیں لیکن اس وقت لوگوں کی ہمدردی انہیں منگی پڑ سکتی تھی۔

چھٹی سیٹ پر بیٹھا ہوا بشارت بھی اس صورت حال سے پریشان ہو گیا تھا۔ اس نے گردن ہٹھا کر دیکھا۔ ایک میڈیکل اسٹور کے سامنے دو پولیس والے بھی بیٹھے ہوئے تھے نظر آگئے تھے اور ڈریہ تھا کہ وہ پولیس والے اس طرف نہ آجائیں۔

بشارت کار سے اترا۔ اس نے دوسری کار کی ٹوٹی ہوئی لائٹ کا جائزہ لیا اور سفید کوٹ کے نیچے قبض کی جیب سے سو کا نوٹ نکال کر اس شخص کی طرف بڑھاتے ہوئے ہوا۔

”میں تمہارا نقصان پورا کر دیتا ہوں شیدے پہلوان جی۔ مریض کو گنگرام اسپتال لے کر جا رہے ہیں۔ دیر ہو گئی تو اس کی حالت بگڑ جائے گی۔“

”اوتے ڈاکٹر..... صرف سو روپے۔“ اس شخص نے سو روپیہ لینے سے انکار کر دیا۔

”دو سو روپے کی آتی ہے یہ حق۔“

بشارت نے ایک بار پھر مڑ کر دیکھا۔ میڈیکل اسٹور کے سامنے بیٹھا ہوا ایک کانشیل اور دو اور آدمی انھہ کر اس کی طرف آرہے تھے۔ بشارت کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اسہ شیدے پہلوان نے انہیں پھنسانے کا پورا پورا بندوبست کر لیا تھا۔ بشارت نے جلدی سے جیب سے سو کا ایک اور نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

”اب اس قصہ کو ختم بھی کرو شیدے پہلوان جی۔“

”تم شریف آدمی لگتے ہو ڈاکٹر پر اپنی سسز کو چنگی طرح سمجھا دو کہ پہلے گڈی چلانا کچھ پھر سسزوں پر آئے۔“ شیدے پہلوان نے نوٹ منظمی میں لیتے ہوئے کہا۔

”سمجھا دوں گا۔ چنگی طرح سمجھا دوں گا۔“ بشارت کہتے ہوئے کار کے پچھلے دروازے کی طرف لپکا۔ اس دوران میں پولیس کانشیل اور وہ دونوں آدمی پانچ چھ گز کے فاصلے پر پہنچ چکے تھے۔

سنیتا نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی اور اس کی رفتار بڑھاتی چلی گئی۔ ”بہت ہی غیبت آدمی تھا۔“ وہ بڑبائی۔

”سرب سے کیپ اتار دو ورنہ راستے میں کوئی اور غیبت مل جائے گا۔“ بشارت نے کہا۔

کھول دیا۔

وکیل جیٹر دروازے کے ساتھ ہی تھی۔ ان دونوں نے شکرے کو وکیل جیٹر سے کار میں منتقل کر دیا۔ بشارت نے دونوں راغلیں بھی اندر ڈال دیں اور وکیل جیٹر کو چند گز آگے لے جا کر چھوڑ دیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کار کی چھٹی سیٹ پر شکرے کے قریب بیٹھ گیا۔ شکرہ سیٹ پر ترچھا ہو کر بیٹھا تھا تاکہ زخموں میں کوئی تکلیف نہ ہو۔ اسی دوران سنیتا کار کا انجن اشارت کر چکی تھی۔

”ہال روڈ کی طرف لے چلو۔“ بشارت نے کہا۔

سنیتا نے کار کو ریورس میں لیا اور پھر اس کا رخ ہال روڈ کی طرف موڑ دیا۔ اس وقت مخالف سمت سے ایک کار اس طرف آئی تھی۔ گاڑی موڑتے ہوئے سنیتا کی کار کا فنڈر دوسری کار سے ٹکرا گیا۔ اس کار کی انڈیکس لائٹ ٹوٹ گئی۔ کار میں ایک ہی آدمی تھا۔ وہ انجی چم چھوڑ کر نیچے اترا آیا۔ سنیتا اس وقت اپنی کار کو ایک بار پھر پیچھے لے رہی تھی۔

وہ بھاری بھر کم شخص اگرچہ مذہب لباس پہنے ہوئے تھا مگر اس کے چہرے کو دیکھ کر گناہ تھا جیسے تہذیب اسے چھو کر بھی نہ گزری ہو۔ اس نے پہلے جبکہ کار کی ٹوٹی ہوئی انڈیکس لائٹ کا جائزہ لیا پھر سنیتا کی کار کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

”بی بی۔ ذرا تھکے اترو۔ آکے دیکھو میری گڈی کا ستیاناس کر دیا ہے۔“ اس کے لئے تصدیق ہو گئی کہ وہ تہذیب سے آشنا بالکل نہیں تھا۔

”میں نیچے آکر کیا دیکھوں۔ غلطی تمہاری ہی ہے۔“ سنیتا نے کھڑکی سے گردن نکال کر دیکھ کر کہہ دیا۔

”تم دیکھ رہے تھے کہ میں گاڑی اس طرف موڑ رہی ہوں۔ اس کے باوجود سامنے آگئے۔ ایک سینڈ روک جاتے تو قیامت نہ آجاتی۔ ہٹ جاؤ سامنے سے میں اوپر چڑھا دوں گی۔“

”لے جاؤ۔ شواہد بھی شواہد۔“ وہ شخص ڈرائیونگ سائیڈ پر آ گیا۔ ”اس کو کہتے ہیں چور کو توال کو ڈانٹے۔ اوتے..... میرے اوپر گڈی چڑھاؤ گی۔ شیدے پر گڈی چڑھاؤ گی۔“

”تم شیدے ہو یا کوئی اور۔ ایک طرف ہٹ جاؤ۔“ سنیتا نے غرور کر کہا۔ اسے ڈر نہ تھا کہ سامنے رینوٹر میں بیٹھے ہوئے لوگ اس طرف نہ آجائیں۔ لوگوں نے گاڑی



سنیتا نے ایک ہاتھ سے اسٹینرنگ منہالے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے سر پر ہلکی ہونٹوں والی سفید کیپ اٹانے لگی۔ کیپ ہینرنگ سے لگی ہوئی تھی۔ اس نے پن بھینچی تو وہ چار ہال بھی ساتھ آگئے۔ اس نے کیپ ڈیش بورڈ کے خانے میں رکھ دی اور دوسرا ہاتھ بھی اسٹینرنگ پر جما دیا۔ اس دوران میں پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے بشارت نے بھی اپنا سفید کوٹ اٹار دیا تھا۔

”کس طرف جانا ہے؟“ سنیتا نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔  
”فیل روڈ کی طرف لے لو۔ وہاں سے اچھرے کی طرف نکل جائیں گے۔“ بشارت نے جواب دیا۔

گاڑی میٹروڈ روڈ کراس کر کے تیزی سے ریگیل چوک کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ہال روڈ پر الیکٹرو بکس کی دکاتیں تھیں جو اس وقت بند تھیں۔ ریگیل چوک پارک کے کار فیل روڈ میں دوڑنے لگی اور پھر شاہراہ جلال الدین روڈ پر آگئی۔ یہ کشادہ سڑک ٹنر کو کراس کرتی ہوئی خلیان سہروردی اور بلال ٹاؤن کی طرف چلی گئی تھی۔ اس کشادہ سڑک پر آتے ہی سنیتا کار کی رفتار مزید بڑھادی تھی۔

”رفتار زیادہ مت بڑھاؤ۔“ بشارت نے کہا۔ ”یہاں ہو پولیس کی کوئی گاڑی ہمارے پیچھے لگ جائے۔“

سنیتا نے رفتار کم کر دی۔ اچھرے کے مرکزی چوراہے پر خاصی رونق تھی۔ اس باروڈ علاقے سے آگے نکل کر سنیتا نے بشارت کے کہنے پر کار کو دائیں طرف ایک ذیلی سڑک پر مڑا لیا۔ یہ رہائشی علاقہ تھا اور اس سڑک پر سناٹا تھا۔

بشارت کی ہدایت پر سنیتا کار کو مختلف چھوٹی سڑکوں پر گھماتی رہی اور آخر کار علامہ اقبال ٹاؤن کے مین لے واڈ پر نکل آئے۔ اس علاقے میں بھی اس وقت خاصی رونق تھی۔

”کار ڈرائیونگ پر روک لو۔ یہاں سے ایک دو چیزیں لینی ہیں۔“ بشارت نے کہا۔  
سنیتا نے شاہنگ سینٹر سے کافی دور کار روک لی۔ یہاں کسی قدر تاریکی تھی اور لوگوں کی آمد و رفت بھی نہیں تھی۔ بشارت کار سے اتر کر شاہنگ سینٹر کی طرف گیل۔ اس نے ایک بیکری سے کھانے پینے کی کچھ چیزیں خریدیں۔ باہر آکر ایک کینن سے شرکے کے سگریٹ کے دو پیکٹ خریدے۔ رات بھر کھلے رہنے والے ایک میڈیکل اسٹور سے کچھ

کلرز گولیاں خریدیں اور اس طرف آگیا جہاں وہ کار سے اتر ا تھا۔  
کار وہاں نہیں تھی۔ بشارت پریشان لگا ہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ وہ دائیں طرف دوسری سڑک پر مڑ گیا۔ اسی وقت شاہنگ سینٹر کے مخالف سمت سے آنے والی ایک موٹر سائیکل اس کے قریب آکر رکی۔ وہ دو پولیس والے تھے۔ آگے والے کی رائفل اس کے کندھے پر لگی ہوئی تھی اور پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے کانٹیل نے رائفل ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی۔ وہ موٹر سائیکل سے اتر آیا۔

”اوئے! کون ہو تم..... یہاں کیا کر رہے ہو؟“ کانٹیل نے قریب آکر اسے گھورا۔ وہ کانٹیل تھا لیکن اس کا لہجہ ایسا تھا جیسے اپنے سے بہت حقیر آدمی سے بات کر رہا تھا۔ یہ دراصل اس کی دردی کا مکمل تھا۔ پولیس کی دردی بہن کر ایک معمولی سا کانٹیل بھی اپنے آپ کو شہنشاہ سمجھنے لگتا ہے۔

”میں اپنی گاڑی تلاش کر رہا ہوں۔“ بشارت نے جواب دیا۔ ”ڈرائیور کو شاہنگ سینٹر کے سامنے ہی رکنے کو کہا تھا۔ پتہ نہیں کس طرف چلا گیا ہے۔“  
”اس کو اسی طرف جا کر دیکھو۔ یہاں کیا کر رہے ہو۔“

کانٹیل نے کہا۔ وہ بشارت کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے شاہنگ بیگ، اس کے لباس اور شریفانہ چہرے کو دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ اس نے غلط آدمی کو روکا ہے۔

”چل یار۔ آگے چل۔“ کانٹیل اپنے ساتھی سے کہتا ہو موٹر سائیکل کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور موٹر سائیکل آگے بڑھ گئی۔

بشارت وہیں کھڑا رہا، تقریباً دو منٹ بعد کار اس کے قریب آکر رکی۔ بشارت دروازہ کھول کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

”کہاں غائب ہو گئی تھیں؟“ اس نے شاہنگ بیگ پچھلی ونڈ اسکرین کے ساتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

”موٹر سائیکل پر دو شربٹے گھوم رہے تھے۔“ سنیتا نے کار آگے بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔ ”میرا یہاں کھڑی دیکھ کر وہ مشتبہ ہو گئے تھے اس لئے میں یہاں رکنے کے بجائے اسی طرف نکل گئی تھی۔“

”وہ کسی شکار کی تلاش میں ہیں۔“ بشارت نے جواب دیا۔ ”یہاں کھڑے دیکھ کر انہوں

نے مجھے بھی گھبرنے کی کوشش کی تھی لیکن شاید میری شرافت سے متاثر ہو کر چلے گئے۔  
”چرے سے تو تم واقعی شریف آدمی لگتے ہو لیکن تباہ آباد جانا کدھر ہے۔ کوئی ٹھکانا بھی  
ہے یا رات بھر سڑکوں پر ہی گھماتے رہو گے۔“ سننے لگا۔

”میں روڈ پار کر کے سامنے والے بلاک میں لے لو۔“ بشارت نے جواب دیا اور  
شکرے کی طرف دیکھنے لگا جس کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ ”مجھے  
معلوم ہے تمہیں تکلیف ہو رہی ہے لاہور شہر کی گلیوں پر سڑکوں پر سڑکرتے ہوئے  
ایکے بھلے آدمی کے کل پر زے دھیلے ہو جاتے ہیں اور تم تو ویسے بھی زخمی ہو لیکن اب ہماری  
منزل زیادہ دور نہیں رہ گئی۔“

سنیٹا نے مین روڈ پار کر کے سامنے والے بلاک کی ایک عک سی سڑک پر موڑ لی۔ یہ  
سڑک نہیں بلکہ پکا راستہ تھا۔ اس بلاک میں بلدیہ کی طرف سے ابھی کسی قسم کا ترقیاتی کام  
شروع نہیں ہوا تھا۔ بہت سے پائٹ خالی تھے۔ کچھ پر قیہ ہو رہی تھی اور گھبرن کر آباد ہو چکے  
تھے۔ سنیٹا نے کار کی رفتار اگرچہ بہت بھلی کر رکھی تھی مگر کچے راستوں پر کار کو دھچکے لگ  
رہے تھے۔ آخر کار بشارت نے کار ایک کوٹھی کے سامنے رکوائی۔

کوٹھی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ بشارت نے کار سے اتر کر جب سے چابیوں کا گھما  
نکالا اور گیٹ کھول دیا۔ سنیٹا کار کو اندر لے آئی۔ بشارت گیٹ بند کر کے آگے آگیا اور  
برآمدے والا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا اور کمروں کی بنیاں جلا دیں۔

وہ دونوں شکرے کو کار سے اتار کر اندر ایک کمرے میں لے گئے اور اسے پٹنگ پر بٹھا  
دیا۔ شکرے کے چہرے پر کرب کے تاثرات نمایاں تھے۔ وہ چند سیگنٹ بیٹھا اور پھر بیٹھ پڑا  
اور حال ہیٹ گیا۔ اس کے جسم پر قبض نہیں تھی۔ پٹی بندھی ہوئی تھی۔ بشارت کو اندیشہ تھا  
کہ کسی زخم کے ٹانگے نہ کھل گئے ہوں۔ وہ ہنک کر شکرے کے جسم پر بندھی ہوئی پٹی کو  
دیکھنے لگا۔ اگر ٹانگے کھل گئے ہوتے تو زخموں سے خون رسنے لگتا لیکن پٹی خشک تھی۔ کار کو  
دھچکے لگنے سے اسے تکلیف ہوئی تھی۔ بشارت اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا جبکہ سنیٹا گھوم  
کر کوٹھی دیکھنے لگی۔ وہ آج پہلی مرتبہ یہاں آئی تھی۔

”تکلیف زیادہ تو تمہیں ہو رہی؟“ بشارت نے پوچھا۔

”ابھی تو قابل برداشت ہے۔ آگے دیکھو۔“ شکرے نے کراہتے ہوئے جواب دیا اور

گردن گھما کر بشارت کی طرف دیکھنے لگا۔

اس دوران میں سنیٹا بھی واپس آگئی۔

”کوٹھی تو اچھی ہے مگر کرایہ بہت زیادہ ہے۔ چھ ہزار روپے بڑی رقم ہوتی ہے۔“ سنیٹا  
نے بشارت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں نے یہ کوٹھی سیکورٹی کے نقطہ نظر سے لی ہے اور پھر یہاں ٹیلی فون بھی ہے۔ اس  
محلہ سے میں سمجھتا ہوں کہ کرایہ زیادہ نہیں ہے۔“ بشارت نے جواب دیا۔ ”لیکن میرا خیال  
ہے کرایے پر بحث کرنے کے بجائے ہمیں اس وقت چاہئے کہ زیادہ ضرورت سے کار میں جھگڑے  
لگنے سے شکرے کو بھی درد ہو رہا ہے۔ اسے کچھ کھلا کر ایک گولی کھلا دی جائے تاکہ تکلیف  
برخیز نہ پائے۔“

”گولی!“ سنیٹا نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں کچھ چین کر لے آیا ہوں۔ ان سے درد میں افادہ تو ضرور ہو گا اور ان سے کسی  
ری ایکشن کا اندیشہ بھی نہیں ہے۔ آؤ..... تمہیں یکن دکھا دوں۔“ بشارت کہتے ہوئے  
اٹھ گیا۔

وہ دونوں کچن میں آگئے۔ وہ سنیٹا کو بتانے لگا کہ کون سی چیز کہاں رکھی ہوئی ہے۔ پھر وہ  
کار سے شاپنگ بیگ بھی نکل لایا۔ اس نے سگریٹ کے پیکٹ باجس اور دواؤں والی جھلی  
نگال لی اور بیگ سنیٹا کے حوالے کر کے شکرے والے کمرے میں چلا گیا۔

کچن کے سلیب پر تیس کپڑا لٹا رکھا ہوا تھا اور نیچے سلیب سٹنڈر بھی موجود تھا۔ سنیٹا نے  
چوہا مالا کر چائے کے لئے پانی رکھ دیا اور کچن کا جائزہ لینے لگی۔ ضرورت کی تقریباً ہر چیز موجود  
تھی۔

سنیٹا اس وقت بھی اپنے آپ میں عجیب سی سسٹی محسوس کر رہی تھی۔ وہ زندگی کے  
ایک اور سسٹی خیز تجربے سے گزری تھی۔ ایک ایک لمحہ روٹنے کھڑے کر دینے والا تھا۔ اگر  
وہ پکڑے جاتے تو انجام کیا ہو؟ یہ سوچ کر ہی وہ کانپ جاتی۔

اس نے چائے کپوں میں انڈیائی شاپنگ بیگ میں سے چیزیں نکال کر پلیٹ میں رکھیں  
اور ٹرے اٹھا کر شکرے والے کمرے میں آگئی۔ شکرہ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر کمی قدر آڑا  
بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے نگاہیں بھی پیچھے رکھا ہوا تھا۔ سنیٹا نے ٹرے میز پر رکھ دی۔ ایک کپ

بشارت کی طرف سر کا دیا اور ایک شکرے کے ہاتھ میں دے دیا اور پلیٹ بھی اس کے سامنے رکھ دی جس میں کیک اور بسکٹ وغیرہ تھے۔ بشارت نے اسے ایک گولی کھلا دی اور پھر وہ چائے پینے لگے۔

”سگریٹ پلاؤ یار۔“ شکرے نے دو گھونٹ چائے پینے کے بعد کہل۔ ”آج صبح سے سگریٹ ہی نصیب نہیں ہوا۔“

بشارت نے ایک سگریٹ سلا کر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ شکرے نے دو تین بھر پور کش لگائے اور پھر بشارت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اپہتل کے کمرے میں تم لوگوں کی کارروائی دیکھ کر میں پریشان ہو گیا تھا اور جب تم لوگوں نے مجھے اٹھانے کی کوشش کی تو میرے حواس ساتھ چھوڑنے لگے تھے۔ میں سمجھا ہی نہیں کون لوگ ہیں اور مجھے کیوں لے جانا چاہتے ہیں۔“ وہ ایک لمبے کو خاموش ہوا۔ سگریٹ کا ایک اور کش لگایا اور بولا۔ ”پر تمہیں کیسے پتہ لگا کہ میں اپہتل میں ہوں یا کہاں ہوں۔“

”میں ایک لمبے کو بھی تمہاری طرف غافل نہیں ہوا تھا شکرے۔“ بشارت نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے جواب دیا۔ ”ہم شروع ہی سے تمہاری نگرانی کر رہے تھے۔ ایک ایک بل کی خبر رکھی تھی اور جب آج یہ چلا کہ کل تمہیں نیل وارڈ میں منتقل کر دیا جائے گا تو میں نے تمہیں اپہتل سے نکالنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ میں جانتا تھا کہ ایک مرتبہ تم جیل وارڈ میں چلے گئے تو تم تک پہنچنا مشکل ہو جائے گا۔“

”اور اگر تم لوگ چلاے جاتے تو؟“ شکرہ بولا۔

”تھو ڈرامت خطرہ تو مول لیتا ہی تھا۔“ بشارت مسکرایا۔

”ویسے میں تمہیں بالکل نہیں پہچان سکا تھا۔“ شکرے نے کہل۔ ”داڑھی بدھا لینے والی بات تو سمجھ میں آتی ہے مگر تمہاری آنکھیں مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تمہاری آنکھیں تو کلی تھیں مگر یہ نیلی آنکھیں۔“

”آج کل آنکھیں تو کیا خون کا رنگ بھی بدلا جاسکتا ہے۔“ بشارت نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”ویسے آنکھوں کا رنگ بدلنے کا مشورہ مجھے سینٹا نے دیا تھا۔“

”سینٹا.....“ شکرہ بولا۔ ”تم نے اس کے بارے میں کچھ بتایا نہیں اور میں تو یہ بھی جاننے کے لئے بے چین ہوں کہ اس روز کیا ہوا تھا۔ گولیاں لگنے کے بعد جب میری آنکھوں

کے سامنے اندھیرا چھار ہا تھا تو میں بھی سمجھ رہا تھا کہ تم بھی مارے جاؤ گے۔“

”اس روز۔“ بشارت گہرا سانس لیتے ہوئے بولا۔ ”اگر سینٹا بروقت میری مدد نہ کرتی تو اس روز میں بھی مارا جاتا۔“ وہ چند لمحوں خاموش ہوا پھر اس روز کے بعد سے اب تک کے واقعات تفصیل سے بتاتے لگا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔ ”میں تو گھر میں بند ہو کر رہ گیا تھا اور یہ سینٹا ہی تھی جو نرسوں کے ذریعے تمہارے بارے میں سب کچھ معلوم کرتی رہی تھی۔“

”پھر تو مجھے سینٹا کا زیادہ شکر ہی ادا کرنا چاہیے۔“ شکرے نے مسکرا کر سینٹا کی طرف دیکھ لیا۔

سینٹا نے صرف مسکراتے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

سینٹا نے چائے کے برتن اٹھا کر کچن میں رکھ دیے اور دوبارہ اس کمرے میں آگئی۔ وہ موجودہ صورت حال کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ پولیس کو اپہتل والے واقعے کی خبر ہوگئی ہوگی اور پورے شہر میں ان کی تلاش ہو رہی ہوگی۔ شکرہ زخمی تھا پولیس سب سے زیادہ پرائیویٹ اسپتالوں اور کلینکوں پر توجہ دے گی۔ پولیس کو یقین رہا ہو گا کہ شکرے کو علاج کی ضرورت ہے اور اسے کسی نہ کسی ڈاکٹر کے پاس ضرور لے جایا جائے گا لیکن بشارت نے اس کا بھی حل سوچ رکھا تھا۔ شکرے کو یقیناً علاج کی ضرورت تھی لیکن ظاہر ہے وہ اسے کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں لے جاسکتا تھا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ پیسے میں بڑی طاقت ہے اس سے بڑے بڑے کام لے جاسکتے ہیں۔

وہ درنیک باتیں کرتے رہے۔ شکرے پر غصہ کی سی طاری ہونے لگی تھی۔ بشارت سینٹا کو اشارہ کرتا ہوا اٹھ گیا۔

”تمہیں رات کو پریشانی تو نہیں ہوگی۔“ بشارت نے شکرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اگر تم کو تو میں اپنی چارپائی بھی یہاں تمہارے قریب ڈال لوں؟“

”نہیں، اب تو میں پہلے سے بہتر ہوں، اپنے آپ اٹھ کر بیٹھ بھی جاتا ہوں اور دو چار قدم چل بھی لیتا ہوں۔ اس لئے تو مجھے جیل وارڈ میں منتقل کیا جاتا تھا۔ وہ تو کار کے جھٹکے لگنے سے کچھ تکلیف ہو گئی تھی۔ اب ٹھیک ہوں جاؤ تم لوگ بھی سو جاؤ۔ صبح باتیں ہوں گی۔“ شکرے نے کہل۔

وہ دونوں اس کے کمرے سے باہر آگئے۔ اس کو بھی میں تین بیڈ رومز تھے۔ تینوں

کروں میں بشارت نے ایک ایک بیڑ اور کچھ ضروری فرنیچر ڈالوا دیا تھا۔ بال کرے میں بھی ایک صوف سیٹ اور چند کرسیاں ڈال دیں تھیں۔ اس سارے سیٹ اپ پر تقریباً ڈیڑھ لاکھ کے قریب رقم خرچ ہوئی تھی۔

”یہ تمہارا کمرہ ہے۔“ بشارت نے ایک کمرے کا دروازہ کھول کر سنیا کی طرف دیکھا۔ ”تم یہاں سو جاؤ اور میں ساتھ والے کمرے میں.....“

”میں..... میں یہاں اکیلی سوؤں گی۔“ سنیا نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”نہیں بھئی..... مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ میں اکیلی نہیں سوؤں گی۔“

”اور اپنے گھر میں جو اکیلی رہتی ہو؟“ بشارت نے اسے گھورا۔ ”وہاں تمہیں ڈر نہیں لگتا؟“

”وہاں چاروں طرف آبادی ہے، گھر سے گھر ملے ہوئے ہیں۔ چھپک بھپ بھپ بھی مارو تو پڑوسیوں کو پتہ چل جاتا ہے اور یہاں..... دور دور تک ویرانہ ہے۔ قرب وجوار میں کوئی مکان آباد نہیں۔ نہیں بھئی۔ میں اس گھر سے میں اکیلی نہیں سو سکتی۔“ سنیا نے کہا۔

”پھر کہاں سوؤ گی؟“ بشارت نے اسے گھورا۔

”تمہارے ساتھ..... میرا مطلب ہے تمہارے کمرے میں۔“ وہ جلدی سے ہوئی۔

یوں تو بشارت سنیا کے ساتھ اس کے گھر میں اکیلا ہی رہ رہا تھا لیکن وہ الگ الگ کمروں میں سوئے تھے۔ اس نے ایک رات سنیا کے ساتھ اس کے دفتر والے کمرے میں بھی گزار دی تھی لیکن اس وقت صورت حال مختلف تھی۔

”پتا بیڑ اسی کمرے میں لے آؤ یا میرا بیڑ اپنے کمرے میں لے چلو۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ میں اکیلی نہیں سوؤں گی۔“

سنیا نے کہا اور اس کے ساتھ ہی آگے بڑھ کر بیڑ پر بٹھا ہوا میسر پہلے گئی۔

وہ دونوں مل کر بیڑ بشارت والے کمرے میں لے آئے جو شکرے کے کمرے کے عین سامنے تھا۔ سنیا میسر بٹھاتے ہی بیڑ پر لیٹ گئی۔ بشارت نے شکرے کے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ وہ سوچا تھا اس نے تمام روزانے وغیرہ چیک کئے پولیس والوں کی دونوں راتھیں اپنے کمرے میں رکھ لیں۔ ویسے اسے یقین تھا کہ فوری طور پر انہیں راتھوں کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

وہ اپنے کمرے میں آگیا۔ سنیا کی بھی آنکھیں بند تھیں۔ بشارت نے ٹیوب لائٹ بند کر کے ٹینگوں روشنی والا ٹائٹ بلب جلایا اور اپنے میسر پر لیٹ گیا۔ وہ ایک بار پھر گزرے ہوئے واقعات کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ پہلے صرف جیب کترا تھا پکڑے جانے کی صورت میں اس جرم کی سزا مین دو مین یا زیادہ سے زیادہ تین چار مین کی سزا ہو سکتی تھی لیکن اب وہ قاتل بن چکا تھا گزرنے والے ہر دن کے ساتھ وہ اس دلدل میں دھنسا جا رہا تھا۔ شبنم کے آدمیوں سے قصاص میں ایک آدمی اپنے ہی ساتھی کے ہاتھوں مارا گیا تھا لیکن شبنم کسی بھی وقت پولیس کو اس کا نام دے سکتی تھی اور وہ سنیا کو کچھ ایسی دھمکی بھی دے چکی تھی۔

اور پھر آج کا واقعہ.....! پولیس شکرے کو بھی چوہدری عمر کے گن میٹوں کا قاتل گردان رہی تھی۔ انہیں شکرے کے اس ساتھی کی بھی تلاش تھی جو اس روز رقم سے بھرا ہوا ایک لے کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ شکرہ تین ہفتوں سے پولیس کی حراست میں تھا۔ وہ موت کے منہ سے لوٹا تھا اور بڑی تیزی سے صحت یاب ہو رہا تھا۔ چند روز بعد پولیس اس کیس کا چالان عدالت میں پیش کرنے والی تھی لیکن بشارت اسے پولیس کی حراست سے نکال لایا تھا۔ یہ بھی ایک سنگین ترین جرم تھا۔ پولیس ان کی تلاش میں زمین آسمان ایک کر دے گی اور اگر وہ پکڑا گیا تو دنیا کی کوئی طاقت اسے پھانسی کے پتھڑے سے نہیں بچا سکے گی۔

وہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا اور اب اس کے لئے واپسی کے تمام راستے بند ہو چکے تھے۔ بشارت بھی سب کچھ سوچتے ہوئے نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

بشارت گہری نیند میں تھا۔ یوں لگا جیسے اس کے سینے پر کسی قسم کا بوجھ پڑ رہا ہے۔ اسے سانس لینے بھی میں دشواری پیش آرہی تھی۔ اس نے کڑھ بدلنے کی کوشش کی مگر یوں لگا جیسے آنٹنوں نے اسے گرفت میں لے رکھا ہو۔ وہ اپنے آپ کو اس گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ دماغ پر نیند کے غبار کی وجہ سے پہلے تو وہ کچھ سمجھ نہیں سکا پھر اچانک ہی نیند کا فور ہو گئی اور اس کے دماغ پر جھوٹے سے برسنے لگے۔

سنیا اس کے ساتھ لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ بشارت کے سینے پر تھا اور ایک ٹانگ بھی اس کی ٹانگ کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ وہ گہری نیند میں تھی۔ چہرے پر بال بکھرے ہوئے تھے۔ ہائٹ بلب کی مدد سے ٹینگوں روشنی میں پہلے سے کہیں زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ بشارت

”ایک دن شاید ہمارا بھی یہی انجام ہو اور ہمارے لئے نہ تو کوئی افسوس کرنے والا ہو گا اور نہ آنسو بہانے والا۔“ بشارت نے کہا اس کے لیے میں بے پناہ افسوس کرتی تھی۔

”اور یہ سنیا کون ہے؟ رات کو تم نے اس کے بارے میں تفصیل سے نہیں بتایا تھا۔“ شکرے نے کہا۔

”سینہ جہاں ہماری طرح زمانے کی ستانی ہوئی ہے۔“ بشارت نے کہا۔ ”میں ابھی اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا لیکن اس نے جو کمائی ستانی ہے وہ واقعی بڑی درونگاہ ہے۔ بقول سینہ کے اسے مجھے جیسے کسی ساتھی کی ضرورت تھی جو خشم جیسی عورتوں سے اس کی حفاظت کر سکے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر سینہ کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔ ”اس روز اگر یہ مجھے نہ بچاتی تو شاید میں بھی اسپتال میں ہمارے ساتھ والے بیڈ پر پڑا ہوتا۔“

”سینہ کی کمائی واقعی افسوسناک ہے لیکن نہ جانے کیوں مجھے اس پر یقین نہیں آ رہا۔“ شکرے نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

”کیا مطلب؟“ بشارت نے اسے گھورا۔ ”کوئی شبہ ہے اس پر لیکن تم تو پہلی مرتبہ اس سے ملے ہو۔ پوری طرح ایک دوسرے سے متعارف بھی نہیں ہوئے۔“

”میری زندگی جہاں پیشہ لوگوں میں رہتے ہوئے گزری ہے جس طرح ایک جیب کترے کی حیثیت ہے میں کسی بندے کو دور سے ہی دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ اس کی جیب میں کتنی رقم ہو سکتی ہے اسی طرح کسی کا چہرہ دیکھ کر بھی بتا سکتا ہوں کہ وہ کون ہے اور کتنے پانی میں ہے۔ تمہاری یہ سنیا مجھے ہر بات میں لگتی ہے۔ بہت ہی دو گلی۔“

”لیکن میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ اس نے کم از کم دو مرتبہ مجھے پولیس سے بچایا ہے۔ دونوں میں سے کسی ایک موقع پر بھی پولیس کے ہاتھ لگ جاتا تو مجھے ختم کر دیا جاتا۔ لیکن دونوں مرتبہ اس نے اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر مجھے بچلایا اور جس اسپتال سے نکالنے کے لئے بھی اس نے میرا پورا پورا ساتھ دیا ہے۔ اگر میں مجرم ہوں تو وہ بھی میرے جرم میں برابر کی شریک ہے۔ وہ بھی پولیس کو اتنی ہی مطلوب ہو سکتی ہے جتنا میں۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ وہ میرے ساتھ کوئی دھوکا کر رہی ہے تو وہ کیا کر لے گی۔“

”یہ بات تو ابھی میری سمجھ میں بھی نہیں آ سکی۔“ شکرے نے اس کے خاموش ہونے

کے دل کی دھڑکن بے قابو ہونے لگی۔

اس نے گردن تھما کر دیکھ کر کھڑکی کا پردہ ذرا سا ہٹا ہوا تھا اور باہر دھوپ چمک رہی تھی۔ اس نے بڑی آہستگی سے پہلے سنیا کا ہاتھ اپنے سینے سے ہٹا کر پھر ٹانگ آزاد کرانی۔ اور بیڈ سے اتر کر کمرے سے باہر آ گیا۔

فرج میں سے پانی کی بوتل نکال کر ہونٹوں سے لگائی۔ برف جیسے ٹھنڈے پانی نے ایک لمحے کو اس کے دماغ کو بھی سم کر دیا لیکن اس کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اس کے دماغ کی تپش کم ہو گئی اور سینے میں بھی ٹھنڈی پڑ گئی۔

اس نے شکرے کے کمرے میں جھانک کر دیکھ کر وہ کڑکٹ کے بل لیٹا ہوا تھا اور آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ بشارت اندر جانے کے بجائے لوٹ کر کچن میں آ گیا اور چائے بنانے لگا۔ تقریباً بیس منٹ بعد وہ ٹرے میں پانی کا گلاس اور چائے کے دو کپ رکھ کر شکرے کے کمرے میں آ گیا۔ ٹرے اس نے میز پر رکھی اور شکرے کو سارا دے کر اٹھا دیا۔

”رات کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟“ اس نے پانی کا گلاس شکرے کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”میں تو ہمارے جاتے ہی سو گیا تھا۔ صبح سویرے میاں جی کی بانگ سے آنکھ کھل گئی۔“ اس نے پانی کا گھونٹ بھر کر ایک طرف فرش پر کھلی کر دی اور چند گھونٹ پانی پینے کے بعد گلاس بشارت کے ہاتھ میں دے دیا اور اس سے چائے کا کپ لے لیا۔ چائے پیتے ہوئے وہ جھپٹلی یادیں تازہ کرنے لگے۔

”استاد گنگو والا ڈیرہ تو شاید اب کبھی آباد نہ ہو سکے گا۔“ بشارت نے کہا۔

”کیوں؟“ شکرے نے اسے گھورا۔ ”میں اور تم ہی وہاں سے نکلے ہیں۔ دارا تو موجود ہے۔ وہ باقی لوگوں کو سنبھال لے گا۔“

”رات کو میں تمہیں بتانا بھول گیا تھا۔“ بشارت نے کہا۔ ”چاچا جانو پولیس کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔ تمام لڑکے بھاگ گئے ہیں۔ وہ ڈیرہ اب پولیس کے قبضے میں ہے۔“ وہ چند لمحوں خاموش ہوا پھر اسے بتانے لگا کہ اس رات ڈیرے پر کیا ہوا تھا۔

”اوہ۔“ شکرہ اس کے خاموش ہونے پر بولا۔ ”مجھے جانو چاچا کی موت کا بہت افسوس ہوا۔“ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

پر کلمہ ”چرنہ جانے کیوں میرا من اس کی طرف سے مطمئن نہیں ہے۔“

بشارت کچھ کہنا چاہتا تھا کہ باہر قدموں کی بہت ہلکی سی چاپ سن کر خاموش ہو گیا۔ چند سیکنڈ بعد ہی سینا دروازے میں نمودار ہوئی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے بالوں کو گردن پر سیٹھنے ہوئے جوڑا بنا رہی تھی۔

”ارے واہ! وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ ”میں جانے اڑائی جا رہی ہے اور مجھے پوچھا تک نہیں۔“

”سو تے میں تو تمہارے وطن میں گرم گرم چائے نہیں اڑی لی جاسکتی تھی۔“ بشارت نے مسکراتے ہوئے کلمہ ”دیسے ہمارے کپ خالی ہو چکے ہیں اور اگر تم کچن تک جاتے ہوئے کسی قسم کا خوف محسوس نہ کرو تو ہم بھی ایک ایک کپ اور پی لیں گے۔“

”خوف..... کس بات کا خوف؟“ سینا نے اسے گھورا۔

”دیرانے میں یہ مکان..... قرب و جوار میں کوئی گھر آباد نہیں۔ شاید ہمیں کسی قسم کا ڈر لگ رہا ہو۔“ بشارت نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کلمہ

ایک لمحے کو سینا کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ بشارت کی بات کا مطلب سمجھ گئی تھی۔ اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پایا اور اسے گھورتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

”ایک سگریٹ سلا کر دو اور مجھے ذرا ہاتھ روم تک لے چلو۔“ شکرے نے بشارت کی طرف دیکھتے ہوئے کلمہ

بشارت نے پیکٹ میں سے ایک سگریٹ نکل کر سلا دیا۔ ایک کش لگاتے ہی اس پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ اس نے سگریٹ شکرے کی طرف بڑھا دیا۔

”پتہ نہیں تم یہ ذہر کیسے پیچتے ہو۔“ اس نے کہتے ہوئے شکرے کو سارا دے کر بیڈ سے اتار دیا۔ ”اس وقت تو میرا جوا کمین لو۔ آج چیلوں وغیرہ کا بندوبست کرنا ہوں۔“

وہ شکرے کو اسپتال سے لائے تھے تو ظاہر ہے وہ غیر تھکے بشارت نے اسے جوتا پتا دیا اور اسے سارا دے کر چلا تا ہوا ہاتھ روم تک لے گیا۔ اسے ہاتھ روم میں چھوڑ کر وہ خود کمرے سے بھی باہر آ گیا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ شکرے ہی کے کمرے میں بیٹھے ہاتھ کر رہے تھے۔ ”ارے ہاں۔“ بشارت شکرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تمہارے حصے کی رقم میرے پاس رکھی

ہے۔ جب ضرورت سمجھو لے لینا۔“

”کیسا حصہ..... کیسی رقم.....؟“ شکرے نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں تمہیں بتانا بھول گیا تھا۔“ بشارت نے کلمہ ”اس روز میں جو بیگ لے کر بھاگا تھا اس میں سے چار لاکھ ساٹھ ہزار کی رقم برآمد ہوئی تھی جس میں سے دس ہزار کے نوٹوں کا ایک ہنڈل ضائع ہو چکا ہے۔ اصولی طور پر تو سینا کا بھی حصہ ہونا چاہئے لیکن وہ اس سے دستبردار ہو چکی ہے بلکہ اس رقم پر اپنا حق ہی نہیں سمجھتی۔ ساڑھے چار لاکھ میں آدمی رقم تمہارے حصے میں آئی ہے جب جاہو لے لینا۔“

”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔“ شکرے نے اسے گھورا۔ ”جب ہم لوگوں کی جھینس کاٹا کرتے تھے تو تم نے ہم نے اس وقت بھی نہیں کہے تھے۔ وہ رقم تم اپنے پاس ہی رکھو اور اسے استعمال کرتے رہو۔“

”اور جانتے ہو تمہارا وہ شمار کون کون کا تھا۔“ بشارت نے کہا اور جواب کا انتظار کئے بغیر بولا۔ ”چوہدری عمر کا بیٹا تھا جو بیگ سے رقم نکلا کر آ رہا تھا۔“

”چوہدری عمر کون؟“ شکرے نے پوچھا۔

”وہی سماجن جس نے ہمارے مکان پر قبضہ کر کے فروخت کر دیا تھا۔“ بشارت نے جواب دیا۔

”تو گویا تمہیں تمہارا حق مل گیا۔“ شکرے نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”اس طرح اس رقم پر صرف اور صرف تمہارا حق ہے۔ میں تو ایک ذریعہ بن گیا تھا وہ رقم تم تک پہنچانے لگا۔“

سینا خاموشی سے ان کی باتیں سنتی رہی۔ شکرے کی طرف سے رقم سے دستبردار ہونے کا سن کر اسے حیرت ہوئی تھی۔ وہ بڑی رقم تھی اور اس کے لئے شکرے نے اپنی جان کی بازی لگادی تھی اور اب اس کا خیال تھا کہ شکرہ ٹھیک ہوتے ہی بشارت سے رقم کا مطالبہ کرے گا لیکن اس نے رقم سے دستبردار ہونے کا اعلان کر کے اسے حیران کر دیا تھا۔

☆=====☆

باہر کے حالات کا انہیں کچھ پتہ نہیں تھا اور صورت حال سے آگاہ رہنا ان کے لئے

تھے۔

پولیس کے ذرائع کے مطابق شکرانہی اس خطرناک قیدی کو چھڑانے کے لئے باقاعدہ منصوبہ بندی کی گئی تھی۔ پہلے ڈاکٹر اور نرس کو بے ہوش کر کے ڈال دیا گیا اور پھر پولیس والوں کو بے بس کر کے قیدی کو چھڑا لیا گیا۔ پولیس کا خیال یہ بھی تھا کہ اس منصوبے میں شامل عورت نے اہم کردار ادا کیا تھا کیونکہ ہیڈ کانسٹیبل کے گال پر اپ اسٹک سے ہونٹوں کا نشان بنا ہوا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل اور ایک سنتری کو فرائض سے غفلت برتنے کے الزام میں ملازمت سے برخواست کر کے حراست میں لے لیا گیا ہے جبکہ تیسرا سنتری دماغ کی نس پھٹنے سے ہلاک ہو گیا تھا۔ پولیس کے ترجمان کے مطابق اس کے سر پر کاری ضرب لگائی گئی تھی جس سے اس کی موت واقع ہو گئی۔

تمام واقعہ بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا تھا۔ زندہ بچ جانے والے سنتری اور ہیڈ کانسٹیبل کے بھی بیانات تھے اور ڈیوٹی روم میں بے ہوش پائے جانے والے ڈاکٹر اور نرس کے بیانات بھی شائع ہوئے تھے۔

پولیس نے اس واقعے کا علم ہوتے ہی پورے شہر میں طمان کی تلاش شروع کر دی تھی اور تمام پرائیویٹ اسپتالوں اور کلینکوں کی بھی گہرائی میں تلاش شروع کر دی تھی۔ پولیس کا خیال تھا کہ زخمی قیدی کا علاج کرانے کے لئے کسی پرائیویٹ اسپتال یا کلینک میں کوشش کی جائے گی اور اس طرح پولیس سمیت جلد ان کا سراغ لگے گی۔

”رات کو جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا تو میرے اندر سنسنی اور خوف کا ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔“ شکرے نے کہا۔ ”لیکن اخبار کی ان خبروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ صورت حال اس سے کہیں زیادہ عجیب تھی۔“

”ہاں..... مجھے بھی ایسی احساس ہو رہا ہے۔“ بشارت نے کہا۔ ”ان کا خیال ہے کہ ہم جنہیں علاج کے لئے کسی پرائیویٹ اسپتال یا کلینک لے جائیں گے اور اس طرح دھر لے جائیں گے۔“

”مجھے اس علاج کی ضرورت نہیں۔“ شکرے نے کہا۔ ”زخم بھر گئے ہیں۔ معمولی سی تکلیف ہے۔ چند روز آرام کروں گا تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔“

”آرام کے علاوہ ابھی جنہیں علاج کی بھی ضرورت ہے، اور میں نے اس کا بہت واسطہ

ضروری تھا۔ رات کو اس طرف آتے ہوئے سڑک پر بشارت نے چند دکانیں دیکھی تھیں۔ وہ دکانیں اگرچہ بند تھیں مگر ایک دکان پر بک اسٹور اینڈ نوز سپر ایجنسی کا بورڈ بھی لگا ہوا تھا اور بشارت کا خیال تھا کہ وہاں سے اخبار ضرور مل جائے گا۔

بشارت سینا سے کہہ کر خوشی سے باہر چلا گیا۔

وہ سات آٹھ دکانیں تھیں جن میں ایک سائیکل ٹانپ کا ہوٹل بھی تھا جہاں مزدور پیشہ لوگ کھانا وغیرہ کھاتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ بک اسٹال تھا۔ بشارت نے بک اسٹال سے اخبار اور اپنی پسند کی ایک دو کتابیں خریدیں۔ دوسری دکانوں سے بھی کچھ سودا خریدے اور واپس آگیا۔ اس نے اخبار ابھی تک کھول کر نہیں دیکھا تھا۔

جب وہ کوشی میں داخل ہوا تو سینا کے جسم پر بدلے ہوئے کپڑے دیکھ کر چونک کر بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

”یہ..... یہ کپڑے کہاں سے آئے؟“ اس نے سینا کو گھورا۔

”دو دن پہلے کپڑے لاٹھری پر دینے کے لئے گھڑی باندھ کر کاری ڈوٹی میں رکھے تھے لیکن لاٹھری پر دینا یاد نہیں رہا تھا۔ اس وقت اتفاق سے یاد آگیا تو میں نے وہ گھڑی نکال لی۔ نرس کا ڈریس پہنے ہوئے مجھے ویسے بھی ابھین ہو رہی تھی اور ان کپڑوں میں تو میں باہر بھی نہیں جاسکتی تھی۔“

”اور تمہاری عینک کہاں ہے؟“ بشارت نے پوچھا۔

”مکار کے ڈیش بورڈ میں کپ کے ساتھ رکھی ہوئی ہے۔“ سینا نے کہا۔ وہ باتیں کرتے ہوئے شکرے والے کمرے میں آگئے۔ بشارت شکرے کے لئے ہوائی چیل بھی لے آیا تھا جو اس نے قیلے میں سے نکال کر اس کے بیڈ کے قریب رکھی اور اخبار کھول لیا۔

وہ خبر پہلے ہی صفحے پر تھی لیکن سرخی پر پڑتے ہی وہ اچھل پڑا۔ گزشتہ رات جن تمیز پولیس والوں کو انہوں نے اسپتال والے کمرے کے ہاتھ روم میں بے ہوش کر کے بند کیا تھا ان میں سے ایک ہلاک ہو گیا تھا۔ بشارت اونچی آواز میں وہ خبر پڑھا چلا گیا۔

وہ ایک نہیں اس کے ساتھ چھوٹی چھوٹی اور بھی تین چار خبریں تھیں۔ ایک خبر یہ تھی کہ پرائیویٹ دارڈ کی نرس اور نائٹ ڈیوٹی کا ایک ڈاکٹر اپنے ڈیوٹی روم میں بے ہوش پڑنے کے بعد پائے لگے تھے۔ ان کے ہاتھ پر بندھے ہوئے تھے اور دونوں کے منہ میں کپڑے ٹھنسنے ہوئے

بھی کر لیا تھا۔ جنہیں اسپتال سے نکالنے کا منصوبہ بناتے ہوئے ہر بات میرے ذہن میں تھی۔" بشارت نے کہا۔

اس روز وہ وقتاً فوقتاً اسی صورت حال پر چاولہ خیال کرتے رہے۔ اس دوران میں سنیٹ نے اپنا کپڑوں کا ایک جوڑا بھی دھو کر دھوپ میں ڈال دیا تھا۔ واش اینڈ ویز جسم کے اس کپڑے کو اسٹری کرنے کی ضرورت بھی نہیں پڑی تھی۔

"مگر ہمیں چند روز نہیں رہنا ہے تو مجھے کچھ چیزوں کی ضرورت پڑے گی اور اس کے لئے مجھے باہر جانا پڑے گا۔" سنیٹ نے کہا۔

"باہر جانے کی کوئی پابندی نہیں ہے۔" بشارت نے کہا۔ "وہ پولیس والے اور نائٹ ڈیوٹی کی نرس اور ڈاکٹر۔ ان میں سے کوئی بھی ہمارا حلیہ واضح طور پر نہیں بتا سکا۔ اس طرح اچانک اقدار پڑ جانے پر خوفزدہ ہو جانے والا شخص بدحواس ہو جاتا ہے اور وہ کسی کا چہرہ یاد نہیں رکھ سکتا اور تم ویسے بھی نرس کے ڈریس میں تھیں۔ آنکھوں پر عینک بھی تھی اور اس وقت تو تم بالکل ہی بدلی ہوئی ہو۔ جنہیں دیکھ کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ دی نرس ہے جو رات کو اپنے ایک ساتھی کے ساتھ زخمی قیدی کو چھڑا کر لے گئی تھی۔ ہمیں خیال صرف اس بات کا رکھنا ہے کوئی مشتبہ شخص ہمارے پیچھے یہاں تک نہ آئے پائے۔ ویسے آج تم اسپتال جاؤ گی اور اس نرس سے صورت حال معلوم کر دو گی۔"

"کیا.....؟" سنیٹ اچھل پڑی۔ "تمہارا دلخ تو خراب نہیں ہو گیا؟"

"میں بھی تمہارے ساتھ ہوں گا۔" بشارت نے کہا۔ "مجھے یقین ہے جنہیں کوئی پہچان نہیں سکے گا اور اگر کچھ ہوا تو دیکھا جائے گا۔"

بشارت نے شکرے کو بھی اپنے پروگرام سے آگاہ کر دیا۔ چار بجے کے قرن سنیٹ تیار ہو گئی۔ اس نے بیگ میں رکھی ہوئی چیزوں سے چہرے پر پلاسٹک اپ کر لیا تھا۔ بشارت نے ایک راتفل شکرے کے بیڈ کے قریب رکھ دی تھی۔ باہر نکلتے ہوئے انہوں نے تمام دروازے بند کر دیے اور گیٹ کو بھی باہر سے تالا لگا دیا تھا۔

اسپتال روڈ والے گیٹ کی طرف آنے کے بجائے سنیٹ نے بشارت کی ہدایت کے مطابق کار پلا گیند کی طرف موڑ لی تھی۔ اس طرف بھی اسپتال کا ایک بڑا گیٹ تھا جو عام طور پر بند ہی رہتا تھا۔ پیدل آمدورفت کے لئے ایک ذیلی دروازہ تھا۔ سنیٹ نے کار گیٹ سے کل

دور کھڑی کر دی اور وہ دونوں پیدل چلے ہوئے اس ذیلی دروازے میں داخل ہو گئے۔ وہ مریضوں سے ملاقات کا وقت تھا اور اچھے خاصے لوگوں کی آمدورفت تھی۔

سنیٹ کا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ شولڈر بیگ پر ٹکا رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے بشارت کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ گزشتہ رات ڈاکٹر کے ڈریس میں بشارت اسپتال میں آیا تھا تو اس نے بالوں کی مانگ درمیان سے نکال رکھی تھی اور اب مانگ بائیں طرف سے نکلی ہوئی تھی۔ آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ بھی تھا۔ ان دونوں معمولی سی تبدیلیوں سے اس کا حلیہ بدل گیا تھا اور فوری طور پر ڈاکٹر کی حیثیت سے پہچانا ممکن نہیں تھا۔

اسپتال کا وہ بلاک وہاں سے بہت دور تھا۔ اس طرف سے آنے والوں کو لوگوں کو بہت طویل فاصلہ پیدل طے کرنا پڑا تھا۔

اس بلاک کے سامنے گھاس کا وسیع پلاٹ تھا۔ کچھ بکھیرت کے بیچ بھی رکھے ہوئے تھے۔ لوگ تینوں پر بھی بیٹھے ہوئے تھے اور ٹولیوں کی صورت میں گھاس پر بیٹھے بھی ادھر اُدھر دوڑتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ بشارت ایک درخت کے نیچے چکر گیلد "تم جاؤ..... میں یہاں کھڑا ہوں۔"

سنیٹ نے خوفزدہ سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر ہوئے بلاک کی طرف چلے گئی۔ اس نے ایک ہاتھ کا انگوٹھا شولڈر بیگ کے اسٹریپ میں پھنسا رکھا تھا۔

اس نرس کو تلاش کرنے میں سنیٹ کو دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ "تم یہاں کیوں آئی ہو۔" نرس سنیٹ کو دیکھتے ہی بولی۔ "اگر کسی کو پتہ چل گیا کہ میں جنہیں اس قیدی کے بارے میں بتاتی رہی ہوں تو میری بھی شامت آجائے گی۔ پولیس اسپتال کے تمام اسٹاف کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اسپتال کے اندر کے کسی آدمی نے اس نقلی نرس اور ڈاکٹر کی مدد کی تھی۔"

"ان کا پتہ نہیں چلا کہ وہ کون تھے؟" سنیٹ نے پوچھا۔

"نہیں۔" نرس نے جواب دیا۔ "پولیس چوکیداروں سے بھی پوچھ گچھ کر رہی ہے۔ ان سے اسپتال کے تمام ڈاکٹروں اور نرسوں کی شناخت بھی کرائی جا رہی ہے لیکن وہ کسی کو نہیں پہچان سکے۔ نرسیں اور ڈاکٹر پولیس کے اس طرز عمل پر احتجاج کر رہے ہیں۔ انہوں





ہے۔“

سینٹا سر جھٹک کر رہ گئی۔ اس نے سوٹ کیس کار کی ڈی کی رکھ دیا۔ بریف کیس بشارت نے پیجر سیٹ کے سامنے پیروں میں رکھ رکھا تھا۔

وہ شہر کی مختلف سڑکوں پر گھومتے ہوئے ملان روڈ کی طرف سے علامہ اقبال ٹاؤن کی طرف جانے والی سڑک پر مڑ گئے۔ کچھ آگے جا کر بشارت کو اسے راستہ بتانا پڑا کہ کس طرف جانا ہے۔ یہاں تک آتے ہوئے بشارت نے اس بات کا بھی خیال رکھا تھا کہ ان کا تعاقب تو نہیں کیا جا رہا۔

اس وقت شام کا اندھا میرا چیل رہا تھا۔ شہر اسے بیڑ پر کروت کے بل لیٹا ہوا تھا۔ بشارت نے اسے سہارا دے کر رکھا دیا۔

”ہسپتال میں تو ہمیں وقت پر دو ملتی تھی، دیکھ بھال بھی ہوتی تھی لیکن یہاں وہ بات نہیں ہے۔ ہمیں کوئی تکلیف تو نہیں ہو رہی؟“

”ہسپتال میں بھی دو انیس تو عام سی دی جاتی تھیں۔ البتہ دن میں ایک بار پٹی ضرور بدل دی جاتی تھی۔ ویسے مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔“ شکرے نے کیا۔

دس بجے کے قریب بشارت، سینٹا کا ساتھ لے کر ایک بار پھر کو شہر سے نکل گیا۔ اس مرتبہ ان کی منزل اچھرے کی ایک گلی تھی۔ بشارت نے کار گلی کے کنارے پر مڑ کر کوادی تھی۔ اس نے سینٹا کو انتظار کرنے کو کہا اور کار سے اتر کر گلی میں چلا گیا۔

گلی کافی کشادہ تھی۔ مکان بھی سلیقے سے بنے ہوئے تھے۔ وہ ایک مکان کے سامنے رک گیا اور کال تیل کے بن بن پر انگلی رکھ دی۔ اندر کہیں کھنک بننے کی آواز سنائی دی اور اس کے چند سیکنڈ بعد ہی اوپر والی کھڑکی سے ایک لڑکی کی آواز سنائی دی۔

”کیا بات ہے کس سے ملنا ہے جی؟“

”ہاں ارشد بی بی سے ملنا ہے۔“ بشارت نے جواب دیا۔

دو منٹ بعد ہی دروازہ کھلا اور ایک عورت برآمد ہوئی۔ اس کی عمر پچاس اور بچپن کے درمیان رہی ہوگی۔ بال برف کی طرح سفید تھے مگر صحت قابل رشک تھی۔

”اوہ..... تم ہو۔ مگر اس وقت۔“

”زیادہ دیر نہیں لگے گی ماس، میرے پاس گاڑی ہے۔ میں ہمیں واپس یہاں پہنچا دوں

مطالبات پیش کرنے والی ہے۔ نرس مدیحہ بھی اس کینیٹ میں شامل ہے اور وہ ڈاکٹر رضوان، نرس کو بتائے آیا تھا کہ وہ میننگ روم میں پہنچ جائے۔ اسے اپنے سامنے دیکھ کر میرا تو سانس رکنے لگا تھا اور جب وہ میرے چہرے کو دیکھ رہا تھا میں سمجھ رہی تھی کہ اب وہ میرا گریبان پکڑے گا لیکن.....“

”لیکن وہ ہمیں نہیں پہچان سکا۔“ بشارت نے مسکراتے ہوئے اس کا جملہ مکمل کر دیا۔ ”میں نے کہا تھا انہیں کوئی نہیں پہچان سکے گا۔ لباس شخصیت بدل دیتا ہے تم بھی اس وقت بہت بدلی ہوئی ہو۔ نرس کے ڈریس میں تم کچھ اور تھیں اور اس لباس میں کچھ اور لگ رہی ہو۔ ویسے نرس نے کیا بتایا؟“

”پہلے یہاں سے نکل..... بعد میں بتاؤں گی۔“ سینٹا نے کیا۔

بشارت کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ سینٹا اب تک اس کی سمجھ میں نہیں آسکی تھی۔ کہاں تو اتنی جرأت اور بہادری کا مظاہرہ کہ دو مرتبہ اسے پولیس سے بھاگ کر لے گئی تھی اور تیسری مرتبہ گزشتہ رات اپنے آپ کو ایک بار پھر موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا اور کہاں یہ کہ کسی معمولی سی بات سے اس طرح خوفزدہ ہو جاتی تھی کہ وہ قہر قہر کانپنے لگتی تھی اور منہ سے آواز تک نہیں نکلتی تھی۔

وہ خاموشی سے چلتے رہے۔ گیت سے باہر نکل کر وہ کار میں بیٹھ گئے۔

”اب کہاں چلنا ہے؟“ سینٹا نے انہیں اشارت کرتے ہوئے پوچھا۔

”تمہارے گھر۔“ بشارت نے کیا۔ ”تم اپنی ضروری چیزیں بھی لے لو اور صبح وہ رقم

بھی لیتی ہے۔“

آوے تھے بعد وہ سینٹا کے گھر پہنچ گئے۔

سینٹا اپنے کپڑے اور کچھ اور ضروری چیزیں سمیٹنے لگی۔ اس نے بشارت کے کپڑے بھی سمیٹ لئے تھے۔ بشارت نے وہ بریف کیس بھی الماری سے نکال لیا جس میں رقم بھری ہوئی تھی۔

وہ تقریباً ایک گھنٹہ مکان میں رہے تھے اور جب باہر نکل رہے تھے تو فون کی کھنٹی بج

اٹھی۔ سینٹا نے فون کی طرف بڑھنا چاہا مگر بشارت نے اسے روک لیا۔

”اس وقت کوئی کال رسیور کرنے کی ضرورت نہیں کسی قسم کی الجھن بھی پیدا ہو سکتی

گلہ" بشارت نے کہا۔

"اچھا رکو۔ میں ابھی آتی ہوں۔ ہاں..... کیا بتایا تھا تم نے..... وہ زخمی ہے یا

کوئی..... تکلف بھی ہے۔" ماسی ارشدابی نے کہا۔

"زخمی ہے اور زخم بڑی حد تک ٹھیک ہو چکے ہیں۔ تمہیں بس ڈرننگ تبدیل کرنی ہو گی۔" بشارت نے کہا۔

ماسی ارشدابی نے اندر چلی گئی۔ اس کی واپسی تقریباً دس منٹ بعد ہوئی تھی۔ اس نے سیاہ رنگ کا ایک بیک اٹھار کھاتھا جو بشارت نے لے لیا۔

بشارت نے اسے کار کی پچھلی سیٹ پر بٹھادیا اور بیک بھی اندر رکھ دیا۔ وہ خود آگے بیٹھ گیا تھا۔

بازار کی طرف مڑتے ہی ماسی ارشدابی نے ایک جگہ کار کو الٹی۔ "کچھ دوائیں وغیرہ لینی ہیں۔ پیسے دو۔ میں خود لے کر آتی ہوں۔" ماسی ارشدابی نے کہا۔

بشارت نے جب سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر دے دیا۔ ماسی ارشدابی نے کار سے اتر کر کچھ آگے ایک میڈیکل سٹور میں داخل ہو گئی۔ اس کی واپسی تقریباً دس منٹ بعد ہوئی تھی۔ پلاسٹک کی ایک جھلی میں ڈرننگ رول اور کاغذ بول بھی تھے۔

اچھرے سے آگے کا علاقہ ابھی پوری طرح آباد نہیں ہوا تھا۔ سڑکوں پر اسٹریٹ لائٹیں بھی نہیں تھیں۔ بشارت نے جب سے سیاہ کپڑے کی ایک چوڑی پٹی نکلی اور مڑ کر ماسی ارشدابی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "برامت مانا ماسی۔ مجھے تم پر مکمل بھروسہ ہے لیکن میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتا۔ یہ پتی آنکھوں پر باندھ لو۔"

ماسی نے گھور کر اس کی طرف دیکھا اور پھر کپڑا اس سے لے کر پٹی کی طرح آنکھوں پر باندھ لیا اور بشارت کے حکم پر سیٹ پر نیم دراز ہو گئی۔

ماسی ارشدابی نے ایک تربیت یافتہ نرس تھی۔ سرکاری اسپتال میں اس کی بیس سال کی سروس تھی۔ اسے بہت شریف عورت سمجھا جاتا تھا لیکن پھر اس نے ایسی حرکتیں شروع کر دیں جو نہ صرف قاتل اعراض بلکہ غیر قانونی تھیں اور ایک مرتبہ تو وہ رنگے ہاتھوں پکڑی گئی تھی جس وجہ سے اسے نہ صرف بیس سالہ پرانی سروس سے ہاتھ دھوئے پڑے تھے بلکہ تین مہینے کی سزا بھی کاٹی پڑی تھی۔

تیل سے رہا ہونے کے بعد کچھ عرصہ تو وہ دیکھی رہی پھر ایک پرائیویٹ کلینک پر نوکری کر لی لیکن چند مہینوں بعد ہی ڈاکٹر کو پتہ چل گیا کہ وہ غیر قانونی کاموں میں ملوث ہے۔

ماسی ارشدابی نے ایسی عورتوں کے لئے نجات دہندہ تھی جو کسی چکر میں پھنس کر اپنے آپ کو مصیبت میں جلا کر لیتی تھیں۔ ماسی بھاری معاوضہ لے کر انہیں پیٹھ میں پٹنے والے گمناہ سے نجات دلا دیتی تھی۔

اس ڈاکٹر کو پتہ چل گیا کہ ماسی ارشدابی نے یہاں بھی یہ دھندہ شروع کر دیا تھا لہذا اس نے فوراً ہی اسے چن کر لیا۔

ماسی ارشدابی نے اب یہ دھندہ گھر پر ہی کرتی تھی۔ لوگ بھاری معاوضہ دے کر اس کی خدمت حاصل کرتے تھے۔ بشارت کو اس کے بارے میں تین چار مہینے پہلے پتہ چلا تھا۔ ان دنوں وہ اپنے ایک دوست سے ملنے کے لئے یہاں آیا تھا۔ اس روز وہ سڑک کے موڑ پر کھڑے تھے اور ماسی کو سامنے سے گزرتے دیکھ کر دوست نے بشارت کو اس کے بارے میں بتایا تھا۔

اور پھر اسی روز شکرے کو پولیس کی حراست سے چھڑانے کے لئے منصوبہ بناتے وقت بشارت کے ذہن میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ بعد میں بشارت کو علاج کی ضرورت ہوگی اور اسی وقت ماسی ارشدابی نے کام اس کے ذہن میں ابھرا تھا۔ ماسی ارشدابی نے بیس سال اسپتال میں سروس کر چکی تھی۔ اس نے ہر قسم کے مریضوں کو دیکھا ہو گا۔ اتنی پرانی نرسیں تو ڈاکٹر سے بھی زیادہ تجربہ کار ہوتی ہیں اور پھر شکرے کا کس زیادہ پیچیدہ نہیں تھا۔ بشارت نے خاص روز ماسی ارشدابی سے رابطہ کر کے آمادہ کر لیا تھا اور دو ہزار روپے ایڈوانس بھی دے دیے تھے۔

کار گیٹ میں داخل ہونے کے بعد بشارت نے ماسی ارشدابی کی پتھ سے پکڑ کر نیچے اتارا اور کمرے میں لے جانے کے بعد ہی اس کی آنکھ سے پٹی کھولی تھی۔ کچھ دیر تک وہ آنکھیں ملتی رہی پھر اوپر اوپر دیکھنے لگی۔ بشارت اسے شکرے والے کمرے میں لے آیا۔ اس دوران میں سینہ اس کا بیک اور دواؤں والا قہیلا بھی لے آئی تھی۔ سینہ کے خیال میں کاغذ کارول اور دوائیں وغیرہ زیادہ سے زیادہ سو روپے کی آئی ہوں گی مگر ماسی نے پانچ سو کے نوٹ سے باقی رقم واپس نہیں کی تھی۔

ماسی ارشدابی نے بی بی سے شکرے کے جہم پر بندھی ہوئی پٹی کھول دی اور پھر اس کی پشت پر

تین زخم دیکھتے ہی چوک گئی۔ زخم بھر گئے تھے۔ ان کے اطراف کی جلد گلہابی ماں مل گئی تھی۔ وہ مہری نظروں سے ان زخموں کا جائزہ لے رہی تھی۔

”تم نے مجھے بتایا تھا کہ تمہارا بندہ آپس کی لڑائی سے زخمی ہو گیا ہے لیکن یہ..... یہ تو پولیس کیس ہے۔“ وہ بشارت کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”تمہارا ہر کیس ویسے بھی پولیس کیس ہی ہوتا ہے۔“ بشارت نے اسے گھورا۔ ”اس لئے بھول جاؤ۔ یہ کون سا کیس ہے۔ تمہیں اس کا علاج کرنا ہے اور راز داری کے لئے ہی تمہیں اتنی زیادہ رقم دی جا رہی ہے۔“

”یہ وہی لڑاکا ہے جسے کل اسپتال سے فرار کر آیا گیا تھا اور تم لوگ.....“ اس نے جلد اور اچھوڑ دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف ابھر آیا۔ بشارت اس کی بات سن کر چوک گیا۔

”یہ تم نے کیسے کہہ دیا تھا کہ اسے اسپتال سے فرار کر آیا گیا ہے۔“ بشارت نے اسے گھورا۔

”آج اخباروں میں اس کے بارے میں سب کچھ چھپ چکا ہے۔ اگر اس کی تصویر نہیں چھپی ہو تو کیا ہو۔ اس کے زخم تمہارے ہیں کہ یہ اسپتال میں زیر علاج تھا اور آج تمام پرائیویٹ اسپتالوں اور کلینکوں کے لئے یہ وارننگ بھی چھپی ہے کہ یہ شخص علاج کے لئے ان کے پاس آئے تو قوری طور پر پولیس سے رابطہ کیا جائے۔ بصورت دیگر.....“

”جی۔“ بشارت نے اسے ٹوک دیا۔ ”تم نے تو پرائیویٹ اسپتال کو بے ہوشی ہو اور نہ کلینک۔ میں اسی لئے تمہارے پاس آیا تھا۔ تم شاید بھول رہی ہو کہ دو مہینے بعد تمہیں اپنی بیٹی کی شادی کرنی ہے اور تمہیں پیسے کی ضرورت ہے۔ ٹھیک۔ یہود آبادی والوں کی وجہ سے ویسے بھی تمہارا دوسرا دھندہ خراب ہو چکا ہے۔ آج کل تو ویسے بھی کل محلے کی ہرکان پر ایسی چیزیں مل جاتی ہیں جن کے استعمال سے محبت کرنے والوں کے دلوں میں کوئی ڈر خوف نہیں رہتا۔“

”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ اگر پولیس کو پتہ چل گیا تو اس پر بھلاپے میں جیل کی ہوا کھانی پڑے گی۔“ ماسی اور شادی بی بی نے کہا۔

”جیل تمہارے لئے نئی تو نہیں ہے ماسی۔“ بشارت نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔ ”کچھ عرصے پہلے ہی تو تین مہینے گزار کر آئی ہو لیکن اطمینان رکھو۔ ہماری طرف سے

ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ تم ہمارا راز رکھو۔ ہم تمہارا راز رکھیں گے۔ اس میں زیادہ فائدہ تمہارا ہی ہے۔ اب تم مریض پر توجہ دو۔“

”ماسی اور شادی کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ شخص اس کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔ وہ خاموشی سے جبکہ کر شکرے کے زخموں کا معائنہ کرنے لگی۔ اس نے شکرے سے کچھ سوالات بھی کئے پھر ٹریک میں سے ایک ٹیوب نکال کر مہم اس کے زخموں پر لگانے لگی۔ ڈرنک کرنے کے بعد اس نے ہاتھ روم میں جا کر ہاتھ دھوئے اور پھر تھیلے میں سے ڈسپوزیبل سرنج اور ایک انجکشن نکال لیا۔ شکرے کو ایسے انجکشن اسپتال میں بھی لگ چکے تھے۔ ماسی نے اس کے بازو کے مسل میں سوئی چھوئی تو اس کے ہونٹ سکڑ گئے۔ بڑا سخت ہاتھ تھا مگر بہت نلک۔

”میں انجکشن اور گولیاں لے لئی تھی۔ انجکشن لگا دیا ہے یہ گولیاں دن میں تین ٹائم دیتے رہنا۔ زخم خشک ہو جائیں گے اور دو تین دن بعد ڈرنک کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔ چند روز تک یہ مہم لگا دینا ہی کافی ہو گا۔“ ماسی نے کام اور تھیلے میں سے گولیوں کا ایک پتا میز پر الگ رکھ دیا۔ اس نے پلاسٹک کا تھیلہ بھی میز پر ہی رہنے دیا تھا۔

بشارت نے جب سے پانچ پانچ سوکے دو نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں دے دیئے۔ ماسی نے وہیں کھڑے کھڑے گریبان میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹا سا پرس نکالا۔ نوٹ تہہ کر کے اس میں رکھے اور پرس کو دوبارہ گریبان میں غولس لیا۔ بشارت نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور ہاتھ سے پکڑ کر باہر لے آیا۔

تین دن تک وہ ماسی اور شادی بی بی کو کسی طرح لاتے اور واپس چھوڑتے رہے۔ چوتھے روز سنیٹا اور بشارت حسب معمول رات ساڑھے دس بجے ماسی اور شادی بیکم کو لینے کے لئے پہنچ گئے۔ کار گلی کے موڑ پر دوری روک لی گئی۔ بشارت کار سے اتر کر جیسے ہی گلی میں مڑا ٹھک کر رک گیا۔ گلی میں بہت سے لوگ جمع تھے اور ماسی اور شادی بی بی کے گھر کے سامنے پولیس کی جیب کھڑی تھی۔ ایک مسل پولیس والا بھی، جیب کے قریب مکان کے دروازے کے سامنے والے حجرے پر کھڑا تھا۔

بشارت واپس مڑا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کار کے قریب پہنچ گیا اور دروازہ کھول کر اندر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”جلدی نکلیں۔“

ہے۔ وہ تم بھی لگا سکتے ہو اور گولیاں تو میں ویسے ہی لگا رہا ہوں۔ ختم ہو جائیں گی تو اور لے آئیں گے۔“

”ہاں! اب تو مجبوری ہے۔“ بشارت کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ اس دوران میں سنیا بھی وہل اٹھی اور وہ دیر تک ماسی ارشاد کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔

”تمہیں اس عورت کے بارے میں کیسے پتہ چلا تھا کہ یہ اس قسم کے دھندے کرتی ہے؟“ شکرے نے بشارت کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تمہیں یاد ہے تین چار مہینے پہلے میں اچھرے چلا کرتا تھا۔ مقصود سے ملنے کے لئے۔“ بشارت نے جواب دیا۔ ”ایک دن ہم موٹر پر کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ ماسی ہمارے قریب سے گزری۔ مقصود نے مجھے اس کے بارے میں بتایا تھا۔ اس وقت تو ظاہر ہے میں نے کوئی توجہ نہیں دی مگر اب کام آگئی۔“

”ہوں۔“ شکرے نے ہنکارا ابھر۔ ”یہ ماسی میپتہ اسپتال کی دوایاں چوری کر کے بیچتی تھی اور اسپتال میں بھی عورتوں کا غیر قانونی دھندہ کرتی تھی اسی لئے اسے نوکری سے نکال دیا گیا اور تین مہینے کی سزا بھی ہو گئی۔ یہی بتایا ہے ناتم نے!“

”ہاں!..... کچھ ایسی ہی بات تھی۔“ بشارت نے اثبات میں سر ہلایا۔

”بات یہ ہے بشارت!۔“ شکرانہ سوچ انداز میں بولا۔ ”پولیس ایسے لوگوں کو نگاہ میں رکھتی ہے۔ صورت حال اس قدر سنگین ہو تو ایسے لوگوں کو بھی چیک کیا جاتا ہے۔ ماسی ارشاد بی بی چونکہ پہلے ہی سے غیر قانونی دھندے کرتی ہے۔ اس لئے ہو سکتا ہے پولیس کو اس پر شبہ ہوا ہو اور اسے پوچھ گچھ کے لئے پکڑ کر لے گئی ہو۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ بشارت نے جواب دیا۔ ”میں ماسی ارشاد بی بی کو آنکھوں پر پٹیا باندھ کر لایا کرتا تھا۔ وہ یہ نہیں بتا سکتی کہ اسے کہاں لے جایا جاتا تھا۔ وہ ہمارے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتی۔“

”میل تم ایک بہت ہی غلطی کر رہے ہو بشارت۔“ شکرے نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری گڈی..... ہو سکتا ہے اس ماسی میپتہ نے گڈی کا نمبر یاد رکھا ہو اور پولیس کو وہ نمبر بتا دے۔“

”ہاں یہ بات سوچنے کی ہے۔“ بشارت کی آنکھوں میں تشویش ابھر آئی۔ ”یہ بات

”کیا ہو؟“ سنیا نے انجمن اشارت کرتے ہوئے پوچھا۔ وہ ایک دم بدحواس سی ہو گئی تھی۔

”ماسی ارشاد بی بی کے گھر پر پولیس نے ریڈ کیا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ ہمارے لئے ماسی میپتہ بن جائے، ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہئے۔“ بشارت نے کہا۔

سنیا کار کو حرکت میں لے آئی اور پھر گلیوں سے نکلے ہی اس نے رفتار بڑھا دی۔

بشارت بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتا رہا۔

”پولیس کس پتھر میں آئی ہو گی؟“ سنیا نے خلی پلاٹوں کے بیچ ایک تنگ سی سڑک پر کار موڑتے ہوئے پوچھا۔

”عورتوں کے پیٹ میں پٹنے والے گناہوں سے نجات دلانے کے حوالے سے ماسی ارشاد بی بی خاصی بدنام ہے۔ دیپے تو پولیس ایسے لوگوں کے بارے میں سب کچھ جانتی ہے لیکن ہو سکتا ہے کوئی کیس ہو گیا ہو، معاملہ سنگین ہو گیا ہو۔ پولیس والے پوچھ گچھ کے لئے آئے ہوں گے۔ لوگوں کو تو ایسے مواقع کی تلاش رہتی ہے۔ اُس کے گھر کے سامنے سیلہ لگا ہوا تھا۔“ بشارت نے کہا۔

وہ ماسی ارشاد بی بی کے بارے میں قیاس آرائیاں کرتے ہوئے کو خمی بیچ گئے۔ بشارت جب ماسی ارشاد بی بی کے بغیر کمرے میں داخل ہوا تو شکرے کو کسی گڑباز کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

”ماسی کے گھر پر پولیس نے چھاپا مارا ہے۔“ بشارت نے اس کی نگاہوں کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا اور سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

”تو پولیس کو پتہ چل گیا کہ وہ ضرور قیدی کا علاج کر رہی تھی۔“ شکرے نے نیکیٹ میں سے سرگھٹ نکال کر سلگاتے ہوئے کہا۔

”ضروری نہیں کہ یہی وجہ ہو۔“ بشارت نے جواب دیا۔ ”کوئی اور وجہ بھی ہو سکتی ہے۔ بہر حال تمہارے علاج کا یہ ایک سلسلہ ہو چلا تھا وہ ختم ہو گیا۔ اب کسی اور کو تلاش کرنا پڑے گا۔“

”میرے خیال میں اب مجھے کسی کے علاج کی ضرورت نہیں ہے۔“ شکرے نے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے جواب دیا۔ ”زخم سوکھ رہے ہیں صرف مرہم ہی تو لگانی ہوتی

دھوکئی کی طرح چل رہا تھا اور اس سے پہلے کہ کوئی چش رفت ہوئی، دروازے کے باہر چیل گھسٹ کر چلنے کی آواز سنائی دی۔ ان دونوں نے بیک وقت دروازے کی طرف دیکھ کر سنیا ایک جھٹکے سے سیدھی کھڑی ہو گئی۔ اس نے کرسی کی پشت پر پڑے ہوئے اپنے کپڑے اٹھائے اور دوڑ کر ہاتھ روم میں گھس گئی۔

بشارت کے منہ سے گمراہی نکل گیا اس نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ شرماتا ہوا اپنے کمرے سے نکل کر باہر نکلنے کی طرف جا رہا تھا۔ ٹانگ پر گولی لگنے کی وجہ سے وہ ہر گھمبٹ کر چل رہا تھا۔ دروازہ کھلنے کی آواز سن کر اس نے مڑ کر بشارت کی طرف دیکھ لیا۔

”جیاس لگ رہی تھی یار۔“ وہ مکرر کر بولا۔ ”میں نے سوچا تمہیں آواز دینے کے بجائے خود ہی اٹھ کر بیانی بی لوں۔“

”میں پلانا ہوں۔“ بشارت کہتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ اس نے فرخ میں سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی۔ ایک گلاس شرے کو دیا اور بوتل اپنے ہونٹوں سے لگا لی۔ ٹھنڈے پانی کے کئی ٹھونٹے حلق میں اڑنے کے بعد اس کے حواس کی قدر حال ہوئے۔ وہ شرے کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا کہ اس کے چہرے کو دیکھ کر اصل بات نہ سمجھ جائے۔

وہ دونوں ہال میں صوفے پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد سنیا بھی اُٹھی اور مسکرائی ہوئی نگاہوں سے بشارت کی طرف دیکھتے ہوئے بچن میں چلی گئی۔

اور پھر وہ چائے پی رہے تھے کہ باہر لائٹ زور زور سے دھڑ دھڑایا گیا۔ بشارت اچھل پڑا۔ ان تینوں نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ لیا۔

”میں دیکھتی ہوں۔“ سنیا کہتے ہوئے اٹھ گئی۔

بشارت بھی اٹھ کر دروازے کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے شرے کو دوپٹے پیٹنے رہنے کا اشارہ کیا تھا۔ سنیا نے پہلے برآمدے میں آکر پوچھا کہ کون ہے۔ کوئی جواب نہ پا کر وہ آگے بھگتی اور گیت کی بھری سے باہر نکلتی گئی۔ پھر اس نے ذیلی دروازہ کھول دیا اور گردن ال کر دائیں بائیں دیکھنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے گمراہی نکل گیا تھا۔ بیٹ کے دائیں طرف ایک عورت کھڑی تھی۔

میرے ذہن میں نہیں رہی تھی۔ بہر حال اس سلسلے میں ہمیں مختل رہنا پڑے گا۔“  
رات کا ایک بج گیا۔ سنیا جاہلیں لے رہی تھی۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے اپنا بیڈ بشارت والے کمرے میں ہی لگا رکھا تھا اور وہ سو رہی تھی۔ سنیا کے جانے کے بعد بھی بشارت دیر تک بیٹھا شرے سے باتیں کرتا رہا پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ سنیا سو چکی تھی۔ بشارت چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اپنے بیڈ پر لیٹ گیا۔ وہ بار بار سنیا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سنیا نے اسے بڑی کڑی آزمائش میں ڈال رکھا تھا۔ بعض اوقات تو اس کے سینے میں آگ سی بھڑک اٹھی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پا رکھا تھا۔  
☆=====☆

بشارت کو یاد نہیں وہ کب سویا تھا۔ صبح اس کی آنکھ جلدی کھل گئی۔ سنیا کا بہتر خلی تھا۔ ہاتھ روم کے شور سے پانی گرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ اٹھ کر شرے کے کمرے میں آ گیا۔ شرماتا ہوا بشارت دوبارہ اپنے کمرے میں آکر بیڈ پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

تقریباً دس منٹ بعد ہاتھ روم کا دروازہ کھلنے کی آواز سن کر اس نے نیم دا آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور اس کے ساتھ ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ سنیا نے پہلے دروازہ ڈرا سا کھول کر باہر جھانک دیا۔ بشارت کو سوتا ہوا سمجھ کر ہاتھ روم سے باہر آئی اور دیے قدموں چلتے ہوئے کمرے کا دروازہ بھیڑ دیا۔ اس نے جسم پر بڑا تھوڑا لیٹ رکھا تھا۔ اس کے بالوں سے پانی ٹپڑ رہا تھا اور بدن پر بھی پانی کے قطرے چمک رہے تھے۔

بشارت کو سینے میں سانس رہا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے دماغ کی نیس پھٹ جائیں گی اور پھر اس کے منہ سے اسی طرح سانس نکلا جیسے غبارے سے اچانک ہی ہوا نکلے ہو۔

سنیا نے چونک کر اس طرف دیکھا اور پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ بشارت پلک جھپکے بغیر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت سی بھری ہوئی تھی۔ سنیا جھوٹے جھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی بیڈ کے قریب آئی اور پھر آہستہ آہستہ بشارت پر جھپکے لگی۔

بشارت کی رگوں میں خون اچھل رہا تھا۔ تپش سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کا سانس

اس کی عمر چوبیس بجیں کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ پولہار جینٹ کی قیص کھلی شلوار اور سر پر میلی سی چادر تھی۔ پیروں میں پرانے سے سینڈل تھے۔ وہ جوان تھی، رنگ گورا تھا اور چہرے کے نقوش بھی دکھ سکتے تھے مگر لباس سے وہ گھروں میں کام کرنے والی ماسی قسم کی عورت لگتی تھی۔

”کیا بات ہے کون ہو تم.....؟“ نیتانے اسے گھورا۔

”بی بی کوئی کام دے دو۔“ اس عورت نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

”ارے نہیں ہے کوئی کام دام..... بھاگ یہاں سے۔“ نیتا جھجھلائی۔

”کچھ کچھ کیا کھانے کو ہی دے دو۔ میرے بچے بھوکے ہیں بی بی۔“

نیتانے ایک بار پھر اسے گھورا اور دھڑ سے دروازہ بند کر دیا۔ واپس مڑتے ہوئے اس کی نظر دل کئے ہوئے اخبار پر پڑ گئی۔ یہاں آنے کے دوسرے روز بشارت نے بک اسٹال والے کو کوٹھی کا پتہ بتا کر اخبار ڈالنے کو کہہ دیا تھا اور ہا کر روزانہ اخبار چھینک جاتا تھا۔ نیتانے اخبار اٹھا لیا اور اس پر سے ربر بیڈ اتارتے ہوئے اندر آ گئی۔

”کون تھا؟“ بشارت نے دروازے کی آڑ سے نکلے ہوئے پوچھا۔

”کوئی عورت تھی۔ کام مانگ رہی تھی۔“ نیتانے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”جھگیوں میں رہنے والی یہ عورت ماسی کی تلاش میں گھروں میں پھرتی رہتی ہیں۔ ان کے مرد نشہ کرنے اور جوا کھیلنے کے سوا کچھ نہیں کرتے۔ کوٹھیوں میں چوریوں اور ڈکیتوں میں بھی انہی کا ہاتھ ہوتا ہے۔“

اس نے اخبار کھول کر اپنے سامنے پھیلا لیا اور سرخوں پر نگاہ دوڑانے لگی۔ وہ خبر آخری صفحے پر تھی جس کی اسے تلاش تھی۔ نیتا ماسی ارشاد بی بی کے مکان پر پولیس کے چھاپے کی خبر پڑھتی چلی گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے کا رنگ بھی بدل گیا تھا۔ اس نے اخبار بشارت کی طرف بڑھا دیا۔ بشارت نے بھی وہ خبر پڑھی۔

پولیس بڑی سرگرمی سے اسپتال سے فرار ہونے والے زخمی قیدی اور اس کے دو ساتھیوں کو تلاش کر رہی تھی۔ پولیس کو شبہ تھا کہ اس واقعے میں اسپتال کا کوئی ملازم بھی ملوث ہو سکتا ہے کیونکہ اندرونی امداد کے بغیر یا ہر کا کوئی آدمی اس قسم کے مشن میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ تحقیقات کے دوران میں یہ انکشاف بھی ہوا تھا کہ دو سال پہلے ارشاد بی بی ماسی

ایک نرس کو اسپتال کی سرکاری دوائیں بیچنے اور غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث ہونے پر ملازمت سے نکال دیا گیا تھا اور اس کے خلاف قانونی کارروائی بھی کی گئی تھی۔ اسے تین ماہ کی سزا ہوئی تھی۔ زخمی قیدی کے فرار سے ایک روز پہلے ارشاد بی بی کو اسپتال میں دیکھا گیا تھا۔ پولیس کو یہ بھی شبہ تھا کہ اسپتال کے خلاف انتقامی کارروائی کے خیال سے ماسی ارشاد اس معاملے میں ملوث ہو سکتی ہے۔ اگر زخمی قیدی کو فرار کرانے میں اس کا ہاتھ ہوا تو وہ قیدی کو علاج کی سہولت بھی فراہم کر سکتی ہے۔

پولیس نے گزشتہ رات چھاپہ مار کر ارشاد بی بی کو حراست میں لے لیا۔ پوچھ گچھ کے دوران میں اس نے یہ سنسنی خیز انکشاف کیا کہ ایک عورت اور ایک مرد اسے آنکھوں پر پٹی باندھ کر کسی نامعلوم مکان پر لے جاتے تھے جہاں وہ تین دن تک قیدی کے زنجیروں کی ڈرنگ کرتی رہی۔

ماسی ارشاد بی بی پولیس کو ان کے بارے میں زیادہ تفصیل سے نہیں بتا سکی تھی۔ البتہ اس نے سرخ شیراز کا نمبر بتا دیا تھا جس پر اسے لے جایا جاتا تھا۔

”ماسی ارشاد بی بی کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر لائے جانے والی حکمت عملی کام آگئی۔“ بشارت نے اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اس کم بخت نے پولیس کو گاڑی کا نمبر بتا دیا ہے اور پولیس اس نمبر کے ذریعے.....“

”ہم تک نہیں پہنچ سکتی۔“ نیتانے اس کی بات کاٹ دی اور پھر اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”یہ گاڑی میں نے دو سال پہلے مغل پور میں شاہراہ لنگ روڈ سے بنیادی میں خریدی تھی۔ وہاں رہتے کو سوٹر سائیکلوں اور گاڑیوں کا بازار لگتا ہے۔ گاڑی خریدنے کے بعد اسے میں نے اپنے ہاؤس ٹرانسفر بھی نہیں کر دیا۔ دیسے میں اس گاڑی کی جو تھی خریدار ہوں۔ پولیس رجسٹریشن نمبر کے ذریعے اصل مالک تک پہنچے گی اور وہ بھی نہیں بتا سکے گا کہ یہ گاڑی اب کس کے پاس ہے۔“

”لیکن.....“ بشارت اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ گاڑی اب ہم استعمال نہیں کر سکتے۔ پولیس نے اس کی تلاش میں جگہ جگہ چیکنگ شروع کر دی ہوگی اور اگر اس کار کا نمبر اخبار میں چھپا دیا گیا تو ہمارے محلے کا کوئی آدمی پولیس کو بتا سکتا ہے کہ یہ کار ہمارے پاس ہے اور ہمارا یہ وہ دوست جھنگ۔“ بشارت نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔ ”وہ تو

وہ پولیس آفیسر تھا جو شبانہ سے دو قدم کے فاصلے پر کھڑا سے مگور رہا تھا اور شبانہ کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے جسم میں جان ہی نہ رہی ہو۔ جسم کا کوئی حصہ حرکت کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ پر بے حس و حرکت پڑی خوفزدہ سی نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

”کون ہو تم؟“ پولیس آفیسر کی کرخت آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ ”کو غشی کے اندر کیسے داخل ہو گئیں۔ کمال سے آئی ہو؟“

شبانہ کی زبان لنگ ہو رہی تھی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر ہونٹ پڑ پڑا کر رہ گئے۔ اس کا جسم جیسے سے تر ہو رہا تھا مگر مطلق خشک ہو گیا تھا۔ زبان کانٹے کی طرح سوکھ کر تالو میں چبھ رہی تھی۔

”اٹھو!“ آفیسر کی آواز دوبارہ سنائی دی تھی۔ ”میں نے پوچھا تھا کون ہو تم..... اور کو غشی کے اندر کیسے داخل ہوئی تھیں؟“

شبانہ دونوں ہاتھ زین پر ٹکا کر اٹھنے کی کوشش کرنے لگی اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ اس سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔

”مم..... میں..... وہ دیوار چھاند کر اندر آئی تھی۔“ اس نے ہکلاتے ہوئے دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ ”رات کو غنڈے میرے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ مم..... میں ان سے بچنے کے لئے یہاں چھپ گئی تھی۔ پپ..... پانی..... تو ڈوبا پانی.....“

پولیس آفیسر گمری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اب رنگتگی کے تاثرات نہیں رہے تھے۔ شبانہ کے لباس اور فعل و صورت سے اسے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ واقعی کوئی مظلوم لڑکی ہے اور اس کا تعلق کسی ایسے گھرانے سے ہے۔

”ڈرہ نہیں۔“ اس مرتبہ اس کے لمبے میں رنگتگی کے بجائے ہمدردی تھی۔ ”آؤ..... اندر آ جاؤ.....! تم شاید رات بھر یہاں پڑی رہی ہو۔“

شبانہ خوفزدہ سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اب تک جو بھی ملا تھا ہمدرد بن کر ہی ملا تھا۔ اصلیت تو بعد میں کھلتی تھی کہ ہمدردی کا نظارہ کیوں ہو تا تھا۔ اس کے سامنے کھڑا ہوا یہ پولیس آفیسر بھی اس سے ہمدردی کا نظارہ کر رہا تھا۔

یقیناً جانتی ہوگی یہ تمہاری گاڑی ہے۔“  
”تو پھر ہمیں یہ دعا کرنی چاہئے کہ پولیس اخبارات کو اس کار کا نمبر جاری نہ کرے۔“  
شکر نے پہلی مرتبہ ان کی گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

”ہاں..... اب یہی دعا مانگی جا سکتی ہے۔“ بشارت کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔  
اس کو غشی کی حد وہ دوس رہے ہوئے ان کے لئے کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن ظاہر ہے وہ گھر میں قید ہو کر بھی نہیں رہ سکتے تھے۔

اس شام سنیٹا اور بشارت کو غشی کی پھت پر آگئے۔ دھڑا دھڑ دیکھتے ہوئے بشارت کی نظریں تقریباً پچاس گز دور ایک غلط پلاٹ پر پنی ہوئی جگیوں کی طرف اٹھ گئیں۔ چار پانچ جگہاں تھیں۔ جب وہ لوگ اس کو غشی میں آئے تھے تو یہ جگہاں نہیں تھیں۔ یہ ذیر غائبانہ کل ہی کسی وقت بنا تھا۔

”صبح وہ عورت کام کی تلاش میں آئی تھی۔“ سنیٹا نے جگیوں کے سامنے کالی شلوار والی ایک عورت کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ لوگ ایسے ہیں۔“ بشارت نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”جہاں چاہا گھر بسایا اور جب چاہا مسلمان کندھوں پر لاد کر چل دیئے۔“

وہ کچھ دیر تک پھت پر کھلی ہوا میں کھڑے رہے پھر بیچے آگئے۔  
اس رات بشارت کو نیند نہیں آ سکی تھی۔ وہ بار بار سنیٹا کی طرف دیکھتا جو گہری نیند سو

رہی تھی۔ بشارت کی آنکھوں میں مچھلی سی بھر مچی تھیں لیکن نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ اپنا تجربہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کیا بنا چاہتا تھا کیا بن گیا۔ اس گندگی کی دلدل میں گردن تک دھنسا گیا تھا اور اب اسے وہاں کا راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

بات کئی سال پہلے طے میں منجر کے انوار سے شروع ہوئی تھی۔ جیل سے رہائی پانے کے بعد پہلے وہ جیب کھڑا بنا اور اب قاتل بن گیا تھا۔ اس دوران میں وہ ایک لمبے کو بھی منجر کو نہیں بھولا تھا۔ وہ اسے مسلسل تلاش کرتا رہا لیکن اس کا سراغ نہیں مل سکا تھا۔

بشارت کا دماغ سلگ رہا تھا۔ وہ اٹھ کر باہر آ گیا اور برآمدے کے سامنے صحن میں کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔ رات گزرتی رہی اور وہ کرسی پر بیٹھا تاریک آسمان کو گھور رہا۔



”ڈرو نہیں۔“ پولیس آفیسر نے اس کے چرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔  
”میں اس میں اکیلا نہیں ہوں۔ میری ماں ہے۔ سن بھی ہے۔ تمہیں خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اندر چل کر آرام سے بیٹھو اور مجھے بتاؤ تم کون ہو اور وہ غنڈے کون تھے۔ شام سے پہلے پہلے انہیں سلاخوں کے پیچھے پھانسا دو گے۔“  
شبانہ کچھ کتنا ہاتھ تھی کہ کوئی کے برآمدے کی طرف سے ایک نسوانی آواز سن کر وہ چونک گئی۔

”تم ابھی تک دفن نہیں گئے اشرف..... اور یہ کون ہے؟“  
اس پولیس آفیسر کے ساتھ ہی شبانہ نے بھی مڑ کر اس طرف دیکھا۔ برآمدے میں ایک بوڑھی عورت کھڑی تھی۔ اس کے بال سفید اور عمر چھپتے کے لگ بھگ رہی ہوئی۔ جسم فربہ اور چہرے پر سرفر تھی۔  
”یہ میری والدہ ہیں۔ آؤ..... ڈرو نہیں۔“ پولیس آفیسر نے شبانہ کی طرف دیکھتے ہوئے پھر کہا۔

شبانہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے اس کے ساتھ برآمدے کی طرف چل پڑی۔  
اس کی ہانگوں میں اب بھی ہلکی سی پکیا ہٹ تھی۔

”کون ہے یہ لڑکی؟“ برآمدے میں کھڑی ہوئی عورت نے آفیسر سے پوچھا۔  
”پتہ نہیں ماں بی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”وہاں گھاس پر سو رہی تھی۔ رات کو شاید غنڈے اس کے پیچھے لگ گئے تھے اور یہ ان سے بچنے کے لئے دیوار پھاند کر کوئی میں کھس آئی تھی۔“

اس بوڑھی عورت نے گہری نظروں سے شبانہ کی طرف دیکھا اور پھر اسے اندر لے آئی۔ اسی وقت ایک جوان لڑکی بھی کمرے سے نکل کر وہاں آگئی۔ پولیس آفیسر اشرف نے اسے اشارہ کیا اور وہ پانی کا گلاس لے آئی۔

شبانہ نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا اور خوفزدہ سی نظروں سے باری باری ان کی طرف دیکھنے لگی۔

”گھبراؤ نہیں بنیں۔“ بوڑھی عورت نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اب تم محفوظ جگہ پر ہو۔ میرا بیٹا اسے اس بی بی ہے۔ اسے بتاؤ وہ غنڈے کون تھے۔“

شبانہ نے اشرف کی طرف دیکھا۔ اس کی عمر تیس بیس کے لگ بھگ رہی ہوئی۔ دروازہ کھلتا، صحت مند جسم سرخ و سفید رنگت، پولیس کی وردی بھی اس کے جسم پر خوب بیچ رہی تھی۔

شبانہ نے شاید زندگی میں پہلی بار کسی کے گھر آکر سکون محسوس کیا تھا۔ وہ فربہ اندام عورت بڑی پروقاہ اور بردبار نظر آ رہی تھی۔ اس کی بیٹی شبانہ کی ہم عمر تھی۔ اس کے چہرے سے بھی شجیدگی نکل رہی تھی اور وہ پولیس آفیسر..... یوں تو قدم قدم پر شبانہ کے ساتھ دھوکا ہوا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بچانے کے لئے بھائی رہی تھی لیکن نہ جانے اسے یہ یقین کیوں ہو گیا تھا کہ میں اس کے ساتھ کوئی دھوکا نہیں ہو گا۔ وہ واقعی صحیح باتوں میں پہنچ چکی تھی۔

”کیا نام ہے بیٹی..... کہیں رشتی ہو تم؟“ اس بردبار خاتون نے ایک بار پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میرا کوئی ٹھکانہ نہیں ملے بی بی۔“ شبانہ کا لہجہ رو دینے والا تھا۔ ”اور نام کیا بتاؤں آپ کو..... شبانہ، تمہیں ’رمدانہ‘ سمجھتے یا کوئی اور؟ جس نام سے آپ چاہیں مجھے پکار لیں۔“  
”کیا مطلب.....؟ میں سمجھی نہیں بیٹی۔“ خاتون نے عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

اے ایس بی اشرف بھی چونک گیا۔ وہ ابھی تک کھڑا تھا۔ شبانہ کی یہ بات سن کر وہ اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا اور گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”اپنا اصلی نام بتاؤ۔“ وہ خندے کون تھے جو تمہارا چچا کر رہے تھے؟“

”تم کہ جاؤ بیٹہ۔“ بڑی بی بی نے کہا۔ ”میں اس سے پوچھتی ہوں، ذرا حواس پر تو قابو پائے۔ وہ ڈری ہوئی ہے۔“ وہ قریب کھڑی ہوئی اپنی بیٹی کی طرف گھوم گئی۔ ”سہلی بیٹی۔ اسے ہاتھ روم لے جاؤ۔ منہ ہاتھ دھو کر اپنا طیلہ درست کر لے۔ اسے کچھ کھلاؤ پلاؤ۔ حواس بحال ہوں تو کچھ بتائے گی۔“

سہلی، شبانہ کو اپنے کمرے میں لے گئی اور غسل خانے کا دروازہ کھلایا۔ آدھے گھنٹے بعد شبانہ اس کمرے سے نکلی تو وہ بڑی حد تک اپنے قلاب میں تھی۔ ابے ایس بی اشرف اس وقت فون پر بات کر رہا تھا۔

”میں ذرا دیر سے آؤں گا۔“ وہ فون پر کہہ رہا تھا۔ ”ہاں۔ گھر پر ہی ہوں۔ کوئی خاص

بات ہو تو مجھے فون کر دیتا۔" اس نے فون بند کر دیا اور شبانہ کی طرف دیکھنے لگا جو مایوسی کے قریب صوفے پر بیٹھ چکی تھی۔

اس وقت نوکر نے شبانہ کے سامنے سینئر ٹیبل پر ناشتہ لگا دیا۔

"ناشتہ کر لو بیٹی۔ آرام سے بیٹھو۔ بعد میں تم سے بات کریں گے۔" ملاجی نے کہا۔ شبانہ نے رات کو بھی کھانا نہیں کھایا تھا اور اس وقت اس کے پیٹ میں اینٹھن سی ہو رہی تھی۔ وہ سر جھکا کر خاموشی سے ناشتہ کرنے لگی۔ اشرف اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

شبانہ جھپکتے ہوئے انداز میں آہستہ آہستہ ناشتہ کرتی رہی۔ ناشتے کے بعد ملاجی نے اس کے لئے اور اپنے لئے بھی چائے منگوایا۔

"ہاں بیٹی۔ اب بتاؤ تم کون ہو۔ کہاں سے آئی ہو؟" ملاجی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور یہ تم نے کیا کہا تھا کہ تمہارا کوئی نام نہیں اور کوئی ٹھکانہ نہیں ہے؟"

"میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے ملاجی۔" شبانہ نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں افسردگی سی تھی۔ اس دوران میں اسے ایس بی اشرف بھی اپنے کمرے سے نکل کر ایک صوفے پر بیٹھ چکا تھا۔ "میں نے اتنے ٹھکانے بدلے ہیں ہر جگہ مجھے ایک نیا نام دیا گیا۔ میں تو اپنے آپ کو بھی پہچانتی جا رہی ہوں۔"

"موصول رکھو بیٹی۔" ملاجی نے اسے دلا دیا۔ "شروع سے بتاؤ۔ تم کون ہو کہاں کی رہنے والی ہو۔ تمہارا اصل نام کیا ہے اور تمہارے ماں باپ کہاں ہیں کوئی بہن بھائی؟"

"میرا نام نجمہ ہے۔ ماں باپ بچپن ہی میں انتقال کر گئے تھے۔ ایک بھائی ہے مجھ سے تقریباً بیڑھ سال چھوٹا، لیکن وہ کہاں اور کس حال میں ہے، مجھے نہیں معلوم۔ آخری مرتبہ وہ پہلے میں میرے ساتھ تھا۔ جب مجھے خدے اٹھا کر لے گئے تھے اور وہ مجھے چھڑانے کے لئے پیچھے دوڑا تھا لیکن اسے کچھ لوگوں نے پکڑ لیا تھا اس کے بعد میں نے اسے نہیں دیکھا۔ یہ کئی سال پہلے کی بات ہے۔" وہ کچھ دیر خاموش ہو گئی اور پھر اپنی کہانی سنانے لگی۔ آخر میں وہ کہہ رہی تھی۔ "میں چار سال سیکیورٹ میں ایک زمیندار کے گھر میں رہی اور پھر ایک روز گھر کی ایک ملازمہ نے مجھے بتایا کہ یہ لوگ مجھے بیچنے کا پروگرام بنا رہے ہیں چند روز بعد مجھے سرحد پار بیچ دیا جائے گا۔ اسی روز ملازمہ نے مجھے ایک رشتے دار کے ساتھ زمیندار

کے گھر سے بھاگا جو مجھے فیصل آباد لے گیا لیکن چند روز بعد ہی مجھے پتہ چل گیا کہ ان لوگوں کی بھی نیت ٹھیک نہیں تھی۔ میں ایک رات ان کے گھر سے بھاگ نکلی۔ پولیس نے مجھے پکڑ کر ایک رہنما ادارے میں بھیج دیا جہاں میری طرح اور بھی بہت سی بے سارا بچیاں اور بچے موجود تھے۔

"میں نے ادارے کے منتظم کو اپنے بھائی کے ہاڑے میں اور اپنے گھر کا پتہ بتایا اور بار بار ان سے درخواست کرتی رہی کہ یا تو میرے بھائی کو اطلاع دے دی جائے یا مجھے میرے گھر پہنچا دیا جائے لیکن مجھے تسلی دلائے دے کر ڈھٹایا جاتا رہا۔

"پانچ سال گزر گئے میں اپنے گھر جانے کے لئے اور اپنے بھائی سے ملنے کے لئے ترقی رہی لیکن وہ لوگ بڑے بے رحم ثابت ہوئے۔ نہ تو انہوں نے میرے بھائی کے ہاڑے میں کچھ بتایا اور نہ ہی مجھے میرے گھر بھیجا۔

"میں جوان ہو چکی تھی۔ میں نے عموں کو کیا کہ ان لوگوں کی نظرس مجھے ناپتی رہتی تھیں اور پھر ایک روز مجھے ایک بوڑھے کے ساتھ بھیج دیا گیا۔

"اس کی عمر ساٹھ سال کے لگ بھگ تھی۔ پگلیں تک سفید ہو چکی تھیں۔ مجھے بتایا گیا کہ اس بوڑھے کی کوئی اولاد نہیں، اس کے پاس دولت کی کمی نہیں لیکن اس کا کوئی قریبی رشتہ دار نہیں۔ اسے ایک سہارے کی ضرورت ہے جو اس بوجھالے میں اس کا خیال رکھے۔ وہ مجھے بنی بنا کر رکھے گا۔

"لیکن اسی رات یہ خوفناک انکشاف ہوا کہ وہ بوڑھا مجھے بنی نہیں کچھ اور بنانے کے لئے لایا تھا۔ وہ قبریں بھر نکالے بیٹھا تھا مگر اس کی ہوس کم نہیں ہوئی تھی۔ اس رات اس نے مجھ پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تو میں نے اس کی ٹانگ توڑ دی۔

"اس بوڑھے کے ساتھ شاید پہلی مرتبہ ایسا سلوک ہوا تھا۔ پہلے تو وہ چپٹا جاتا رہا پھر معلق ہاتھ لگا کر آئندہ مجھے بری نظرس نہیں دیکھے گا۔ اس نے یہ انکشاف بھی کیا کہ وہ مجھے اس رہنما ادارے سے دولاکھ روپے میں خرید کر لایا تھا۔ مجھ سے پہلے بھی ایک لڑکی کو وہاں سے لایا تھا جس نے ایک پتے بعد ہی خود کشی کر لی تھی۔

"میں نے اس بوڑھے کی ٹانگ توڑی تھی۔ پھر اس کی خدمت بھی خوب کی۔ تین مہینے پہلے رہی اور پھر ایک روز میں لاہور آئی۔ کئی سات بیت گئے تھے کہ پتہ بدل چکا تھا۔

ہمارے اس گھر کا نقشہ بھی بدلا ہوا تھا جہاں میں نے جنم لیا تھا اور جہاں میں نے اپنے باپ کو افلاس کی حالت میں دوڑتے ہوئے دیکھا تھا لیکن یہ جان کر میرے دل پر گھونسا سا لگا کہ اب وہ ہمارا گھر نہیں رہا تھا۔

”اس مکان میں رہنے والوں نے بتایا کہ کئی سال پہلے میرا بھائی بشارت بھی وہاں آیا تھا۔ انہوں نے ہی مجھے بتایا کہ وہ سزا بھگت کر جیل سے نکلا تھا۔ میرا دل حک سے رہ گیا لیکن مجھے یہ جان کر تسلی ہوئی کہ میرا بھائی زندہ ہے۔ ملک صاحب کے گھر آگئی جہاں میں بچپن میں کام کیا کرتی تھی۔

”مکلفی نے مجھے پہچان لیا۔ اس نے میری داستان بھی بڑی ہمدردی سے سنی لیکن اس نے مجھے اپنے گھر میں رکھنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بیٹے جوان ہو چکے تھے اور وہ کسی غیر لڑکی کو گھر میں نہیں رکھنا چاہتی تھی۔

”میں اپنے بھائی کو تلاش کرتی رہی۔ چودری عمر کے پاس بھی گئی جس نے ہمارا مکان بچا تھا۔ اس نے بتایا کہ بشارت کئی سال پہلے اس کے پاس آیا تھا اور دھمکی دے کر چلا گیا تھا۔ مجھے چودری عمری نے بتایا کہ بشارت بھرنہ زندگی اختیار کر چکا ہے۔

”میرے پاس آکر چہچہا کرے تھے میرے گھر میں کسی ہوٹل میں جانے کا خضرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ میں نے وہ رات سیدھا ہسپتال کے لائن میں گزار دی تھی جہاں اور بھی بہت سے لوگ موجود تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کا کوئی نہ کوئی مریض اسپتال میں داخل تھا۔

”دن چڑھے میں نے ایک بار بھر بشارت کی تلاش شروع کر دی لیکن مجھے اس کا کوئی سراغ نہیں ملا البتہ میں کچھ ایسے لوگوں کے ہاتھ لگ گئی جنہوں نے مجھے مسلم ٹائون کے ایک دفقی ادارے میں بچا دیا۔

”دارالان میں میرے چھٹی اور بھی بے سارا لڑکیاں موجود تھیں۔ انہیں وہاں کام بھی سکھائے جاتے تھے۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ دفقی ادارہ حافظ عبدالرشید کی گھرائی میں چل رہا تھا جس کے تمام اخراجات حافظ عبدالرشید برداشت کرتا ہے۔ میں دو تین ہفتے اس ادارے میں رہی اور پھر ایک روز حافظ عبدالرشید وہاں آیا اور وہ مجھے آہنی کوٹھی میں لے آیا۔

”میں تین سال اس کوٹھی میں رہی۔ حافظ عبدالرشید مجھے بھی کما کرتا تھا۔ وہ واقعی بہت نیک اور بہت شریف آدمی ثابت ہوا لیکن گزشتہ رات اس کی نیکی اور شرافت کا پول

کھل گیا۔ ”نجمہ خاموش ہو گئی۔

”میں جی، سہلی اور اسے ایسی الٹا شرف خاموش بیٹھے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ نجمہ کئی منٹ خاموش رہی تو اشرف نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کلمہ ”کیا ہوا.....“ گزشتہ رات کیا ہوا تھا؟“

”حافظ عبدالرشید نے میرا سودا کر دیا۔ ایک عرب شیخ کے ہاتھ اپنی منہ بولی بیوی کو بیس لاکھ میں بیچ دیا۔ ”نجمہ نے نرمی سے ہونٹیں آواز میں جواب دیا۔

”کیا.....؟“ وہ تینوں اچھل پڑے۔ ”یہ تم کیا کہہ رہی ہو بیٹی۔“ میں جی نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کلمہ ”حافظ عبدالرشید تو بہت نیک اور پرہیزگار آدمی ہے۔

نیکی اور بھلائی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے۔ ہر شخص اس کی تعریف کرتا ہے۔“

”تین سال تک میں بھی یہی سمجھتی رہی تھی۔“ نجمہ نے جواب دیا۔ ”گزشتہ رات اگر سب کچھ اپنے کانوں سے نہ سنا ہوتا تو مجھے بھی یقین نہ آتا کہ حافظ نے عرب شیخ سے میری قیمت

بھی بیس لاکھ روپے وصول کر لی ہے۔ میں رات بھر کانٹوں پر لوٹی رہی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مکمل جاؤں کس پر اعتماد کروں۔ ہر طرف تو غواہ بھیڑے کھلت لگائے بیٹھے ہیں۔

انسان انسان نہیں رہا شیطان بن گیا ہے۔ کاش! میرا بھائی مل جاتا۔“ وہ سسکیں بھرے لگی۔

”گھبراؤ نہیں بیٹی۔ حوصلہ رکھو۔“ میں جی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ ”اب تم محفوظ جگہ پر ہو۔ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ تمہارا بھائی بھی انشاء اللہ ضرور مل جائے گا اور حافظ عبدالرشید جیسے لوگوں کو بھی سزا ضرور ملے گی۔ مگر تم

میں تک کیسے پہنچیں گیں؟“

نجمہ اس کے سینے سے لگی بھوت بھوت کر روتی رہی۔ رونے سے اس کے دل کا بوجھ کسی قدر ہلکا ہو گیا تھا۔

”میں نے غلط کیا تھا کہ غصے میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔“ نجمہ نے بھکی بھرتے ہوئے جواب دیا۔ ”رات تین بجے میں حافظ عبدالرشید کے گھر سے نکل کر چھٹی چھپائی اس

طرف آگئی اور پھر چوکدار کو کچھ کہ کر اس کی نظروں سے بچنے کے لئے میں اس کو ٹھکی کی دیوار چھانڈ کر اندر آگئی۔ میں دوڑتے دوڑتے بری طرح تھک چکی تھی۔ میری ٹانگیں شل ہو گئی

تھیں۔ نرم گھاس پر لیٹی تو آنکھیں بند ہونے لگیں اور پھر یہ نہیں کب نہیں وہیں پڑے پڑے سو گئی۔

”اللہ جو کرتا ہے بہتری کرتا ہے۔“ مل جی نے کہا۔ ”اب تم بالکل پریشان مت ہو۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“

اسے اپنی نانی اشرف پوری توجہ سے غم کے باتیں سنتے ہوئے بڑی گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے خیال میں غم نے جو کچھ بھی کیا تھا اور میں جھوٹ اور بھانسنے کا ایک لہجہ بھی شامل نہیں تھا اور پھر وہ غم کو لے کر الگ بیٹھ گیا اور تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک اس سے سوال جواب کرتا رہا۔

”ٹھیک ہے۔“ آخر کار اس نے کہا۔ ”تم اطمینان سے رہنا رہو۔ تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔ میں حافظ عبدالرشید کا بھی بندہ نہت کر تا ہوں اور تمہارے بھائی کو بھی تلاش کروں گا۔ کیا نام بتایا تھا تم نے..... بشارت..... یہ نام مجھے کچھ سننا ہوا لگتا ہے۔“

”اس کا نام بشارت علی ہے۔ مجھے چودہ پوری عمر نے بتایا تھا کہ بشارت جب اس کے پاس مکان کا صاحب لینے آیا تھا تو اس نے اپنا نام بشارت بتایا تھا۔“

”ٹھیک ہے۔ میں تلاش کروں گا۔“ اشرف نے کہا۔ اس نے اپنی ماں اور بہن سے علیحدگی میں کچھ باتیں کیں اور دفتر کے لئے روانہ ہو گیا۔ وہ حافظ عبدالرشید کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس جیسے آدمی پر ہاتھ ڈالنا اتنا آسان نہیں ہو گا۔

مل جی غم کو تسلی دلا سے دیتی رہیں اور پھر سلی غم کو اپنے کمرے میں لے گئی۔ وہ دونوں ہم عمر تھیں جلدی ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گئیں۔ سلی اسے اپنے اور اپنے گھر والوں کے بارے میں بتاتی رہی۔

چھ بجے کے قریب اشرف کا فون آیا۔ کل سلی ہی نے ریسو کی تھی۔ اس نے بتایا کہ مصروفیت کی وجہ سے وہ رات کو دیر سے گھر آئے گا۔ پولیس کی ڈیوٹی ایسی ہی تھی کبھی تو وہ شام پانچ بجے گھر جاتا اور کبھی اسے رات گھر سے باہر گزرتی پڑتی تھی۔

اس روز اس کی واپسی رات گیارہ بجے کے قریب ہوئی تھی۔ سب لوگ نو بجے ہی کھانا کھا چکے تھے۔ اشرف کپڑے بدل کر کھانے کی میز پر بیٹھا تو سلی اور مل جی بھی اس کے پاس

بیٹھ گئیں۔ غم کمرے ہی میں تھی۔

”کچھ معلوم کیا بیٹا؟“ مل جی نے پوچھا۔

”آج اسی سلسلے میں مصروف رہا ہوں مل جی۔“ اشرف نے جواب دیا۔ ”حافظ عبدالرشید کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ ایسے لوگوں پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں ہو گا۔ میں نے بہر حال اپنے افسران کو قائل کر لیا ہے۔ کل سے حافظ عبدالرشید کے خلاف خفیہ انکوائری شروع ہو جائے گی لیکن صرف غم کا بیان ہی کافی نہیں ہو گا۔ اس کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کے لئے مزید محسوس ثبوت درکار ہوں گے۔ یہ کیس مجھے ہی دے دیا گیا ہے۔ میں نے اپنے چند اعتماد کے آدمی تحقیقات پر لگا دیے ہیں۔ اس کے دارالامان کے بارے میں بھی تحقیقات کی جارہی ہیں اور یہ بھی معلوم کیا جائے گا کہ حافظ عبدالرشید کے ذرائع آمدنی کیا ہیں اور اس کے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی ہے۔ انشاء اللہ چند روز بعد کوئی نمایاں صورت حال سامنے آئے گی۔“

”اور غم کے بھائی کے بارے میں کچھ معلوم ہوا؟“ مل جی نے پوچھا۔

”مل جی مل جی۔“ اشرف نے جواب دیا۔ ”اس سلسلے میں بھی کچھ پیش رفت ہوئی ہے۔ میں نے شہر کے تمام قہانوں سے معلومات حاصل کی ہیں۔ بشارت نام کا ایک جیب تراز نشتر روڈ قہانے کی حدود میں سرگرم تھا لیکن چند روز پہلے وہ چانگلی لاپتہ ہو گیا۔“

”کہاں لاپتہ ہو گیا؟“ مل جی نے اسے گھورا۔

”دراصل چند ہفتے پہلے رنگ محل کے علاقے میں رہتی کی ایک واردات ہوئی تھی جس میں ایک ملدار شخص کے دو آدمی مارے گئے تھے۔ ایک رجزن شدید زخمی ہوا تھا اور دوسرا فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ زخمی رجزن اسپتال میں نمے بے ہوش کی حالت میں بشارت کا نام پکارا رہا۔ اس وقت وہاں پر موجود ایک ایسے آئی نے یہ سمجھا کہ بشارت اس زخمی رجزن کا وہ ساتھ ہو گا جو فرار ہو گیا تھا۔ زخمی رجزن کا تعلق نسبت مروڑ کے ایک بدنام اڈے سے تھا۔ اسے اسے ایسے آئی کو یقین تھا کہ بشارت اس اڈے پر چھپا ہو گا۔ اس نے افسران کو اطلاع دینے بغیر چند کاشیوں کے ساتھ اس اڈے پر چھاپہ مار دیا۔ بشارت وہاں موجود تھا۔ وہ تو فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا مگر اسے ایسے آئی کے ہاتھوں ایک بندہ مارا گیا۔ غیر قانونی چھاپہ مارنے کے جرم میں اسے ایسے آئی کو حراست میں لے لیا گیا ہے۔ وہ اس وقت

جو بیٹل جیل میں ہے۔ کل میں اس سے بھی ملاقات کروں گا اور بشارت کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا جو اسی روز سے لاپتہ ہے لیکن اس دوران میں ایک اور واقعہ بھی رونما ہو چکا ہے۔ ”وہ چند گھنٹوں کو خاموش ہوا چہرے پر بشارت جاری رکھتے ہوئے کئے لگے ”چند روز پہلے شکرانہ نامی زخمی راجن کو اسپتال سے فرار کرایا گیا ہے۔ اس کارروائی میں ایک عورت اور ایک مرد نے حصہ لیا تھا جو نقلی نرس اور ڈاکٹرین کراہتے گئے تھے۔ ان کے ہاتھوں ڈیوٹی پر موجود ایک پولیس والا بھی مارا گیا تھا۔ اس کیس کے تفتیشی افسر کا کہنا ہے کہ شکرے کا ساسی بشارت ہو سکتا ہے جس نے کسی عورت کے ساتھ مل کر یہ کارروائی کی تھی اور دو تین روز پہلے اچھو پولیس نے اسپتال کی ایک سابق نرس کو بھی شک کی بنا پر حراست میں لیا تھا جس نے یہ اعتراف کیا ہے کہ وہ تین دن تک اس زخمی قیدی کی مرہم پٹی کرتی رہی ہے جسے اسپتال سے فرار کرایا گیا تھا اسے ایک عورت اور ایک مرد آٹھوں پر پٹی باندھ کر لے جاتے تھے۔ اس نے ان دونوں کا جو طبعہ بتایا ہے وہ وہی ہے جو اسپتال میں اس رات ڈیوٹی پر موجود منتہیوں نے بتایا تھا۔ پولیس سرہال انہیں تلاش کر رہی ہے۔ ایک سراغ بھی ملا ہے لیکن ابھی تک کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی۔“

ملائی اور ملٹی خاموشی سے اشرف کی طرف دیکھتی رہیں، اس نے جو صورت حال بتائی تھی وہ بڑی خوفناک تھی۔ اگر ان وارداتوں میں ملوث وہ بشارت ہی تھا تو اس کی کوئی مدد نہیں کی جاسکتی تھی۔ مسئلہ تین آدمیوں کے قتل کا تھا۔

”ملائی۔“ اشرف نے کلمہ ”آپ اس لڑکی کو ابھی کچھ مت بتائیے۔ پوچھتے تو یہی کہتے کہ اس کے بھائی کو تلاش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔“

”ہاں بیٹا۔۔۔۔۔۔ ابھی تو اسے جھوٹی تسلیں ہی دینی پڑیں گی۔“ ملائی نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”بڑا ظلم ہوا ہے اس کے ساتھ۔ وہ بے چاری اپنے بھائی کے لئے قربان رہی ہے۔ اسے جب پتہ چلے گا تو وہ شاید۔۔۔۔۔۔“

”ابھی تو محض شبہ ہے کہ وہ گھص ہو سکتا ہے۔“ اشرف نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”ہو سکتا ہے وہ کوئی اور ہو اور بشارت محض خوف کی وجہ سے روپوش ہو گیا ہو۔ سرہال اس کی تلاش کے لئے میری کوشش جاری رہے گی۔ آپ فی الحال خاموش ہی رہئے۔“

اشرف کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور وہ جیسے ہی کرسی ٹھیک کر مڑا اپنی جگہ پر کھڑا

رہ گیا اس کی نظریں نجمہ کے چہرے پر جم گئیں جو کمرے کے دروازے کی چوکت سے گلی کھڑی دیران سی نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

☆=====☆

پولیس بڑی سرگرمی دکھا رہی تھی۔ اخبارات میں روزانہ شکرے کے فرار کے حوالے سے کوئی نہ کوئی خبر شائع ہو رہی تھی اور ان خبروں میں بشارت کا نام ابھی تک نہیں آیا تھا۔ جس سے بشارت اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ پولیس کو بشارت پر کوئی شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔ جب پولیس نے ماسی راشن بی بی سے پوچھ گچھ کی تھی تو اس نے نہ صرف گاڑی کے بارے میں بتا دیا تھا بلکہ اس عورت اور آدمی کا طبعہ بھی بتا دیا تھا جو اسے اپنے ساتھ لے جایا کرتے تھے۔ بشارت کا طبعہ بہت واضح تھا۔ اسے شناخت کیا جاسکتا تھا جبکہ سینکڑوں شناخت کرنا مشکل ہوتا۔

بشارت کی روز تک گھر سے باہر نہیں نکلا تھا لیکن ظاہر ہے وہ قید ہو کر بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے اپنے محلے میں تو موزی سی تبدیلی کر لی تھی۔ بال بڑھائے اور داڑھی صاف کروا دی۔ آنکھوں میں ٹینس گے رہنے دیئے۔ آنکھوں کی رنگت ہی اسے اصل بشارت سے ذرا مختلف کئے ہوئے تھی۔

پولیس کے پاس ابھی تک ایسا کوئی ثبوت نہیں تھا کہ رنگ محل والی واردات میں بشارت بھی ملوث تھا۔ وہاں جو کچھ بھی ہوا تھا دو تین ماہ کے اندر اندر ہوا تھا۔ خوف و ہراس کی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ پہلی گولی چلتے ہی لوگ ادھر ادھر بھاگ گئے تھے کسی نے توجہ نہیں دی تھی کہ رقم والا ایک لے کر بھاگے والا کو ان کا قتل چوہدری عمر کا میمنز شہاب الدین بھی وہاں موجود تھا۔ وہ ڈر کے مارے ایک گاڑی کے پیچھے چھپ گیا تھا اس نے بھی حملہ آوروں کو دیکھا ہو گا لیکن وہ بشارت کو پہچان نہیں سکا تھا لہذا کچھ عرصے پہلے بشارت جب اپنے مکان کا صاب لینے چوہدری عمر کے دفتر میں گیا تو شہاب الدین بھی وہاں موجود تھا۔

دراصل وہ سب کچھ انا آنا فانا ہو گیا تھا کہ کوئی اس کے چہرے پر توجہ نہیں دے سکا تھا۔ دگوں نے لاشیں گرے ہوئے اور ایک حملہ آور کو بھاگتے ہوئے دیکھا تھا کسی نے یہ دیکھنے کی ذمہ دہ نہیں لی ہو گی کہ فرار ہونے والا کو ان کا قتل۔

اسپتال میں جب شکرے نے نیم بے ہوشی میں بشارت کا نام بگڑا تھا تو ایک پولیس آفیسر

کوشہ ہوا تھا کہ فرار ہونے والا بشارت نام کا وہ شخص شرے کا ساتھی ہو سکتا ہے۔ اس نے افسران کو اطلاع دیے بغیر نسبت روڈ والے ڈیرے پر چھاپا مار دیا جس کے نتیجے میں جانو چاچا اس کے ہاتھوں مارا گیا اور وہ جو نیز پولیس آفیسر خود مصیبت میں پھنس گیا۔ صرف اس نے ایک لمحے کو تاراج کی روشنی میں بشارت کا چہرہ دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ بشارت کون ہے اور وہ جو نیز پولیس آفیسر خود حراست میں تھا۔

بشارت کے خیال میں اگر ملتے میلتے ہی تھوڑی سی تبدیلی کر کے گھر سے باہر نکلا جائے تو اسے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا تھا اور اس لئے اس نے سر کے بال بڑھا کر داڑھی منڈوا لی تھی۔ اس روز وہ اکیلا ہی گھر سے باہر نکلا تھا۔ شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ گھر سے کچھ فاصلے پر سڑک پر واقع کانٹوں کے سامنے وہ رک گیا۔ وہ چند روز سے یہاں نہیں آیا تھا لیکن اس سے پہلے کوئی نہ کوئی سودا لینے کے لئے یہاں آتا تھا۔ اس نے کونے والے کیمپن سے گولڈ لیف کا ایک پیکنٹ خریدا اور وہاں سے ہٹ کر سڑک پر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ وہ شرے کے لئے روزانہ یہاں سے گھر تک خریدا کرتا تھا اور کیمپن والے سے کچھ گپ شپ بھی ہو جاتی تھی لیکن آج کیمپن والے نے بالکل اجنبیت کا اظہار کیا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ اسے بغیر داڑھی کے نہیں پہچان سکا تھا۔

اس سڑک پر پرائیویٹ گاڑیوں کی آمدورفت تو رہتی تھی لیکن رکشہ ٹیکسٹر آمدورفت کم تھی۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد اسے ایک رکشہ مل سکا تھا۔ جب وہ لکشی چوک پر پہنچا تو آج بچے کچے تھے۔ بڑی گھاس گھسی تھی۔ بشارت نے کنٹرولر ٹیبلٹ میں بیٹھ کر چائے پی اور پھر میٹروں کے سامنے کھڑا ہوا۔ دیر تک ادھر ادھر دیکھا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ اسے اپنے گھر کا کوئی نہ کوئی کار ضرور مل جائے گا۔ یہ باتوں باتوں علاقہ تھا۔ لکشی چوک کے ساتھ ہی ایبٹ روڈ تھا جس کی سینا گھر تھے۔ جیب تراش لڑکے اس علاقے میں شکار کی تلاش میں گھومتے رہتے تھے۔

بشارت آدھے گھنٹے تک کھڑا ادھر ادھر دیکھتا رہا لیکن اسے کوئی شکار چہرہ نظر نہیں آیا۔ وہ چوک پار کر کے نسبت روڈ پر آیا اور ٹھنڈے والے انداز میں آگے چلا رہا۔ ڈیرے والی گلی کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے گردن گھما کر دیکھ لیا۔ ڈیرے میں روشنی نظر آ رہی تھی۔ وہ آگے نکلا چلا گیا۔ تقریباً سو گز کا فاصلہ طے کر کے وہ واپس مڑا اور پھر

مختلط انداز میں ادھر ادھر دیکھتا ہوا گلی میں داخل ہو گیا۔

گیت میں داخل ہو کر وہ ایک لمحے کو رکھ سامنے لکڑی کے کھمبے پر بلب جل رہا تھا۔ طویلے کا منظر وہی تھا جو وہ عرصے سے دیکھتا رہا تھا۔ وہ ڈرا آگے بڑھا تو ایک طرف ایک گھوڑا بھی بندھا ہوا نظر آیا جو اسے دیکھ کر ہنسنے ہوئے اٹھا ایک پر زنبیں پر مارنے لگا۔ بشارت ایک لمحے کو کاوڑ پر آگے بڑھ کر اس طرف مڑ گیا لیکن وہ کمرہ تھا۔

کمرے میں جی جی مل رہی تھی اور دروازہ کھلا ہوا تھا۔ بشارت دبے قدموں چلا ہوا دروازے کے قریب آؤشیں کھڑا ہو گیا اور اندر سے باتوں کی آواز سننے کی کوشش کرنے لگا۔ اندر شاید دو آدمی تھے۔ ان میں سے ایک کی آواز سے کچھ جانی پہچانی سی گئی۔ وہ قدم بڑھا کر دروازے کے سامنے آگیا۔

اندھیرے میں وہ دونوں آدمی چوک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ بشارت نے ان میں سے ایک کو پہچان لیا تھا۔ وہ کوجان عزیز تھا جبکہ دوسرا آدمی اس کے لئے قطعی اجنبی تھا۔ ”کون ہو مجھی تم..... کس سے ملتا ہے؟“ کوجان عزیز اٹھ کر دروازے کے قریب آگیا۔

”حیرت ہے۔ تم اپنے پرانے دوست کو نہیں پہچان سکتے۔“ بشارت نے کہا۔  
”اوتے بشارت بات.....“ عزیز کہتے ہوئے آگے بڑھ کر اس سے پٹ گیا۔ ”رہ دی سوں..... میں نے تمہیں نہیں پہچانا ہے۔ اگر بولتے نہیں تو میں تو خشک میں پڑ جاؤں گا۔“  
”آؤ..... اندر آ جاؤ۔“

بشارت اندر داخل ہو کر ابھی ہوئی نظروں سے اس آدمی کی طرف دیکھنے لگا جو درہری پر دیوار سے ٹک لگنے بیٹھا تھا۔ عزیز کے منہ سے بشارت کا نام سن کر وہ چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

”یہ استاد گما ہے۔ اوتے وی..... شدرے والا گما استاد۔“ عزیز نے ان کا تعارف کرایا۔

گما کا نام بشارت کے لئے اجنبی نہیں تھا لیکن کبھی آستانا سامنا نہیں ہوا تھا۔ اس کا گھر وہ راوی کی پل کے دوسرے طرف شہدرے کے علاقے میں کام کرتا تھا۔  
”یہاں کوئی کڑیو تو نہیں؟“ بشارت نے عزیز سے پوچھا۔

بشارت تقریباً ایک گھنٹے تک وہیں رہا۔ اس دوران میں ان کے گرد وہ ایک لڑکا بھی آگیا۔ قتلہ بشارت کا یہاں آنے کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ پولیس اس کے پیچھے نہیں تھی۔ وہ عزیز وغیرہ نے رخصت ہو کر ڈیرے سے باہر آگیا۔

کشی چوک پر وہ رتن سینا کی طرف مڑ گیا۔ ابھی اس نے تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ اپنے کندھے پر ہاتھ کا ڈبو محسوس کر کے رک گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا پینٹ شرٹ میں بیوس وہ آدمی اس کے لئے قطعی الجھنی تھا جو اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی مٹی خیز مسکراہٹ تھی۔

”میں نے آپ کا پچھانا نہیں۔“ بشارت نے کہنے ہوئے آنکھیں سے اس کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹا دیا۔

”لیکن میں نے تمہیں پہچان لیا ہے بشارت۔“ اس شخص نے کہا۔

بشارت کا دل اچھل کر قتل میں آگیا۔ وہ اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کمری نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”میں غلام سرور ہوں۔ گوانڈی تھا نے کا بیڑا کاشیال۔“ اس شخص نے کہا۔ ”لیکن ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ تم سے تو کئی ملاقاتیں بھی ہو چکی ہیں۔ حیرت ہے کہ تم مجھے پہچان نہیں سکے۔“

بشارت کے دل کی دھڑکن ایک بار پھر تیز ہو گئی۔ اب اس نے غلام سرور کو پہچان لیا تھا۔ وہ ایک دوسرے مرتبہ اس سے جہت وصول کرنے بھی آیا تھا۔

”آؤ..... کہیں بیٹھ کر اطمینان سے باتیں کرتے ہیں۔“ غلام سرور نے کہا۔

وہ پیدل چلتے ہوئے لاہور ہو چلا وہاں چوک پر آگئے۔ بشارت تھکا نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اسے شبہ تھا کہ اسے کسی جال میں تو نہیں پھنسا لیا جا رہا۔ وہ چوک پار کے ٹھکری روڈ پر ایک ریستورانٹ میں آکر بیٹھ گئے۔ یہ قدرے بڑا سکون جگہ تھی اور وہ یہاں بیٹھ کر اطمینان سے بات کر سکتے تھے۔ غلام سرور نے ویٹر کو چائے کے لئے کہا۔ دیا اور بشارت کی طرف دیکھنے لگا۔

”تم شاید اب بھی ڈر رہے ہو۔“ وہ بولا۔ ”میں تمہارا دوست ہوں۔ تمہیں مجھ سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

”نہیں۔ پہلے گریڈ تھی۔ اب سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ پر تم کہاں عتاب ہو گئے تھے؟“ عزیز نے پوچھا۔

”میں کچھ عرصے کے لئے شہر سے باہر چلا گیا تھا اور یہاں کے کیا حالات ہیں؟“ بشارت نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”یہاں تو شہر میں بڑی گریڈ رہی۔ پولیس کے ڈر سے لوگوں نے یہاں آنا ہی چھوڑ دیا تھا لیکن اب سب ٹھیک ہے۔ کچھ لڑکے واپس آگئے ہیں۔“

”اور پولیس..... وہ لوگ تنگ نہیں کرتے؟“ بشارت نے پوچھا۔

”ہاں دراصل یہ ہے بشارت باؤ۔“ عزیز کے بجائے استو گارے نے جواب دیا۔ ”اس قسم کے جرائم کے اڈے بند ہو جائیں تو پولیس کا کاروبار بھی خراب ہو کر رہ جائے۔ پولیس تو ہم جیسے لوگوں کی خود حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ اگر ہمیں سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا جائے تو پولیس والوں کو بھی قاتلے کرنا پڑیں۔ خلی خلیاں وہ ایک وقت کا چو لہا بھی نہیں جلتا۔“

”ٹھیک کہتے ہو۔“ بشارت نے کمراساں لیتے ہوئے کہا۔ ”پولیس اگر دیانت داری سے کام کرے تو ہم جیسے لوگ جرائم کی دلدل میں نہ پھنسیں۔“

”مجھے دیکھ لو بشارت باؤ۔“ استو گارے نے کہا۔ ”میں نے بی اے کی ڈگری لی ہوئی ہے۔ نوکری کے لئے در در کی ٹھوکریں کھاتی رہا۔ ایک مرتبہ محلے میں کسی سے جھگڑا ہو گیا۔ مجھے ایک ہفتے کے لئے جیل بھیج دیا گیا اور اسی ایک ہفتے نے میری زندگی بدل دی۔ پولیس نے مجھے کہیں جین سے نہیں بیٹھے۔ مجھے شرافت کی راہ چھوڑ کر بھانڈے زندگی اپنے لئے پر مجبور کیا گیا۔“

”یہ پولیس والے نہ خود حق حلال کی کھالے ہیں نہ دوسروں کو کھالے دیتے ہیں۔“ عزیز نے کہا۔ پھر بشارت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”بشارت باؤ۔ یہ شہرے والی بات اپنی کچھ میں نہیں آسکتی۔ پتہ نہیں وہ عورت اور آدمی کون تھے جو اسے اسپتال سے بھگا لے گئے۔“

”ہوں گے کوئی اس کے ہار رو۔“ بشارت نے کہا۔ ”دوپہے یہاں بھی پولیس تو آتی ہو گی۔ کچھ نوہ لینے کے لئے۔“

”نہیں..... یہاں کوئی نہیں آیا۔“ عزیز نے جواب دیا۔

بشارت خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس دوران میں دینر نے ان کی میز پر چائے سرو کر دی تھی۔

”میں نے تمہیں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ پہلے لکھی چوک پر دیکھا تھا۔“ غلام سرور نے اپنا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میں جیسے ہی تمہاری طرف بڑھا، تم چوک پار کر کے نسبت روڈ چلے گئے اور پھر میں نے تمہیں ڈیرے میں جاتے ہوئے دیکھنا میں نے ڈیرے میں جانا مناسب نہیں سمجھا اور ہاں پر کھڑے رہ کر انتظار کرنے لگا۔ اور سناؤ..... کمال قاتل ہے۔“

”شکرے کی وجہ سے یہاں کے حالات اتنے خراب ہو گئے تھے کہ مجھے یہ شہر چھوڑنا پڑا۔“ بشارت نے جواب دیا۔ اب اسے کسی حد تک اطمینان ہو گیا تھا کہ غلام سرور اس کے خلاف کوئی چال نہیں پھیلا رہا۔ اس نے بھی چال چلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

”شکرا کمال ہے؟“ غلام سرور نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔

”میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“ بشارت نے جواب دیا۔ ”میں جیب تراش ضرور ہوں، ہم دونوں نے ایک ساتھ طویل عرصے تک کام کیا ہے لیکن تم بھی جانتے ہو کہ میں بھی کسی سنگین جرم میں ملوث نہیں رہا۔ شکرے نے بھی کبھی کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا تھا۔ رات محل میں جو کچھ ہوا اس پر مجھے حیرت ہے اور پھر جب پولیس نے مجھے گرفتار کرنے کے لئے ڈیرے پر پھانسا، تو میں ڈر کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ مجھے شبہ تھا کہ مجھے بھی اس معاملے میں ملوث کرنے کی کوشش کی جائے گی۔“

”پولیس کو تم پر شبہ تھا۔“ غلام سرور نے کہا۔ ”وہ چھاپے اگرچہ غیر قانونی تھا لیکن اس کے بعد تمہارے بارے میں بھی تحقیقات کا فیصلہ کیا گیا۔ پولیس نے تمہارا ماضی کھنگال ڈالا۔ جیل کی رپورٹ اور تمہارے محلے میں بھی پوچھ گچھ کی گئی جس سے آخر کار یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ تم قتل جیسے سنگین جرم میں ملوث نہیں ہو سکتے۔ اگر تم پکڑے گئے تو تمہارے خلاف زیادہ سے زیادہ جیب تراشی جیسے الزامات کی کارروائی ہو سکتی ہے۔ تم روپوش رہ کر اپنے آپ کو مشتبہ بنا رہے ہو۔ تمہارا ڈیرہ دوبارہ آباد ہو گیا ہے۔ تم دوبارہ یہاں آسکتے ہو۔ تمہارے لئے کوئی خطرہ نہیں ہے۔“

”میں اب وہاں نہیں جاؤں گا۔“ بشارت نے جواب دیا۔ ”ایک لڑکے سے ملنا تھا اس لئے آج وہاں چلا گیا تھا۔ کوشش کروں گا کہ آئندہ ایسی جگہوں سے دور ہی رہوں۔“

”تو کیا کرو گے؟“ غلام سرور نے اسے گھورا۔

”سب سے پہلے میں اپنی بہن کو تلاش کروں گا۔“ بشارت نے کہا۔

”بہن؟“ غلام سرور نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں..... میری بہن..... مجھے بچپن میں خٹے سے اٹھا کر لے گئے تھے اور اسے چھانے کی کوشش میں ہی پولیس نے مجھے جیب تراش سمجھ کر پکڑ لیا تھا اور جیل بھجوا دیا تھا اور میں آج تک اسے تلاش کر رہا ہوں۔“

”خدا کرے تمہاری بہن مل جائے۔ ویسے.....“ غلام سرور ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بولا۔ ”جو اس راستے پر آجاتا ہے وہاں نہیں لوٹ سکتا۔“

”میں جانتا ہوں۔“ بشارت نے جواب دیا۔

”ہاں ایک بات یاد آگئی۔“ جس میں تباہی ضروری سمجھتا ہوں۔“ غلام سرور نے کہا۔ ”مجھ اشرف نام کا ایک اے ایس پی شکرے تمام قانونوں سے تمہارے بارے میں معلومات حاصل کر رہا ہے۔“

”مجھ اشرف..... اے ایس پی۔“ بشارت بڑبڑایا۔ ”کیوں؟ کیا وہ مجھے کسی کیس میں پھنسا چاہتا ہے؟“

”اس کا نہ تو ہمارے علاقے سے تعلق ہے اور نہ ہی شکرے والے کیس سے۔“ غلام سرور نے جواب دیا۔ ”لیکن وہ تمہارے بارے میں معلوم کر رہا ہے۔ ہمارے تھانیدار کے پاس بھی اس کا فون آیا تھا۔ اسے بتا دیا گیا کہ تم کچھ عرصے پہلے تک تو اسی علاقے میں تھے پھر لاپتہ ہو گئے۔ اے ایس پی اشرف بہت سخت گیر اور فرض شناس آفیسر ہے۔ اس کا تعلق ایک دولت مند زمیندار گھرانے سے ہے۔ وہ شوقیہ طور پر اس مجھے میں اپنا قاتل دولت کمانے کے لئے نہیں۔ رشوت سفارش اس کی نفرت میں نہیں۔ اسے تمہاری تلاش کیوں ہے؟ یہ میں نہیں جانتا لیکن تم اس سے دور ہی رہنا۔“

”اس طلاق کے لئے شہر ہے۔“ بشارت نے کہتے ہوئے جیب سے پانچ سو روپے کا نوٹ نکال کر اس کی مفتی میں ڈال دیا۔ ”یہ رکھ لو۔ بچوں کے لئے کچھ لے جانا۔“

غلام سرور اخلافاً انکار کرتا رہا پھر اس نے نوٹ لے کر جیب میں رکھ لیا۔ ”مگر تم واقعی مجھ سے کنارہ کشی اختیار کرنا چاہتے ہو تو میرا مشورہ ہے کہ یہ شہر چھوڑ کر کسی ایسی جگہ چلے



جاؤ جہاں تمہیں کوئی نہ جانتا ہو اگر تم اس شہر میں رہو گے تو اپنا دامن نہیں بچا سکو گے۔ غلام سرور نے کہا۔

بشارت نے اس کا شکر بے ادب کیا اور وہ دونوں ریسٹورنٹ سے نکل آئے۔ غلام سرور سے اچھی خاصی معلومات حاصل ہو گئی تھیں اور اسے یہ بھی اطمینان ہو گیا تھا کہ پولیس کو اس پر قتل کا شبہ نہیں تھا۔

بشارت میٹروڈ روڈ سے عیسائی چکر کسٹلی گیٹ اپنے پرانے محلے آگیا۔ نہ جانے اسے یہ یقین کیوں تھا کہ مجرّم کبھی نہ کبھی اس مکان پر ضرور آئے گی۔ وہ درجہ پہلے بھی یہاں آچکا تھا لیکن دونوں مرتبہ مکان پر کلاکلا ہوا تھا۔

آج کلا نہیں تھا۔ اس نے تھل بجادی اور دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ تقریباً دو منٹ بعد دروازہ کھلا اور اسی لڑکی کی صورت نظر آئی جس سے پہلی مرتبہ سامنا ہوا تھا۔

”آپ کو کس سے ملنا ہے جی؟“ لڑکی نے پوچھا۔

”میں بشارت ہوں۔ دو تین مرتبہ پہلے بھی یہاں آچکا ہوں لیکن گھر پر کلاکلا تھا۔ میں دراصل اپنی بہن کے بارے میں دریافت کرنا چاہتا تھا۔“ بشارت نے کہا۔

”اوہ..... آپ ایک منٹ رکھئے۔ میں ڈیڑی کو بھیجتی ہوں۔“ لڑکی نے کہا اور دروازہ بند کر دیا۔

کچھ دیر بعد ہی اس کا باپ باہر آگیا۔ وہ چند لمبے بشارت کو گھور تا رہا پھر اکھڑے جیسے میں بولا۔ ”اب تم کیا چاہتے ہو؟“

”دراصل مجھے اپنی بہن کی تلاش ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن یہاں ضرور آئے گی۔ ہو سکتا ہے کبھی آئی بھی ہو اور.....“

”اوہ۔“ وہ شخص چونک سار گیا۔ پھر وہ بشارت کو جھٹک میں لے گیا۔ ”کچھ عرصے پہلے ایک لڑکی یہاں آئی تھی۔ اس نے اپنا نام شاید مجھ بتایا تھا۔“

”دبی..... مجرّم میری بانی کا نام ہے۔ کہاں ہے وہ۔“ بشارت جلدی سے بولا۔ طویل عرصے بعد مجرّم کا نام سن کر اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔

”یہ تین سال پہلے کی بات ہے۔“ وہ شخص بولا۔ ”وہ اسے اچھا سمجھ کر ہی آئی تھی اور اسے تمہاری تلاش تھی۔ ہم نے اسے روکنا چاہا لیکن وہ چلی گئی۔“

”کہاں؟“ بشارت نے پوچھا۔

”کچھ پتہ نہیں۔“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے پاس رہنے کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے کچھ پتہ نہیں وہ کہاں گئی تھی۔ ویسے میرا ایک مشورہ ہے۔“

”کیا.....؟“ بشارت نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”شہر میں قلابی ادارے ہیں۔ جہاں بے سارا بچوں اور عورتوں کو بھی رکھا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے تمہاری بہن ایسے ہی کسی ادارے میں پڑی ہو۔ کم از کم ایک ادارے کے بارے میں تو میں جانتا ہوں۔ بڑی نیک نائی ہے اس ادارے کی۔ تم وہیں سے اپنی تلاش شروع کرو۔ وہاں سے تمہیں دوسرے اداروں کے ایڈریس بھی معلوم ہو جائیں گے۔“

”آپ کس ادارے کی بات کر رہے ہیں؟“ بشارت نے پوچھا۔

”دارالامان.....“ مسلم ٹاؤن میں ہے۔ حافظ عبدالرشید نام کا ایک نیک اور محترم آدمی اس ادارے کے اخراجات برداشت کرتا ہے۔ مسلم ٹاؤن میں کہیں سے بھی پوچھو گے تو تمہیں پتہ معلوم ہو جائے گا۔“

بشارت اس کا شکریہ ادا کر کے مکان سے باہر آگیا۔ اس وقت رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ ظاہر ہے وہ ادارہ اس وقت بند ہو گا۔ وہ جب گھر واپس پہنچا تو بارہ بجنے والے تھے۔

”کہیں سے ٹیلی فون ہی کر دیتے یا رہ۔ ہم یہاں پریشان ہو رہے تھے۔“ شکر نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

”مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا۔“ بشارت نے اس کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ سنا دہیں ایک کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

”کیا صورت حال ہے؟“ شکر نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”پولیس کو پہلے تو یہ شبہ تھا کہ میں بھی رنگ عمل والی واردات میں ملوث ہو سکتا ہوں۔“ بشارت نے کہا۔ ”لیکن میرے بارے میں تحقیقات کے بعد پولیس اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ میں اس واردات میں ملوث نہیں ہو سکتا۔ البتہ پولیس کو اس عورت اور داؤھی والے نقلی ڈاکٹر کی تلاش ہے جنہوں نے تمہیں اسپتال سے فرا کر کیا تھا۔“

”تمہیں یہ باتیں کہاں سے معلوم ہوئیں۔ میرا مطلب ہے۔ تمہارے ملوث نہ ہونے

وال بات؟“ شکرے نے پوچھا۔

”لکشی چوک پر حوالدار غلام سرور مل گیا تھا۔ وہی گولانڈی تھانے والا۔“ بشارت نے جواب دیا۔ ”تم تقریباً ایک گھنٹے تک ہوٹل میں بیٹھے رہے۔ یہ سب کچھ مجھے اسی نے بتایا تھا۔ البتہ ایک اور تشویشناک بات معلوم ہوئی ہے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا۔ ”اے ایس پی اشرف نام کا کوئی پولیس آفیسر ہے جو شکر کے تمام تھانوں سے میرے بارے میں معلومات حاصل کر رہا ہے حالانکہ اس پولیس آفیسر کا ہمارے علاقے کے تھانے اور رنگ محل یا ہسپتال والے کیس سے بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”تمہارے ساتھ کوئی چال تو نہیں چلی جا رہی؟“ شکرے نے کہا۔ ”مجھے خدشہ ہے۔“ حوالدار غلام سرور سے تمہاری ملاقات اتفاقاً نہیں ہوئی ہوگی۔ ہو سکتا ہے ڈیرے کی خفیہ نگرانی کی جا رہی ہو اور حوالدار غلام سرور نے تمہارے گرد جال پھینکا ہو تاکہ تم آزادی سے گھومتے پھرتے رہو اور وہ تمہاری نگرانی کر کے تمھیں جگہ جگہ پہنچنا چاہتے ہوں۔ ایسی صورت میں ہم تینوں چوہوں کی طرح بارے جا میں گے۔“

”نہیں۔“ بشارت مسکرایا۔ ”غلام سرور نے تو مجھے یہ بھی مشورہ دیا ہے کہ اگر میں واقعی جرائم سے کنارہ کشی اختیار کرنا چاہتا ہوں تو یہ شرچہ چھوڑ کر کسی ایسی جگہ چلا جاؤں جہاں مجھے کوئی نہ جانتا ہو۔ اگر کوئی چال ہوتی تو وہ مجھے یہاں سے چلے جانے کا مشورہ نہ دیتا۔“ ”سہرا چال“ ہو شیار رہنا۔“ شکرے نے کہا۔ ”بعض اوقات معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے لئے پولیس بڑی گہری چالیں چلتی ہے۔“

”اطمینان رکھو۔“ بشارت بولا۔ ”اگر ایسا کوئی موقع آیا تو وہ ہمیں ترنوالہ نہیں پائیں گے۔“

”اور اپنی ہمن کے بارے میں کچھ معلوم کیا؟“ سنیتا نے پوچھا۔

”ہاں۔ میں اپنے پرانے گھر گیا تھا۔“ بشارت نے جواب دیا۔ ”وہ تقریباً تین سال پہلے وہاں آئی تھی۔ اس کے بعد وہ پتہ نہیں کھل چلی گئی۔ ویسے اس شخص نے مجھے مشورہ دیا کہ رفتاری اداروں سے معلوم کروں جہاں بے سارا عورتوں اور بچوں کو رکھا جاتا ہے۔ اس نے مسلم ٹائون میں ایک ادارے کا پتہ بتایا ہے۔ میں صبح جا کر معلوم کروں گا۔“

وہ دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے پھر بشارت اپنے کمرے میں آگیا۔ سنیتا بھی آکر بستری

لیٹ گئی تھی۔ وہ تو جلدی سو گئی مگر بشارت جاگتا رہا۔ وہ نجمہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کہاں ہوگی؟ کس حال میں ہوگی۔

بشارت دیر سے سویا تھا اور صبح اس کی آنکھ بھی دیر سے کھلی تھی۔ نہاتے ہوئے نہ جانے کس طرح اس کی ایک آنکھ سے لینس نکل کر گر گئی۔ بشارت نے دو سراینس بھی نکال دیا۔ اس کے خیال میں اب اس کی ضرورت نہیں تھی۔ ہسپتال میں پولیس والوں نے اس کی نیلی آنکھیں دیکھی تھیں اور اب نیلی آنکھیں اس کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی تھیں۔ ماسی ارشاد بی بی نے بھی پولیس کو اس کا جو حلیہ بتایا تھا اس میں واڈھی کے ساتھ نیلی آنکھوں کا تذکرہ تھا۔ واڈھی سے اس نے پہلے ہی نجات حاصل کر لی تھی اور اب آنکھوں کی رنگت بھی بدل گئی تھی اور اسے یقین تھا کہ اب ماسی ارشاد بی بی بھی اسے شناخت نہیں کر پائے گی۔ سنیتا بھی بشارت کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئی۔ بال ہتھکڑیا لے ہو جانے سے اس کے ملنے میں بھی بڑی تہدیبی آہنی تھی۔

مسلم ٹائون میں دارالامان تلاش کرنے میں انہیں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ یہ ادارہ ایک بہت بڑی دھڑلہ کوٹھی میں قائم تھا لیکن وہاں چوکیدار کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ ”یہ ادارہ تو کئی روز پہلے بند کر دیا گیا ہے۔ اب یہاں نہ تو کام ہوتا ہے اور نہ ہی کسی کی رہائش ہے۔“ چوکیدار نے بتایا۔

”اور یہاں جو بے سارا عورتیں رہائش پذیر تھیں وہ کہاں گئیں؟“ بشارت نے پوچھا۔ ”انہیں سرکاری دارالامان میں بھیج دیا گیا تھا۔“ چوکیدار نے جواب دیا۔ بشارت اس سے نجمہ کے بارے میں دریافت کرنے لگا۔

”مجھے تو پتہ نہیں جناب۔“ چوکیدار نے کہا۔ ”میری ڈیوٹی تو ہمیشہ گیٹ پر ہی رہتی ہے۔ میں لڑکیوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ آپ سنبھر سے معلوم کر لیں۔ وہ وحدت کلاونی میں رہتی ہیں۔ میں آپ کو پتہ بتا دیتا ہوں۔“

بشارت نے چوکیدار کا بتایا ہوا مس عشرت کا مکان نمبر ۵۸ نشین کر لیا اور وہ دونوں وحدت کلاونی کی طرف روانہ ہو گئے۔

وحدت دھڑ کے ایک طرف مسلم ٹائون تھا اور دوسری طرف وحدت کلاونی۔ وہاں پہنچے تو مس عشرت کا مکان تلاش کرنے میں انہیں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

دارالامان کے پردگی میں دے دیا گیا تھا۔

اے ایس بی اشرف نے ادارے کا ریکارڈ اپنی تحویل میں لینے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے لئے یہ انکشاف خاصا دلچسپ بات ہو کہ اس سے صرف ایک روز پہلے مقامی تھانے میں ادارے میں چوری کی رپورٹ درج کروائی گئی تھی۔ تحریری رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ قیمتی سازو سامان کے علاوہ چور ادارے کا تمام ریکارڈ بھی لے گئے تھے۔

اے ایس بی اشرف جانتا تھا کہ یہ سارا ڈرامہ ہے۔ اس نے حافظ رشید کے خلاف اگرچہ تحقیقات خفیہ رکھی تھیں لیکن اسے کسی طرح پتہ چل گیا تھا اور اس نے سارا ریکارڈ غائب کر کے تھانے میں چوری کی رپورٹ لکھوا دی تھی۔

اے ایس بی اشرف پر اوپر سے دباؤ پڑنے لگا تھا کہ وہ حافظ عبدالرشید کے خلاف اپنی تحقیقات بند کر دے لیکن اشرف کو اپنے ایس ایس بی کی بھرپور حمایت حاصل تھی اور ایس ایس بی نے ڈی آئی جی کو قائل کر لیا تھا کہ تحقیقات جاری رہنی چاہئے اس نے اب تک کی رپورٹ بھی ڈی آئی جی کو پیش کر دی تھی۔

حافظ عبدالرشید کے خلاف تحقیقات کے ساتھ ہی اشرف نے بشارت کے بارے میں بھی تحقیقات کا سلسلہ جاری رکھا ہوا تھا لیکن وہ تو اس طرح غائب ہوا تھا جیسے اس دنیا میں اس کا وجود ہی نہ رہا ہو۔

حافظ عبدالرشید نے بھی ایک وزیر سے رابطہ کر لیا تھا۔ اس وزیر کی طرف سے انتظامیہ پر دباؤ پڑنے لگا کہ حافظ کے خلاف تحقیقات روک دی جائیں۔ یہ امکانات ڈی آئی جی تک پہنچ گئے۔ ڈی آئی جی نے اس معاملے کو نہایت سنگین قرار دیتے ہوئے تحقیقات روکنے سے انکار کر دیا اور اے ایس بی اشرف کو آگے بڑھتے رہنے کا اشارہ دیا۔

اور پھر یہ اے ایس بی اشرف کی خوش قسمتی تھی کہ ایک عرب شیخ نے حافظ عبدالرشید کے خلاف فراڈ کی رپورٹ تھانے میں درج کروادی۔ اس نے حافظ عبدالرشید پر دھوکے سے بیس لاکھ روپے ہتھم کر لینے کا الزام لگایا تھا۔ اگر کوئی عام شہری رپورٹ لکھواتا چاہتا تو کبھی نہ کہیں جاتی۔ مگر وہ عرب ریاست عمان کا ایک بااثر شیخ تھا۔ اس نے اس معاملے کو سفارتی ذرائع سے بھی اٹھانے کی دھمکی دے رکھی تھی۔

اور پھر اس سے اگلے ہی روز اے ایس بی اشرف کے مخبر نے ایک ایسے آدمی کا سراغ

مس عشرت بیٹنالس کے لگ بھگ ایک بھاری بھر کم عورت تھی۔ اس کی آنسوئی رنگت دیکھ کر گلتا تھا جیسے وہ افریقہ کے کسی ملک کی رہنے والی ہو۔ اس کے بچے میں بڑی کربختی تھی۔

”نمبر نام کی تو ہمارے ادارے میں کوئی لڑکی نہیں تھی۔“ اس نے بشارت کی بات سننے کے بعد کہہ ”بعض لڑکیاں گھروں سے بھاگی ہوتی ہیں اور اپنی اصلیت چھپانے کے لئے نام بھی بدل لیتی ہیں۔ اس کا طبعیت تباہ و تباہی میں بھی کچھ سمجھ سکوں۔“

”حلیہ! بشارت کے منہ سے مگر اسان فل گلیہ۔“ اسے دیکھتے ہوئے تو برسوں گزر گئے ہیں اب تو وہ بہت بدل گئی ہو گی۔“

”سوری۔ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔“ مس عشرت کہتے ہوئے کرسی سے اٹھ گئی۔ یہ اشارہ تھا اس بات کا کہ وہ لوگ جا سکتے ہیں۔ ”آپ دوسرے اداروں سے جا کر معلوم کریں آپ کو جس کی تلاش ہے اس کا مکمل حلیہ تو معلوم ہونا چاہئے۔“

بشارت اور مہینا تین چار دن تک شکر کے مختلف اداروں سے معلومات حاصل کرتے رہے لیکن کامیابی نہیں ہو سکی۔ کہیں سے بھی نجمہ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ اس نے حافظ عبدالرشید سے بھی ملنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہو سکا۔ اسے بتایا گیا کہ حافظ جی آج کل کسی سے نہیں ملتے۔ بشارت کی باؤسی بدعتی جاری تھی۔

☆=====☆

بات بہت اوپر تک پہنچ چکی تھی۔ حافظ عبدالرشید کو بھی پتہ چل گیا کہ اس کے خلاف کسی قسم کی تحقیقات ہو رہی ہے۔ اس نے بھی پتہ چھپانے کے لئے شروع کر دیے تھے تاکہ کسی ہنگامی صورت حال میں اپنا بچاؤ کر سکے لیکن اے ایس بی اشرف نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ اس کے چرے کو بے غائب کر کے ہی رہے گا۔ ابتدائی تحقیقات کے دوران میں اسے حافظ جی کے خلاف کچھ اور باتیں معلوم ہوئی تھیں لیکن وہ باتیں ایسی نہیں تھیں کہ ان کی بنیاد پر مضبوط کیس بنایا جاسکے۔ اپنے اعلیٰ افسران سے بھی اس کا رابطہ تھا اور وہ اپنی تحقیقات سے انہیں آگاہ رکھتے ہوئے تھا۔

تحقیقات شروع ہونے کے چار روز بعد ہی بڑے ڈرامائی انداز میں دارالامان بند کر دیا گیا تھا۔ ادارے کے رہائشی پونٹ میں تین ادھیر عمر عورتیں رہائش پذیر تھیں جنہیں سرکاری

پولیس نے اگرچہ اپنی اس کارروائی کو نہایت خفیہ رکھا تھا مگر ایک اخبار کار پورٹراس اسٹوری کو لے اڑا اور اس روز جب بشارت نے یہ خبر اخبار میں پڑھی تو اس کے ہوش اڑ گئے۔

اس رپورٹر کی اطلاع کے مطابق جس روز رنگ محل میں رزنی اور دہرے قتل کی واردات ہوئی تھی، پولیس نے اسی روز پتہ چلا لیا تھا کہ شکرے کا فرار ہونے والا ساتھی بشارت ہی تھا۔ پولیس اس کی گرفتاری کا منصوبہ بنارہی تھی کہ ایک اے آئی کی حفاظت سے معاملہ جگڑ گیا اور بشارت روپوش ہو گیا۔ پھر ہسپتال سے شکرے کو فرار کرا لیا گیا۔ پولیس کو توقع نہیں تھی کہ ایسی کوئی کارروائی ہو سکتی ہے۔ برہما، ہسپتال کے کمرے میں موجود چیزوں پر ملنے والے فنگر پرنٹس سے یہ ثابت ہو گیا کہ نقلی ڈاکٹر بشارت ہی تھا۔ اس کی ساتھی عورت کے فنگر پرنٹس بھی مل گئے ہیں لیکن پولیس اس کے بارے میں بتانے سے گریز کر رہی ہے۔

بشارت شکرے کو لے کر ایک بار پھر غائب ہو گیا تھا۔ آخر کار کئی روز بعد ایک مشتبہ ریٹائرڈ نرس نے انکشاف کیا کہ ایک عورت اور ایک مرد اسے مغرور زخمی قیدی کے علاج کے لئے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے جاتے رہے ہیں۔ پولیس نے اس گاڑی کے بارے میں بھی پتہ چلا لیا تھا جو ان دونوں کے استعمال میں تھی۔ وہ گاڑی سنیا تھا اس عورت کی ملکیت ہے۔ جو بشارت کے ساتھ ان خوفناک سرگرمیوں میں مصروف ہے مگر پولیس یہ پتہ نہیں چلا سکی کہ وہ گاڑی اس وقت کہاں ہے۔

بشارت اب تک پولیس کو چکر دیتا رہا۔ اس کی چالاکی کو دیکھتے ہوئے پولیس نے اپنی حکمت عملی تبدیل کرنے کا فیصلہ کرا لیا اور نسبت روڈ والے ڈیرے کی نگرانی شروع کر دی اور پولیس کا ایک تجربہ کار جیب تراش گرہ کے سرخنے کے ہمیں میں وہاں رہنے لگے۔ پولیس کو یقین تھا کہ بشارت وہاں ضرور آئے گا۔

پولیس کا یہ خیال درست نکلا۔ چند روز پہلے بشارت اس ڈیرے میں داخل ہوا تھا اور جب باہر نکلا تو سادہ لباس میں پولیس کے ایک ہیڈ کانسٹیبل نے دوست بن کر اس سے ملاقات کی اور ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے اسے یہ باور کرایا کہ اسے پولیس سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اس پر سنگین جرم کا الزام نہیں ہے۔

بھی نکالیا جس کا تعلق بیرونی فروشوں کے ایک منظم گروہ سے تھا۔ اس کے قبضے سے آدھا کلو بیرونی بھی برآمد ہوئی تھی۔ اس کے ذریعے اسے ایس بی اے اشرف ایک اور معزز ہستی تک پہنچ گیا جس کے بارے میں یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ بیرونی فروشوں کے اس گروہ کا سرغنہ حافظ عبدالرشید ہے جو طویل عرصے سے یہ دھندہ کر رہا ہے۔ اسے ایس بی اے اشرف نے بڑی رازداری سے اس معزز ہستی کو اٹھایا جس نے ایس ایس پی کے سامنے مزید کئی سنسنی خیز انکشافات کئے۔

اسے ایس بی اے اشرف اب ہر کام بھول کر اس کیس پر کام کر رہا تھا۔ اس نے حافظ عبدالرشید کے خلاف اپنے ذرائع سے تحقیقات جاری رکھی اور اس کا سارا ماضی کھنگال ڈالا۔ اس نے یہ بھی معلوم کرا لیا کہ عبدالرشید دس گیارہ سال کی عمر میں پشاور کے قبح خانوں میں لڑکیوں والے کپڑے پہن کر ڈانس کیا کرتا تھا۔ پھر وہ ایک منشیات فروش کے ہاتھ لگ گیا۔ کچھ عرصے پشاور میں اس کے لئے کام کیا اور پھر وہاں سے بھاگ کر لاہور آ گیا۔ یہاں بھی وہ ہیرا منڈی کے علاقے میں ایک منشیات فروش کے پاس کام کرتا رہا پھر اس نے اپنا کام شروع کر دیا۔

اسے ایس بی اے اشرف نے اس کی زندگی کا ایک ایک کوٹا کھنگال ڈالا تھا۔ وہ کب کہاں رہا اور کیا کرتا رہا۔ اس نے دارالان کے بارے میں بھی ایک طویل رپورٹ تیار کر لی تھی۔ اب اسے اس ادارے کے ریکارڈ کی بھی ضرورت نہیں تھی اس کے پاس ایسے گروہ موجود تھے جو لڑکیوں کے کاروبار کے حوالے سے حافظ عبدالرشید کے خلاف بیان دیتے کو تیار تھے۔

اور پھر اپنی رپورٹس پر مشتمل خفیہ فائل اس نے ایس ایس پی کے سامنے پیش کر دی۔ حافظ عبدالرشید کے خلاف اتنے غصے ثبوت جمع ہو گئے تھے کہ انہیں جھٹلایا نہیں جاسکتا تھا۔

☆=====☆

بشارت اب واقعی اس شرے نکل جانا چاہتا تھا۔

شکرے نے غلط نہیں کیا تھا۔ پولیس اس کے خلاف واقعی جال پھیلا رہی تھی۔ حوالدار غلام سرور کی ہمدردیاں بھی اس سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ وہ بشارت کو ڈھیل دینا چاہتے تھے تاکہ وہ مطمئن ہو جائے کہ اس کے خلاف کوئی کیس نہیں ہے اور پھر وہ اس کے ذریعے شکرے تک پہنچنا چاہتے تھے۔

پولیس بشارت کو دھوکے میں رکھ کر اس کے ذریعے شکرے تک پہنچنا چاہتی تھی۔ اس طرح ان تینوں کو بیک وقت گرفتار کر لیا جاتا لیکن اخبار کے رپورٹر نے پولیس کا بھانڈا پھوڑ دیا۔

”تم تو حوالدار غلام سرور کی باتوں پر ایمان لے آئے تھے۔“ شکرے نے یہ خبر دینے کے بعد اسے گھورا۔ ”اب تو تمہیں یقین آ گیا نا کہ یہ پولیس والے کسی کے ہمدرد اور دوست نہیں ہوتے۔ ہو سکتا ہے انہوں نے تمہاری عمرانی کر کے ہمارے اس ٹھکانے کا پتہ چلا لیا ہو اور ہمیں گرفت میں لینے کے لئے کسی مناسب موقع کی تلاش میں ہوں۔“

”نہیں۔“ بشارت نے جواب دیا۔ ”اس طرف آتے ہوئے میں نے بیشہ اس بات کا خیال رکھا ہے۔ اگر اس ٹھکانے کا پتہ چل گیا ہو تا تو ہم اطمینان سے یہاں نہ بیٹھے ہوتے۔“ چند لمبے خاموشی رہی پھر بشارت سنی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”پولیس تمہارے بارے میں بھی پہلے ہی سے بہت کچھ جانتی ہے۔ کیا اب بھی تم اپنی اصلیت نہیں بتاؤ گی؟“

”ضرور بتاؤ گی۔“ سنیہا کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ ”میں نے جو بازی شروع کی تھی اس میں جیت کا کوئی امکان نہیں۔ مجھے اپنی شکست صاف نظر آرہی ہے اس لئے اب میں تم سے کوئی بات نہیں چھپاؤں گی۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ”میں نے جب سرحد پار کی تھی تو میرا خیال تھا کہ میرے بارے میں کبھی کوئی نہیں جان سکے گا لیکن آج اخبار میں اپنا نام پڑھ کر مجھے یہ چل گیا ہے کہ پولیس میرے بارے میں سب کچھ پہلے سے جان چکی تھی۔ میرے محلے میں کوئی نہیں جانتا کہ میرا نام سنیہا ہے یہ نام میں نے صرف تمہیں بتایا تھا۔ محلے والے تو مجھے رضیہ کے نام سے جانتے ہیں۔ اخبار میں اس نام کی اشاعت یہ ثابت کرتی ہے کہ سرحد کے اس طرف قدم رکھتے ہی میری ک پولیس میرے نام سے واقف ہو گئی تھی۔“

”میں تم دونوں سے کچھ نہیں چھپاؤں گی۔ کیونکہ میں جان گئی ہوں کہ جس مقصد سے سرحد پار کر کے آئی تھی وہ پورا نہیں ہو سکتا۔ مجھے اپنی کالیابی کی کوئی امید نہیں۔“

”میں سمجھا نہیں۔ کیا کتنا چاہتی ہو؟“ بشارت نے اسے گھورا۔

”میں پڑوسی ملک کی اٹلی جنس سروس کی ایجنٹ ہوں۔“ سنیہا نے جواب دیا۔ ”مجھے ایک خاص مقصد کے لئے بھیجا گیا تھا۔ مجھے یہاں کم از کم دو سال رہ کر اپنے قدم جمائے تھے۔“

اپنا اٹھکوا جھٹا تھا اور اصل کلام اس کے بعد شروع ہوا۔ میرے ملک سے کچھ اور ایجنٹ یہاں آتے جو ممان کی حیثیت سے میرے پاس رہتے اور اپنا کام کرتے۔

”میں ڈیڑھ سال سے یہاں ہوں۔ تین مہینے پہلے مجھے حکم ملا تھا کہ میں دو تین ایسے آدمی تلاش کروں جو ہمارے لئے آلہ کار بن سکیں جن پر بھروسہ کیا جاسکے اور جو بوقت ضرورت جان کی بازی لگا سکیں۔ میں ایسے لوگوں کی تلاش میں تھی اور پھر اس روز میں نے رنگ محل میں وہ خوفناک حادثہ واقعہ رونما ہوتے دیکھ لیا۔ تم نے جس جرات کا مظاہرہ کیا تھا اس سے میں بے حد متاثر ہوئی تھی۔ میں تمہیں پولیس کے زخمی سے نکال لائی۔ میرا خیال تھا کہ تم دہائیوں تک رہ کر ہمارے لئے کام کرو گے اور پھر مجھ پر تم نے شکرے کو بھی اسپتال سے فرار کرانے کا منصوبہ بنایا تو میں تمہارا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئی۔ شکرے کے لئے بھی میں نے وہی سوچا تھا جو تمہارے لئے سوچ رکھا تھا پھر شکرے کو بھی لے آئے میں کامیاب ہو گئی لیکن.....“

”لیکن کیا.....؟“ بشارت نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”کل تمہاری عدم موجودگی میں، میں بھی اپنے گھر گئی تھی۔“ سنیہا نے کہہ دیا۔ ”وہاں میں نے ایک ٹرانسپیر چھپا رکھا ہے۔ میں نے ٹرانسپیر پر اپنی اٹلی جنس کے سربراہ کو صورت حال سے آگاہ کیا تو اس نے بتایا کہ بعض وجوہات کی وجہ سے وہ منصوبہ ختم کر دیا گیا ہے جس کے لئے مجھے یہاں بھیجا گیا تھا اور یہ کہ میں بھی یہاں کی اٹلی جنس کی نظروں میں آچکی ہوں اس لئے میں اب ان کے کام کی نہیں رہی۔ یہ میرا پہلا مشن تھا اور مجھ پر واضح کر دیا گیا تھا کہ اگر میں پکڑی گئی تو وہ میری کوئی مدد نہیں کریں گے بلکہ مجھے پھانسنے یا شناخت ہی سے انکار کر دیا جائے گا۔“

”تم اس شخص کی مایوسی کا اندازہ لگا چکے ہو جسے بیچ مفید حیا میں چھوڑ دیا گیا ہو۔ میں بری طرح مایوس ہو گئی ہوں۔ میں اپنے ملک واپس نہیں جاسکتی۔ یہاں بھی اٹلی جنس کی نظروں میں آچکی ہوں۔ حیرت ہے کہ مجھے اب تک پکڑا کیوں نہیں گیا۔ یا ممکن ہے وہ اس انتظار میں ہوں کہ میں حرکت کروں تو مجھے رنگے ہاتھوں پکڑا جائے۔“

”میں تم دونوں کی جرات اور دلیری سے بہت متاثر ہوئی ہوں۔ میں نے سب کچھ تمہیں بتا دیا ہے۔ اگر تم لوگ چاہو تو مجھے قانون کے حوالے کر دو۔ ہو سکتا ہے اس طرح تم

لوگوں کو کوئی رعایت مل جائے۔

”ہم اپنے قانون کو اچھی طرح جانتے ہیں۔“ شکرے نے کہا۔ ”ہم آسمان سے تارے بھی تو ذکر قانون کی جھوٹی میں ڈال دیں تو ہمارے ساتھ کوئی رعایت نہیں۔ ہوگی۔ پولیس سب سے پہلے ہماری کھال اڑھیرے گی اور اس کے بعد کوئی بات کرنے کا موقع دے گی۔“

”تو پھر جو کچھ تم لوگ کرنا چاہتے ہو، میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ سینٹا نے کہا۔

”پولیس جس طرح سرگرمی دکھا رہی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری آزادی بلکہ

زندگی کے چند روز باقی رہ گئے ہیں۔ اگر تم ہمارے ساتھ مرنا چاہتی ہو تو ہمیں کوئی اعتراض

نہیں ہے۔ ویسے میرا مشورہ ہے کہ ہمارا ساتھ چھوڑ کر اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دو۔

ہمارے بارے میں زبان بند رکھو گی تو برا احسان ہو گا۔“ شکرے نے کہا۔

”نہیں۔ میں تم لوگوں کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی۔“ سینٹا نے جواب دیا۔

بشارت اور شکرہ خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ یہ ایک نئی صورت

حال پیدا ہو گئی تھی جس کا نتیجہ زیادہ خطرناک ہو سکتا تھا۔ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ

انہیں سینٹا کے بارے میں کیا فیصلہ کرنا چاہئے۔

اس شام بشارت سینٹا کے ساتھ ایک بار پھر مجرم کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا اور خوش

قسمتی سے انہیں دارالانسان میں کام کرنے والی زلفا نامی بڑی عورت مل گئی۔ اس نے جو

اعکاشات دکھے وہ بہت ہی خوفناک تھے۔

”زب کو جان دینی ہے پتر۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔“ زلفا کہہ رہی تھی۔ ”یہ جو

حافظ عبدالرشید ہے نامت چنچ اور کینہ آدی ہے۔ وہ بڑا نیک اور پرمیزگار بھٹا ہے مگر کوتوت

ایسے کالے کہ سن کر ہی کراہت آتی ہے۔ یہ جو اس نے ادارہ بتایا ہوا ہے۔

دارالانسان..... یہ بے سارا عورتوں کی امداد کے لئے نہیں حفظ کی عیاشی کا ڈھ ہے۔ اس

کے آدی مارے شہر میں پھیلے ہوئے ہیں جو لڑکیوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ جو لڑکیاں اس

ادارے میں رہ کر بھی جاتی ہیں۔ انہیں بے آبرو بھی کیا جاتا ہے اور انہیں بچ بھی دیا جاتا ہے اور یہ

مشہور کر دیا جاتا ہے کہ لڑکی کو اس کے داروں کے پاس پھینچا دیا ہے اس ادارے کی انتہا

میں عشرت..... وہ کالی، موٹی عورت..... وہ تو اس کی دلال ہے۔ وہی ایسی ساری

کارروائیوں پر پردہ ڈالتی ہے۔ میں تو تو بہ تو بہ کرتی ہوں پتر..... خدا ایسے لوگوں سے

ہی رکھے۔

”تم مجرم کے بارے میں کچھ بتا رہی تھیں۔“ بشارت نے اسے یاد دلایا۔

”آہ پتر..... وہ بچاری بڑی دھکی لڑکی تھی۔“ زلفا نے کہا۔ ”جب اسے ہمارا لایا گیا

تو اس کا نام مجرم ہی تھا مگر رنڈ میں اس کا نام شبانہ رکھا گیا۔“

”وہ کہاں سے آئی تھی۔ اس کے بارے میں کچھ جانتی ہو؟“ بشارت نے پوچھا۔ اس

کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔

”پتہ نہیں۔ حافظ کے بندے اسے کہیں سے پکڑ کر لائے تھے۔“ زلفا نے جواب دیا۔

”وہ بچاری بڑا روٹی تھی۔ اس نے مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ بچاری اپنے دیر

کے لئے تڑپ رہی تھی۔ زندگی بھر اپنے آپ کو درندوں سے بچاتے ہوئے دوڑتی رہی اور

بھائی کو تلاش کرتی رہی۔ مگر یہ لوگ انسان نہیں شیطان ہیں، کسی مظلوم پر انہیں کب ترس

آتا ہے۔“

”پھر..... پھر وہ کہاں گئی؟ ادارہ تو بند ہو چکا ہے۔“ بشارت نے بے صبری سے

پوچھا۔

”جب اس ادارے میں لایا گیا تو اس کے دو تین ہفتے بعد ہی حافظ رشید اسے اپنی کوٹھی

پر لے گیا۔ میں بھی اس کی کوٹھی جاتی رہی تھی۔ وہ شبانہ کو بچی کہتا تھا۔ وہ تین سال سے وہاں

رہی اور پھر مجھے دلا دیا۔ اس کے ایک بندے نے بتایا کہ حافظ رشید نے اسے میں لاکھ میں

بیچ دیا ہے۔ دلا دیا حافظ کا خاص بندہ ہے۔ ادارے میں بھی آتا رہا تھا۔“

”بیچ دیا۔“ بشارت کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

”مگر شبانہ اسی رات حافظ کی کوٹھی سے بھاگ گئی تھی۔ حافظ اسی روز سے بھوکھلا ہوا

ہے۔ اس لئے اس نے ادارہ بھی بند کر دیا ہے۔ تاکہ کوئی اس کے بارے میں مظلوم نہ کر

لے۔“ زلفا نے بتایا۔

بشارت کا دل کانپ رہا تھا۔ زلفا نے شبانہ کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا اس سے اب اس

میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ وہ مجرم ہی تھی۔

اپنی کوٹھی پر واپس آکر بھی مظلومانہ انداز میں قتل رہا۔ زلفا نے اسے یہ بھی بتایا تھا کہ

حافظ عبدالرشید کی کوٹھی سے بھاگنے کے بعد مجرم پکڑی گئی تھی اور کسی پولیس آفیسر کے پاس

تھی۔ حافظ رشید کو پتہ چل گیا تھا وہ خود تو سامنے نہیں آیا مگر اس نے دوسرے لوگوں کے ذریعے اس پولیس آفیسر کو رقم کی پیشکش کی تھی کہ مجھ کو واپس کر دے مگر وہ پولیس آفیسر اس کے خلاف قانونی کارروائی کرنے پر تیار ہوا۔

زلیخا اگرچہ اس پولیس آفیسر کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی لیکن بشارت کے ذہن میں ہار بارے ایس بی اے شرف کا نام گونج رہا تھا جو شر کے تمام تھاؤں سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کر رہا تھا۔ ہو سکتا ہے مجھ اس کے پاس ہو اور مجھ کی دکھ بھری کہانی سن کر ہی وہ بشارت کو تلاش کر رہا ہو لیکن یہ ضروری نہیں تھا۔ حلقہ کچھ اور بھی ہو سکتا تھا۔ مجھ کے بارے میں حافظ عبدالرشید ہی جانتا سکتا تھا کہ وہ کس پولیس آفیسر کے قبضے میں ہے۔

”سوچ کیا رہے ہو؟“ شر کے اس کے چہرے پر نظرس جماتے ہوئے کہہ۔ ”ہم ابھی چل کر حافظ سے مجھ کے بارے میں پوچھ لیتے ہیں۔“

”تم.....؟“ بشارت نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں اب ٹھیک ہوں۔“ شر کے نے جواب دیا۔ ”میرے ہاتھوں میں اب اتنی طاقت آگئی ہے کہ حافظ رشید جیسے شخص کی گردن مروڑ سکوں۔“ اور پھر بشارت نے زندگی کی سب سے بڑی بازی لگانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

کار کا انشورنگ سنیٹا کے ہاتھ میں تھا۔ آگے بشارت بیٹھا ہوا تھا اور بجلی سیٹ پر شر۔ ان دونوں کے پاس وہ آؤٹریک رانکھیں تھیں جو اسپتال میں پولیس والوں سے بھیجی گئی تھیں۔ دونوں رانکھوں کے بیگزین بھرے ہوئے تھے۔

جب وہ حافظ عبدالرشید کی کوٹھی دلی گلی میں داخل ہوئے تو رات کے گیارہ بجتے والے تھے اور پھر ٹھیک اسی وقت ایک مجبور کو کوٹھی کے گیٹ سے نکلی۔ اس کا رخ اسی طرف تھا۔ سنیٹا نے بڑی تیزی سے اپنی کار مجبور کے سامنے کر دی۔ مجبور درگئی۔

مجبور وہیں تین آدمی تھے۔ حافظ عبدالرشید اور دو اس کے خاص بندے۔ بشارت بڑی پھرتی سے کار سے اتر آیا۔ رانکھ اس کے ہاتھ میں تھی۔ شرکا رانکھ لئے کار کی بجلی سیٹ پر بیٹھا رہا۔

”حافظ جی۔ ذرا نیچے آؤ تا تم سے کچھ پوچھنا ہے۔“ بشارت نے اسے رانکھ کی زپر لیتے ہوئے کہہ۔

”کون ہو تم اور اس بد تمیزی کا کیا مطلب ہے؟“ حافظ غریبا۔

”نیچے اتر دو تا تا ہوں۔“ بشارت نے پُر سکون لہجے میں جواب دیا۔

مجبور کی اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے آدمی نے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش کی مگر بشارت نے بڑی پھرتی سے رانکھ کی نال اس کے کندھے پر مار دی۔

”کوئی حرکت کی تو بھون کر رکھ دوں گا۔“ وہ غریبا۔

شرکا بھی رانکھ سنبھالے کار سے اتر آیا اور اس نے بھی مجبور کے سامنے کھڑے ہو کر رانکھ تان لی۔ حافظ رشید اور اس کے ساتھیوں کو مجبور سے اترنا ہی پڑا تھا۔

”میں نہیں جانتا کہ کون ہو لیکن اپنی اس حرکت پر پچھتاؤ گے۔ میرے ایک اشارے پر تمہیں پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا جائے گا۔“ حافظ عبدالرشید غریبا۔

”تمہارا گھانا چارہ ہے غلاب ہو چکا ہے۔ مجھے تمہارے کالے کرٹوں کا پتہ چل گیا ہے۔“ بشارت نے بھی غراتے ہوئے کہہ۔ ”میں صرف یہ جانتا چاہتا ہوں کہ مجھ کہاں ہے۔ میری بہن مجھ۔“

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ میں کسی مجبور کو نہیں جانتا۔“ حافظ نے جواب دیا۔

”تم سب کچھ جانتے ہو۔“ بشارت بولا۔ ”تم نے اس کا نام بدل دیا تھا۔ ہل شیانہ۔ تم نے اسے بیٹی بنا کر تین سال اپنے گھر میں رکھا اور پھر اس کا سودا کر دیا مگر وہ بھاگ گئی اور تم جانتے ہو وہ کہاں ہے۔“

”اوہ؟“ حافظ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”میں نے اس کا سودا نہیں کیا تھا۔ وہ میرے گھر سے نقدی اور لاکھوں روپے کے زیورات لے کر بھاگ گئی تھی۔“

”بھوکا کرتے ہو تم.....“ بشارت چیخا۔ ”جن ہاتھوں نے بچپن ہی سے محنت کرنا سیکھا ہو وہ چوری نہیں کر سکتے۔ بتاؤ کہاں ہے وہ؟“

سنیٹا اس دوران میں گاڑی دہلے سے ہٹا لے گئی تھی۔ اس نے انجن اسٹارٹ ہی رکھا تھا تاکہ بھگانا پڑے تو دشواری پیش نہ آئے۔

حافظ عبدالرشید چند لمحوں کی طرف دیکھا اور پھر اس نے اچانک ہی کوٹھی کے گیٹ کی طرف دوڑ لگا دی۔ اس کے دونوں ساتھی بھی بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ اسی لمحے شر کے کی رانکھ دباڑی تھی۔ حافظ کے دونوں ساتھی ڈھیر ہو گئے۔ بشارت نے دوڑ کر حافظ رشید

کو پکڑ لیا اور اسے زمین پر گر کر اس پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔  
”بتاؤ..... مجھ کہاں ہے؟“ وہ حافظ کی پالیوں پر رانٹل کا ہٹ رسید کرتے ہوئے  
غرایا۔

”وہ..... وہ..... اے ایس بی اشرف کے.....“  
”بشارت..... شکرے..... بھاگو..... پولیس.....“

سنیچ کی آواز سن کر بشارت چونک گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھ دائیں طرف گلی سے  
پولیس کی ایک گاڑی اندر داخل ہو رہی تھی۔ حافظ نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ایک باہر پھر  
بھاگنے کی کوشش کی۔ بشارت نے رانٹل کا نگرہ دیا۔ گولیوں کی آواز کے ساتھ ہی حافظ  
رشدید کی چیخیں بھی فضا میں گونج اٹھیں۔

بشارت نے اس کی طرف دیکھا اور پھر کار کی طرف دوڑ لگا دی۔ شکرہ بھی دوڑا تھا لیکن  
اسی لمحے دوسری طرف سے گلی میں پولیس کی ایک گاڑی داخل ہوئی اور پھر دوسرے ہی لمحے  
دونوں طرف سے فائرنگ ہونے لگی۔ بشارت مڑ کر ایک کونے کی طرف دوڑا۔ وہ دیوار پر  
چڑھ رہا تھا کہ چیخا ہوا نیچے گرا۔ اسے تین گولیاں لگی تھیں۔ ایک ٹانگ میں، ایک کندھے پر  
اور تیسری بائیں پلو میں۔ وہ ایک لمحے کو زمین پر پڑا۔ پھر اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی مگر  
اسی لمحے ایک اور گولی پیٹھ میں لگی اور وہ گر پڑا۔

چند منٹ تک فائرنگ ہوتی رہی۔ اس نے چیخوں کی آواز بھی سنی تھی۔ وہ شکرے کے  
چیننے کی آواز تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا شکرہ مڑک رہے حس و حرکت بڑا تھا۔ وہ گولیوں سے  
چھلنی ہو گیا تھا اور اس کے جسم سے پسنے والا خون مڑک پر بہہ رہا تھا۔ کئی پولیس والوں نے  
بشارت کو گھیرے میں لے لیا۔ رانٹلیں اس پر تھیں ہوئی تھیں۔

”گلگ..... گولی مت..... چلاؤ..... بشارت کہہ رہا تھا.....“ میرا نام بشارت  
ہے..... اگر تم لوگ اے..... ایس بی..... اشرف کو لا دو تو.....“

اسی وقت تین چار افسر دوڑتے ہوئے وہیں پہنچ گئے۔ اس میں ایک ڈی ایس بی تھا، دو  
انسپکٹر اور ایک اے ایس بی اشرف۔

”میں اے ایس بی اشرف ہوں۔“ وہ آگے بڑھ کر بشارت پر جھک گیا۔ اس کے ہاتھ  
میں ریوایور تھا۔ ”بتاؤ تم کون ہو اور تم نے یہ سب کیوں کیا؟“

”مم..... میں..... بشارت ہوں..... بشارت..... علی۔“ بشارت رک  
رک کر بولا۔ ”مم..... میری بہن نجمہ..... تمہارے پاس..... اے ایک  
مرتبہ..... مجھ سے ملو اور.....“

اے ایس بی اشرف ایک جھٹکے سے سیدھا ہو گیا۔ اس نے چیخ کر اپنے ایک ہاتھ کو  
حکم دیا اور دوبارہ بشارت پر جھک گیا۔

تقریباً دس منٹ بعد ایک کار وہیں آ کر رکی۔ دو خواتین نیچے اتریں۔ ایک اے ایس بی  
اشرف کی بہن سملی تھی اور دوسری نجمہ۔

”تمہارا بھائی مل گیا ہے۔“ نجمہ..... لیکن اس کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ آگے  
بڑھ کر مل لو اس سے۔“ اے ایس بی اشرف نے کہا اور نجمہ کا ہاتھ پکڑ کر آگے لے آیا۔

نجمہ خون میں لت پت بشارت کو دیکھ کر سناٹے میں آ گئی۔ خون نے خون کو بچان لیا  
تھا۔ وہ چیختی ہوئی بشارت سے لپٹ گئی۔

”یہ..... یہ کیا ہو گیا یہاں..... تم..... تم..... تو ڈاکٹر اقبال بنا چاہتے تھے۔  
یہ کس راستے پر نکل گئے یہاں.....“

بشارت کے جسم سے خون بہہ رہا تھا۔ نقابت اس پر غالب آ رہی تھی۔ اس نے بڑی  
مشکل سے آنکھیں کھولیں۔

”بیٹی.....“ اس کے ہونٹ پھڑپھڑائے۔ ”مم..... میں تو ڈاکٹر اقبال ہی بنا چاہتا  
تھا مگر..... مجھے..... چور..... ڈاکو اور قاتل بنا دیا گیا..... میں..... جس  
راستے پر چلا تھا..... وہ بھی بند ہو..... چکا ہے..... انجام تو یہی..... ہوتا  
تھا..... تم..... تم اپنا خیال..... رکھنا“

اس کے ہونٹ پھڑپھڑا رہے تھے مگر آواز نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں بھی بند ہو چکی  
تھیں۔ نجمہ اس سے لپٹ کر دباؤ مارنے لگی۔ برسوں بعد اس کا چہرہ ہوا بھائی ملا تھا تو اپنی  
زندگی کے آخری موڑ پر.....

بشارت نے بہن کی آغوش میں دم توڑ دیا۔ نجمہ کی دلدوز چیخوں سے فضا کانپ اٹھی۔  
اے ایس بی اشرف نے سملی کو اشارہ کیا۔ اس نے آگے بڑھ کر نجمہ کو بانٹوں سے پکڑ کر اٹھایا

اور اسے کار کی طرف لے چلی۔ شکرہ ختم ہو گیا تھا۔ نینا کو پولیس نے حراست میں لے لیا۔



سلی نجمہ کو لئے کار میں بیٹھ گئی۔ اے ایس پی اشرف کچھ دیر کے لئے ان کے پاس آیا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

فکسلی گیٹ کے ایک خستہ حال مکان سے کئی برس پہلے بوڑھے علی خان کی بیچاریگی کی موت سے شروع ہونے والی کہانی آخر کار اس کے بیٹے کی موت پر ختم ہو گئی تھی۔

☆=====☆